رام دین

ممتاز مفتی

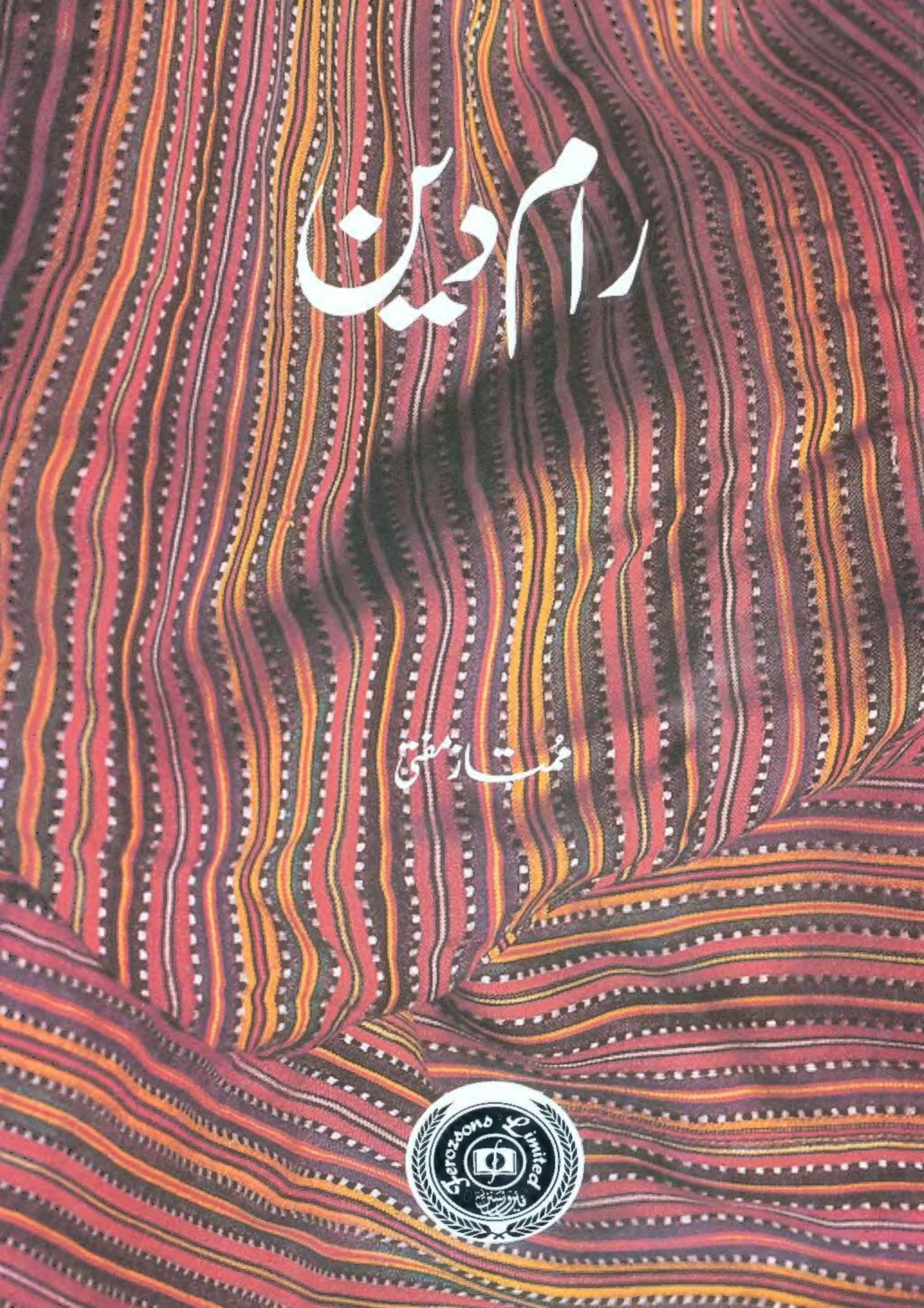

Ferozsons Limited
فیروز سنز

رام دین

مضامین رپورتاژ

ممتاز مفتی

فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ

لاہور۔ راولپنڈی۔ کراچی

ترتیب

١ رام دین ۵
٢ راولپنڈی اور اسلام آباد ١٧
٣ عورت کا المیہ ٢٦
۴ پاکستان ٣۴
۵ محترمہ ہومیوپیتھی کے نام ۶١
۶ ناقابلِ فراموش ۶٨
٧ عورت اور جنسیات ٨۴
٨ طُفیل نیازی ١٠٠
٩ جائے پناہ سے جائے امتیاز ١١٢
١٠ ادب اور ادیب ١٣١
١١ کلچر، سیمینار اور ادیب ١۴٣
١٢ اشتہار، پی آر اور ادب ١۵١
١٣ سائنس اور ادب ١۵٨
١۴ آپ کا نام ١٧١
١۵ غُفیل دور ١٧٩
١۶ آپا ١٨۴
شاہراہِ ریشم۔ رپورتاژ
١٧ چھڈ یار ١٩٣
١٨ تھاکوٹ ٢٠٧
١٩ ڈاسو ٢٣١
٢٠ الائچی نالا ٢۵۴
٢١ چلاس ٢٧٩

سی ری

کی سی

ثوثیلہ

نوکی

کے نام

جنھوں نے مجھے اپنے "ساتھ" سے نوازا۔ اپنا
ساتھی بنانا گوارہ کیا۔

ممتاز مفتی

مارچ ۱۹۸۶ء

رام دین

آجکل ہم پر ایک جنون سوار ہے۔ کہتے ہیں، نوجوانوں کو پاکستان کی آئیڈیالوجی سمجھاؤ۔ بڑی بڑی عالمانہ کتابیں لکھی جا رہی ہیں کہ پاکستان کیوں معرضِ وجود میں آیا۔ پاکستان کا مسلک کیا ہے۔ تاریخی پہلو۔ اقتصادی پہلو۔ سیاسی پہلو۔ ہر پہلو پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔

میری دانست میں یہ سب باتیں بے کار ہیں۔ میرا دعویٰ ہے کہ پاکستان کو صرف وہ شخص سمجھ سکتا ہے جس نے رام دین کو دیکھا ہے۔ سمجھا ہے۔ جانا ہے۔

میں نے رام دین کو ۱۹۲۴ء میں دھرم سالا کے نواحی دیہات میں دیکھا تھا۔

ان دنوں میں دھرم سالا میں انگلش ٹیچر تھا۔

۱۹۱۸ء میں پہلی جنگِ عظیم کا سانپ نکلا تھا۔ سال بعد برِصغیر پر اس کی لکیریں اُبھریں۔ مالی انحطاط کا جن بوتل سے نکلا اور دھواں بن کر برِصغیر پاک و ہند پر چھا گیا۔ دفتروں میں تخفیف کا کلہاڑا چلنے لگا۔ اسامیوں میں تخفیف، تنخواہوں میں تخفیف، گریڈوں میں تخفیف۔ تخفیف ہی تخفیف۔

بدقسمتی سے میں تحصیلِ علم سے فارغ ہو کر اس وقت سنٹرل ٹریننگ کالج سے باہر نکلا جب مُلازمت حاصل کرنے کے جُملہ راستے مسدود ہو چکے تھے۔

بڑی دوڑ دھوپ کی۔ سفارشیں کروائیں۔ پھر کہیں تعلیم کے انسپکٹر صاحب نے وعدہ کیا کہ جب کوئی ماسٹر چھٹی پر جائے گا تو عوضی پر لگا دوں گا۔ وہ بھی نچلے گریڈ میں۔

پہلی عوضی مجھے خانیوال میں ملی۔ دوسری دھرم سالا میں۔ میں جو بٹالے کا رہنے والا تھا

اور لاہور میں تعلیم حاصل کرتا رہا، مجھے علم نہ تھا کہ پنجاب میں ایسے علاقے بھی موجود ہیں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے اقلیت کے مفہوم کا شعور ہی نہ تھا۔ کیسے ہوتا؟ بٹالے میں ہندو اقلیت میں تھے، لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ مسلمان ہندوؤں کے ساتھ گھل مل کر رہتے تھے۔ شادی اور موت پر مل جل کر بیٹھتے۔ شادی پر آپس میں بھاجیاں بانٹی جاتی تھیں۔

دھرم سالا میں مسلمان اقلیت میں تھے۔ اس اقلیت کا یہ عالم تھا کہ سارے سکول میں صرف دو مسلمان طالبِ علم تھے۔ اور میں واحد مسلمان ٹیچر تھا۔

میری مشکل یہ ہے کہ میں پانی بہت پیتا ہوں، اور بار بار پیتا ہوں۔

رام دین سے میری ملاقات صرف پانی پینے کی وجہ سے ہوئی۔ اگر میں بار بار پانی پینے کا عادی نہ ہوتا تو شاید رام دین کے وجود سے کبھی واقف نہ ہوتا۔

ایک روز سکول میں میں نے ایک ہندو لڑکے سے کہا: مجھے ایک گلاس پانی لا دو۔ لڑکا میری بات سن کر ادب سے سر جھکائے کھڑا رہا۔ میں نے دوبارہ کہا تو وہ بڑے ادب سے بولا "ماسٹر جی، میں آپ کو پانی نہیں پلا سکتا۔"

"کیوں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"جناب، میرا دھرم بھرشٹ ہو جائے گا۔"

میں ہنس پڑا۔ بولا "برخوردار، دھرم بھرشٹ تو تب ہوتا ہے جب تم میرے ہاتھ کا پانی پیو۔ مجھے پانی پلانے سے تو دھرم بھرشٹ نہیں ہوتا۔"

میری دلیل کا اس پر کچھ اثر نہ ہوا اور وہ ادب سے سر جھکائے جوں کا توں کھڑا رہا۔ ان دنوں مجھے یہ شعور نہ تھا کہ دھرم بھرشٹ ایک جذبہ ہے جسے نہ عقل سے تعلق ہے نہ دلیل سے۔ اور ہندو اقلیت کے علاقے میں اس کا مفہوم اور ہے اور ہندو اکثریت کے علاقے میں اور۔ مجھے پتا تھا کہ ہندو مسلمان کے ہاتھ کا پانی نہیں پیتے۔ لیکن پانی پلانے کو تو وہ پُن

سمجھتے تھے۔ یہ اور بات تھی کہ وہ مسلمان سے اپنا برتن دُور رکھتے۔ اس دُوری کو قائم رکھنے کے لیے انھوں نے کئی ایک طریقے ایجاد کر رکھے تھے۔ مثلاً ایک طریقہ یہ تھا کہ بانس کا ایک ٹکڑا لیتے۔ اسے کاٹ کر ایک نالی بنا لیتے۔ اس نالی کے ایک سرے پر وہ اپنی گڑوی سے پانی ڈالتے، دُوسرے سرے پر مسلمان اوک سے پانی پیتا۔

ریلوے سٹیشنوں پر گاڑی رُکتی تو آوازیں سُنائی دیتیں "ہندو پانی" ــــ "مسلمان پانی"۔ ہندو مسافر تو "ہندو پانی" کا انتظار کرتے تھے۔ مسلمان دونوں پانیوں میں کچھ فرق نہ جانتے۔ بے تکلف ہندو پانی پیتے۔ اور پانی پلانے والا جو حقارت بھرا فاصلہ قائم رکھتا، اس سے مطلق بُرا نہ مانتے۔

دھرم سالا میں دھرم بھرشٹ کا یہ نیا مفہوم جان کر میں حیران ہُوا۔ یہ بات میری سمجھ میں نہ آئی کہ دھرم بھرشٹ کا یہ مفہوم نیا نہیں بلکہ ان علاقوں کا مروجہ مفہوم ہے جہاں ہندو اکثریت میں ہیں۔

اس واقعے سے چند روز بعد مجھے ہندو اکثریت کے علاقے کی وہ تخلیق نظر آئی جس کا نام رام دین ہے۔

چھٹی کا دن تھا۔ دھرم سالا کے مناظر تھے۔ میں نے کہا، چلو، گھوم پھر کر دن گزاریں۔ پہاڑوں کی پگ ڈنڈیوں پر گھومتا پھرتا آٹھ دس میل دُور نکل گیا۔

راستے میں پیاس لگی۔ چشمے تو وہاں جگہ جگہ رِس رہے تھے، لیکن پینے سے ڈرتا تھا۔ اس لیے کہ سرکار نے جگہ جگہ بورڈ لگا رکھے تھے:

ہر خاص و عام کو مطلع کیا جاتا ہے کہ کسی چشمے سے پانی نہ پیئں، جب تک وہاں سرکاری بورڈ نہ لگا ہو کہ یہ پانی پینے کے قابل ہے۔

اس احتیاط کی وجہ یہ تھی کہ اس علاقے کے پانی میں کوئی ایسی دھات پائی جاتی تھی جو گلے میں بیٹھ جاتی اور بالآخر گردن پر گلڑ نکل آتا۔

بہر حال، پانی کی تلاش میں ایک چھوٹے سے گاؤں میں جا پہنچا۔ ایک دکان دار لالہ جی سے پوچھا "جی، یہاں سے پینے کا پانی مل جائے گا؟"

لالہ جی نے غور سے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ بولا "مسلمان؟"

میں نے سر اثبات میں ہلا دیا "جی۔"

لالہ بولا "وہ سامنا گھر مسلمان کا ہے۔ وہاں سے پی لو۔"

سامنے گھر کے اندر جھانکا تو کیا دیکھتا ہوں کہ تازہ گوبر کی لپائی ہو رہی ہے۔ باورچی خانے میں چوکا بنا ہوا ہے۔ بالکل جیسے رسوئی میں ہوتا ہے۔ کٹوریاں اور تھالیاں پڑی ہیں۔ بالکل ایسی جیسے ہندو گھروں میں ہوتی ہیں۔

میں نے سوچا: یہ تو مسلمان کا گھر نہیں ہو سکتا۔ لالہ جی نے شاید کسی اور گھر کی طرف اشارہ کیا ہو۔ اتنے میں اندر سے ایک شخص باہر نکلا۔ نیچے لڑ والی دھوتی۔ اُوپر ننگا بدن۔ گلے میں جینئو۔ سر پر اتنی لمبی گھنی لبودی۔

میں نے کہا "مہاراج، یہاں مسلمان کا کوئی گھر ہے؟"

بولا "ہاں، مہاراج۔ یہی تو ہے۔ یہ میرا گھر ہے۔"

حیرت سے میرا مُنھ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

یا اللہ! یہ کیا تماشا ہے! یہ گوبر کا چوکا، یہ جینئو، یہ لبودی اور مسلمان! "تُم مسلمان ہو؟" میں نے اس سے پُوچھا۔

"جی" وہ بولا۔

"کیا نام ہے تمھارا؟

"جی، رام دین۔"

نہ جانے کتنی دیر میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے رام دین کو دیکھتا رہا۔

وہ پہلا دن تھا جب میں نے رام دین کو دیکھا۔

پھر اس علاقے میں گھومتے پھرتے میں نے بیسیوں رام دین دیکھے اور مجھے احساس ہُوا کہ رام دین فردِ واحد نہیں بلکہ ایک قوم ہے۔ ہندو اکثریت کے علاقے کی تخلیق کردہ قوم۔

اگر پاکستان نہ بنتا تو یہ بات خارج از امکان نہیں کہ آج میں بھی ایک رام دین ہوتا۔ صرف میں ہی نہیں شاید آپ اور ہم سب رام دین ہوتے۔ ہمارے سروں پر چوٹیاں نہ ہوتیں، گلے میں جینئو نہ ہوتے، گھروں میں گوبر کی لپائی نہ ہوتی، اس کے باوجود ہم رام دین ہوتے۔ رام دین ایک ذہنیت کا نام ہے جو خود اختیار نہیں کی جاتی بلکہ جسے اکثریت ایک منصوبے کے تحت پیدا کرتی اور جو ذہن سے آہستہ آہستہ لباس، گفتگو اور جسم تک پہنچتی۔

لیکن ٹھہریے۔ رام دین پر ہنسیے نہیں۔ اگر رام دین نہ ہوتا تو پاکستان کبھی وجود میں نہ آتا۔ سچی بات یہ ہے کہ رام دین پاکستان کا اوّلین بانی ہے۔

ہمارے آج کے نوجوان رام دین سے واقف نہیں، لہٰذا ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ پاکستان کیوں وجود میں آیا تھا۔ پاکستان کی آئیڈیالوجی کیا ہے۔ میں ان نوجوانوں کو مشورہ دوں گا کہ وہ کے ایل گابا کی تصنیف "پیسو وائیسز" پڑھیں۔

اس کتاب میں گابا نے بھارت کے رام دینوں کا تذکرہ کیا ہے۔ انھوں نے جذباتی باتیں نہیں کیں۔ کسی کو بُرا بھلا نہیں کہا۔ کسی کو موردِ الزام نہیں ٹھہرایا۔

گابا ایک مشہور قانون دان ہیں۔ پہلے وہ ہندو تھے، پھر مختلف مذاہب کا مطالعہ کرنے کے بعد مسلمان ہو گئے۔ اس پر ان کے عزیز و اقارب سیخ پا ہو گئے۔ ماحول بیری ہو گیا۔ انھوں نے گابا پر تمام دروازے بند کر دیے۔ ان کے راستے میں جگہ جگہ رکاوٹیں کھڑی کر دیں۔ انھیں اس قدر ہراساں کیا کہ زندگی اجیرن کر کے رکھ دی۔ ان کی آپ بیتی ایک طویل دُکھ بھری داستان ہے۔

بہر حال، مسٹر گابا نے اپنی اس تصنیف میں جذباتی باتیں نہیں لکھیں، بلکہ

خشک حقائق بیان کیے ہیں۔ ایسے حقائق جن کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ بھارت میں مسلمانوں کو کس طرح رام دین بنایا جاتا ہے۔

چونکہ مسٹر گابا قانون دان ہیں، اس لیے انھوں نے اپنی تصنیف میں صرف شماریات پیش کیے ہیں۔ مثلاً دفتروں میں مسلمانوں کی تعداد کیا ہے۔ بزنس میں مسلمان تاجروں کی اوسط کیا ہے۔ کالجوں میں مسلمان طلبا کتنے ہیں۔ شہروں میں چلنے والی لاکھوں موٹر گاڑیوں میں سے کتنی گاڑیاں ایسی ہیں جن کے مالک مسلمان ہیں۔ کُل ٹیلی فون کتنے ہیں۔ مسلمانوں کے پاس کتنے ہیں۔

بھارت نے مسٹر گابا کی اس کتاب کو ہند میں چلنے نہیں دیا۔ لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ بھارتی مسلمان رام دین سے ناواقف نہیں۔ بلکہ وہ تو رام دین بیت رہے ہیں۔

اہلِ یورپ رام دین کے مفہوم کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔ چاہے کوئی جذباتی رنگ میں بیان کرے یا شماریات میں پیش کرے یا منطق کا سہارا لے۔ ان کے ذہنوں میں سماجی تفریق کا خانہ ہی خالی ہے۔

عرب مُلک عرب اور غیرعرب کے چکر میں پڑے ہیں۔

پاکستان واحد ملک ہے جسے رام دین سے گہرا تعلق ہے، کیونکہ وہ صرف اس لیے وجود میں آیا کہ ہم نہیں چاہتے تھے کہ رام دین بن کر جیئیں۔

دِقت یہ ہے کہ وہ لوگ جنھوں نے پاکستان بنانے کے لیے جدّوجہد کی تھی، وہ تو لد گئے۔ پُرانے پتے سُوکھ کر جھڑ گئے۔ ان کی جگہ نئی کونپلیں پھُوٹی ہیں، جنھیں رام دین کا شعور نہیں۔ کیسے شعور ہو؟ پاکستان میں لاکھوں ہندو مقیم ہیں۔ ان میں تو کوئی بھی اسلام چندر نہیں۔ پھر وہ رام دین کو کیسے سمجھیں؟

حال ہی میں مجھے سندھ میں تھرپارکر جانے کا اِتّفاق ہُوا۔ وہاں میں نے دیکھا کہ ہندوؤں کے گوٹھ کے گوٹھ آباد ہیں۔ گوبر کی لپائی ہے۔ چوکے ہیں۔ بُت ہیں۔ پُوجا ہے۔ مندر ہیں۔ آشرم ہیں پٹیل ہیں۔ سبھی کچھ ایسے ہے جیسے تقسیم سے پہلے تھا۔

وہی شادی غمی پر میل جول۔ لینا دینا۔ کھانا کھلانا۔ بھاجیوں کی بانٹ۔ نیو ندے۔ سلامیاں۔ مُنھ دکھائیاں۔

تھر کے قصبوں، شہروں اور گاؤں میں سارا کاروبار ہندوؤں کے ہاتھوں میں ہے، جس طرح تقسیم سے پہلے مسلم اکثریت کے علاقوں میں بھی سارا کاروبار ہندوؤں کے ہاتھوں میں تھا۔ منڈیوں پر ہندو براجمان تھے۔ کوئی مسلمان منڈی میں جا بیٹھتا تو چند دنوں کے بعد یوں باہر نکال دیا جاتا جیسے دُودھ سے مکھی نکال دی جاتی ہے۔

ہندو قوم ایک عظیم قوم ہے۔ بے شک وہ بڑی خوبیوں کے مالک ہیں۔ لین دین کے کھرے ہیں۔ تول کے سچے ہیں۔ قول کے پکے ہیں۔ پل پل جوڑنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ صبر و تحمّل، سادگی، بُردباری، بے شک ان میں بڑی خوبیاں ہیں۔ صرف اتنی سی بات ہے کہ ان میں کسی اقلیت کو برداشت کرنے کی توفیق نہیں اور مسلم کشی کا جذبہ بہُت گہرا ہے۔ یہ جذبہ اس حد تک کاملاً تہ ہوتا ہے کہ نظر نہیں آتا۔ پھر ہمارے نوجوان بات کو کیسے سمجھیں؟

صرف نوجوان ہی نہیں، عام مسلمان کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ وہ نہیں سمجھتا۔ دیکھ کر بھی نہیں سمجھتا۔ بیت کر بھی نہیں سمجھتا۔

ایک تو مسلمان کا خمیر ہی کچھ ایسا ہے کہ دل خراش حقائق پلّے نہیں باندھتا۔ بلکہ انھیں بھلا دینے کی کوشش کرتا ہے۔ اس لیے کہ دلخراش حقائق کے پیچھے جو بھید چھپا ہے کہیں سمجھ میں نہ آجائے۔

دُوسرے یہ کہ بدقسمتی سے مسلمان طبعاً اس قدر وسیع القلب ہے کہ دشمنوں کے مُسلم کُشی کے منصوبوں جیسی چھوٹی چھوٹی باتوں کو ماننڈ کرنا اپنی کسرشان سمجھتا ہے۔

غصّے میں ضرور آتا ہے۔ بار بار آتا ہے۔ لیکن اس کا غصّہ سوڈے کی بوتل کا اُبال ہوتا ہے۔ آیا اور گیا۔ غصّے کو پی کر دل میں بٹھا لینے کی خصلت سے عاری ہے۔

تیسرے یہ کہ اسلامی دُنیا کے گرد وپیش بڑی قومیں مسلسل کام کر رہی ہیں۔ مسلسل تگ و دو

میں لگی ہیں کہ کہیں مسلمان سمجھ نہ جائے۔ مل نہ بیٹھے۔ یہ جن افتراق و تفریق کی بوتل سے باہر نہ نکل آئے۔

یہ قوتیں بڑی طاقتور ہیں۔ بڑی فعال ہیں۔ بڑی سیانی ہیں۔ بڑی دُور بین ہیں۔ انھیں پتا ہے کہ مسلمان سمجھ گیا، مل بیٹھا تو سب چوپٹ ہو جائے گا۔ ان کا طریقِ کار بڑا منفرد ہے۔ پُراثر ہے۔ وہ اپنی فیکٹریوں میں چمکیلے خیالات، جاذبِ نظر نظریات اور پُرکشش، انوکھی ذہنی پھلجھڑیاں بناتے ہیں، ایسی جو ہمارے ادیبوں، شاعروں، فن کاروں اور دانش وروں کو چکاچوند کر دیں۔ اور پھر انھیں ہمارے ملکوں میں بھیج دیتے ہیں۔ ان ذہنی پھلجھڑیوں کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ مسلمانوں کے ذہنوں کو مسحور کر لیں۔ تاکہ مسلمانوں کا رُخ اسلام کی طرف نہ ہو جائے۔ فروعات میں ہی پھنسا رہے۔

وہ جانتے ہیں کہ ادیب، فنکار اور دانش ور اوپینین میکرز ہوتے ہیں، جو خیالات کی دنیا میں نئے فیشن چلاتے ہیں۔ اس لیے ان کا رُخ بگاڑنے سے عام پڑھے لکھوں کا رُخ خود بخود بگڑ جائے گا۔ دانش وروں کے علاوہ یہ قوتیں طلبا پر اثر انداز ہوتی ہیں، جو معصوم ہوتے ہیں اور نئی چیزوں کے متلاشی، جن کی ہنڈیا میں اُبال لانا کچھ مشکل نہیں ہوتا۔

پھر ایک تیسرا گروہ ہے جنھیں یہ قوتیں کام میں لاتی ہیں۔ یہ گروہ مذہبی دیوانوں کا ہے۔ ایک تو یہ گروہ بہت پُراثر ہے، دُوسرے ان کا اپنا مسلک بھی یہی ہے کہ مسلمان فروعات میں پھنسا رہے۔ اصل کی طرف توجہ نہ کرے۔ اتنا پھنسا رہے کہ بات سمجھنے کی مُہلت نہ ملے۔

میرے ایک دوست یورپ میں چند سال مقیم رہنے کے بعد وطن لوٹے تو انھوں نے مجھے بتایا کہ وہ ایسی ۲۶ تنظیموں سے واقف ہیں جن کا مقصد یہ ہے کہ مسلمان سمجھ نہ جائے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ان تنظیموں نے بہت سے حربے چلا رکھے ہیں۔ مثلاً:

(۱) ماڈرن دُنیا میں اسلام کے خلاف تحقیر کی دھار کند نہ ہونے پائے۔

(۲) ایسی صورتِ حالات پیدا کی جائے اور اسے قائم رکھا جائے کہ نوجوان مسلمان اپنے مذہبی جذبے پر شرمساری محسوس کریں۔

(۳) ایسی صورتِ حالات پیدا کی جائے کہ مسلمانوں میں اتحاد پیدا نہ ہو۔
(۴) سیکلر نقطۂ نظر کو اُچھالا جائے۔ جمہوریت کے گُن گائے جائیں۔

میرے دوست نے بتایا کہ ان تنظیموں میں چند ایک ایسی بھی ہیں جن کا سالانہ بجٹ پاکستان کے بجٹ سے کئی گنا زیادہ ہے۔

مسلمانوں کی سب سے بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ مساوات ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے۔ جذبۂ مساوات میں سب سے بڑا عیب یہ ہے کہ وہ دل میں تعصب پیدا ہونے نہیں دیتا۔ اس کے برعکس زندگی میں اپنے تحفّظ کے لیے ضروری ہے کہ انسان چند ایک مثبت تعصبات پیدا کرے۔ مثلاً اپنے دین کے حق میں تعصب، اپنے وطن کے حق میں تعصب، اپنے آباء و اجداد کے حق میں تعصب۔ ہر فرد کے لیے لازم ہے کہ وہ اپنے دین پر فخر کرے۔ اپنے وطن پر فخر کرے۔ قوم پر فخر کرے۔ خاندان پر فخر کرے۔

دشمنانِ اسلام ہمیشہ اس بات سے خائف رہے کہ کہیں مُسلمان اپنے دین پر فخر کرنا نہ سیکھ لے۔ اس خطرے سے بچنے کے لیے انھوں نے ایسے خیالات فضا میں چھوڑ دیے جو دین اور وطن کی نفی کرتے ہیں۔ مثلاً انھوں نے یہ پرچار کرنا شروع کر دیا کہ مہذب آدمی وہ ہے جو اَنسی بلیٹڈ ہو۔ جو تعصّبات سے پاک ہو۔ جسے نہ دین کا لحاظ ہو نہ وطن کا۔ جس کا نقطۂ نظر خارجی ہو۔ آبجیکٹو ہو۔ جذبات سے آلودہ نہ ہو۔ سیکولر ہو۔ یعنی جو مذہب کا دیوانہ نہ ہو۔ وطن کا غلام نہ ہو۔

آج کا مسلمان نوجوان مغرب کے چنگل میں پھنسا ہے۔ وہ اس کوشش میں لگا ہے کہ مہذب سمجھا جائے۔ اس حد تک سیکولر بننے کی کوشش کر رہا ہے کہ دل کی گہرائیوں میں رچے بسے دینی جذبے کو تسلیم کرنے سے منکر ہے۔ وہ وطن کی محبّت کو ایک منفی تعصّب سمجھنے لگا ہے، اور اپنے دین پر نادم ہے۔

ڈاکٹر عفت سے ایک غیر ملکی کرنل نے پوچھا "آپ کے مذہب میں سؤر کھانا کیوں حرام ہے؟"
ڈاکٹر عفت نے کہا "یہ ایک حکم ہے۔ میرا کام حُکم کی تعمیل کرنا ہے۔ کرنل صاحب، الحکم

کی وجہ جاننا ضروری نہیں ۔ اسے ماننا ضروری ہے ۔"

کرنل ہنسا ۔ بولا "جس حکم کو آپ سمجھتی نہیں اس پر عمل کرنے کا مقصد ؟"

ڈاکٹر عفّت ہنسیں ۔ بولیں "حیرت ہے ، کرنل صاحب کہ آپ فوجی افسر ہوتے ہُوئے حُکم کے مفہوم سے واقف نہیں ۔" کرنل کھسیانا ہو گیا ۔

عفّت بولیں "کرنل صاحب ، ہر کلب کے اصُول ہوتے ہیں جن کی پابندی لازم ہوتی ہے ۔ مذہب بھی ایک کلب ہے ۔ یا تو آپ کلب کے ممبر بنیں یا نہ بنیں ۔ یہ آپ کی مرضی پر موقوف ہے ۔ لیکن رُکن بن جائیں تو پھر چُون و چرا کی گنجائش نہیں رہتی ۔"

ہماری مشکل یہ ہے کہ مغرب کے زیرِ اثر ہم عقل کے اس قدر دیوانے بنے بیٹھے ہیں کہ کچھ حد نہیں ۔ حالانکہ ہر فرد جسے تھوڑی سی سُوجھ بوجھ بھی حاصل ہے ، اس حقیقت کو جانتا ہے کہ زندگی میں بہُت کم باتیں ایسی ہیں جن پر عقل حاوی ہے ، اور بہُت زیادہ باتیں ایسی ہیں جو عقل کی دسترس سے باہر ہیں ۔ عقل کو ہم نے بُت بنا رکھا ہے ، اس حد تک کہ یہ مانتے ہوئے کہ اللہ تعالیٰ قادرِ مطلق ہے ، ہم عقل کے معیار کو اللہ تعالیٰ پر بھی عائد کرنے سے گریز نہیں کرتے ۔

ہم سوچتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو یُوں نہیں کرنا چاہیے تھا ۔ اللہ تعالیٰ کے حکم کے پیچھے ضرور کوئی ایسی حکمت ہو گی جو ہم عقل کے زور پر سمجھ سکتے ہیں ۔ اس لیے ہم اس کی تلاش کرنے لگتے ہیں ۔ اور اگر کامیاب نہ ہوں تو حُکم پر شک کرنے لگتے ہیں ۔

خیر یہ تو جُملہ معترضہ تھا ۔

میں دین اور وطن کے لیے مثبت تعصبات کی بات کر رہا تھا ۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہندو قوم بحیثیّت قوم ہم سے بہتر ہے ، کیونکہ انھوں نے اپنے دھرم اور دیش کے لیے تعصبات پال رکھے ہیں ۔ ان کے دلوں میں جذبۂ انتقام ٹھنڈا نہیں ہوتا ۔ اور جس قوم میں انتقام کا جذبہ نہیں وہ قوم قیام سے محروم رہتی ہے ۔

تقسیم کے وقت جو کچھ مسلمانوں پر بیتا تھا ، وہ اگر ہم یاد رکھتے تو رہتی دُنیا تک

جذبۂ انتقام ہم میں سُلگتا رہتا۔ لیکن ہم اسے بھول گئے۔ ایسی چھوٹی چھوٹی باتیں یاد رکھنا ہم اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ ہندو اس بات کو نہیں بھولا کہ ان کے ملک کا بٹوارہ کر دیا گیا ہے۔ وہ ہمیں کبھی معاف نہیں کرے گا۔ آپ اسے جو بھی چاہے سمجھیں، میں اسے ہندو قوم کی عظمت کی دلیل سمجھتا ہوں۔

گزشتہ تیس برس میں ایک اندازے کے مطابق، بھارت میں بیس ہزار ہندو مسلم فسادات ہوئے ہیں۔ اور آج بھی ہو رہے ہیں۔ لیکن ہم اس بات پر فخر محسوس کرتے ہیں کہ پاکستان میں ایک بھی فساد نہیں ہوا۔

مطلب یہ ہے کہ ہم اپنے بھارتی بھائیوں سے کہتے ہیں : دوستو! بے شک مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلو۔ ہم مہذب لوگ ہیں۔ ہم ان چھوٹی چھوٹی باتوں سے دِل میلا نہیں کرتے۔ الحمدُ للہ کہ ہم مُنتقم مزاج نہیں ہیں۔

گزشتہ صدیوں میں بھارت میں جس نئے مذہب نے سر اُبھارا، ہندوؤں نے اسے بڑی سُوجھ بُوجھ سے ہندو مت میں جذب کر لیا۔ بدھ ازم ایک عظیم مذہب تھا جس کے اُصول ہندو مت سے مختلف بلکہ متضاد تھے۔ ہندوؤں نے بدھ ازم کو گلے لگایا، اس کا مُنہ چُوما، گود میں بٹھایا اور بالآخر اس کے سر پر چوٹی رکھوا دی، ماتھے پر ٹیکا لگا دیا۔ حتّٰی کہ وہ ہندو مت کے رنگ میں رنگا گیا۔ جین مت بھی یُونہی ہندو مت میں جذب ہو کر رہ گیا۔ پھر سکھ ازم تھا جو ایک طاقتور، جوشیلا، مارشل، سادہ اور مخلص مذہب تھا، جو ہندو مت کے مزاج سے یکسر مختلف تھا۔ لیکن ہندوؤں نے اسے بھی رام کر لیا۔

لیکن اسلام ایک ایسا کوکڑو نکلا جو صدیوں کی آنچ کے باوجود ہندو مت کی دیگ میں گل نہ سکا۔

بے چارہ ہندو حیران ہے۔ ہے رام! یہ مسلمان کیا شے ہے جو کسی طور رام نہیں ہوتا۔ اچھا، یوں قابو میں نہیں آتا تو یُوں سہی۔ ذرا فرنگی کو جا لینے دو۔ پھر دیکھ لیں گے۔ فی الحال ایک

اور داؤ چلا دیکھو۔

ہندو نے خود کو مور کے پر لگا لیے اور اعلان کر دیا کہ ہم ہندو نہیں، کانگرسی ہیں۔ ہمارا نقطۂ نظر سیکولر ہے۔ ہمارا مقصد شیر اور بکری کو ایک گھاٹ پانی پلانا ہے۔ پھر جب یہ حربہ بھی نہ چلا اور پاکستان وجود میں آ گیا تو ہندو کا جذبۂ انتقام ٹھنڈا نہیں ہُوا بلکہ اور بھڑکا اور اس کی سیاست اکھنڈ بھارت پر مرکوز ہو گئی۔

اگر آج تک ہم بھارت کی دست بُرد سے بچے ہُوئے ہیں تو میری دانست میں اس کی دو وجہیں ہیں :

ایک تو ہمارے عوام میں مثبت جذبہ موجود ہے، اور دوسرے ایسا لگتا ہے جیسے پاکستان کو تائیدِ ایزدی حاصل ہے۔

راولپنڈی اور اِسلام آباد

پوٹھوہار کے دو جُڑواں شہر

مارگلہ پہاڑیوں کے دامن میں بظاہر ایک دوسرے کے قریب لیکن دراصل ایک دُوسرے سے بہُت دُور، دو شہر واقع ہیں۔

دونوں میں کوئی مناسبت نہیں۔

ایک شلوار پھیلائے، دستار سجائے، ہاتھ میں چھڑی پکڑے کھڑا ہے۔ دوسرا ہارڈ کالر لگائے، "بو" سجائے ہیٹ لگائے کھڑا ہے۔

ایک رشتوں کی دلدل میں لت پت شور وغوغا کا متوالا، بھڑ کی طرح جذبات کی شدّت سے "بھن بھن" کرتا ہے۔ دوسرا رشتوں سے بے نیاز، خاموش، متوازن، کسے را با کسے کار سے نہ باشد کا متوالا۔

ایک دل ہی دل ہے، دُوسرا مغز ہی مغز
ایک "اساں" ہی "اساں"، دوسرا میں ہی میں
ایک میلا میلا آوارہ منش عاشق مزاج
دُوسرا اُجلا اُجلا، محبوبیت سے سرشار
ایک اصل ہی اصل، دُوسرا نقل ہی نقل
ایک قدیم، دوسرا جدید

دونوں شہروں میں صرف ایک بات مشترک ہے کہ وہ پوٹھوہار میں واقع ہیں۔

بنیادی طور پر پوٹھوہار ایک گلی ہے۔ چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں میں گھری ہوئی گلی۔ یہ گلی گزرگاہ کا کام دیتی ہے۔ یوں سمجھ لیجیے کہ برصغیر کی عالی شان ماڑی کی ڈیوڑھی ہے۔

بدقسمتی سے یہ گزرگاہ گلی بڑی ہری بھری تھی۔ جاذب نظر تھی۔ ہر گزرنے والا اسے دیکھ کر واہ کہنے پر مجبور ہو جاتا اور پھر گزر جانے کی بجائے رُک جاتا۔ سستانے کا فیصلہ کر لیتا۔ اس کی جاذبیت صرف سرسبزی کی وجہ سے نہیں تھی۔ ایک تو منظر کا حُسن، دوسرے ٹھنڈے اور شیریں چشمے، دروں سے آنے والی خنک ہوا، گُل بوٹے اور پھل۔

بس اس ایک بات کی وجہ سے پوٹھوہاریوں کے لیے مشکلات پیدا ہو گئیں۔

طرح طرح کے لوگ اس گلی سے گزرتے رہے: حملہ آور، صوفیائے کرام، سیّاح، طالع آزما اور طلبِ علم کے مارے ہوئے۔ ایک دور میں اس علاقے میں کئی ایک معروف درس گاہیں قائم تھیں، جہاں دُنیاوی اور دینی دونوں طرح کے علوم پڑھائے جاتے تھے۔

اس گلی میں آمد و رفت کی گہما گہمی لگی رہی، جو یہاں کے باسیوں کے لیے افراتفری کا باعث بن گئی۔ ذاتی تحفظ کا مسئلہ ہمیشہ درپیش رہا۔ لوگ طبعاً جنگجو بن گئے پھر آپس میں لڑائیاں چھیڑ لیں۔

مؤرخ بال کی کھال اُتارنے کے شوقین ہوتے ہیں۔ وہ اب تک اس گلی کے طول و عرض پر جھگڑ رہے ہیں۔ کوئی کہتا ہے، یہ راہ داری یہاں سے وہاں تک تھی۔ کوئی کہتا ہے، نہیں، یہ راہداری تو وہاں سے یہاں تک تھی۔

پھر اس کے نام کے بارے میں بھی کئی روایات ہیں۔ ایک روایت یہ ہے کہ پہلے یہ علاقہ بے نام تھا۔ ایک مرتبہ شہنشاہ جہانگیر اِدھر آنکلا۔ کہنے لگا : یہ علاقہ تو اونٹ کی پیٹھ جیسا ہے۔ کہیں اونچان، کہیں نیچان، کہیں کوہان۔ اس پر اس علاقے کا نام "پیٹھ ہار" پڑ گیا۔ یعنی پیٹھ جیسا جو بعد میں بگڑ کر پوٹھوہار ہو گیا۔

آج بھی اس راہداری میں کئی ایک مقام ایسے ہیں جنھیں دیکھ کر بے اختیار منھ سے واہ نکل جاتی

ہے۔ حسن ابدال پہاڑیوں سے گھرا سر سبز پیالہ ہے۔ باغات اور چشموں کا سنگم "دامن" ہے
اس علاقے میں چھوٹے چھوٹے صحرا بھی تھے۔ مثلاً ٹیکسلا کا نام پہلے صحرائے کالا تھا۔
ان ریگ زاروں میں ایک جگہ تھی جہاں ایک ہندو راول نے ایک آبادی قائم کی اور اس کا نام پنڈی رکھا۔ مطلب ہے چھوٹا گاؤں۔

یہ چھوٹا گاؤں آہستہ آہستہ ایک اڈا بن گیا۔ کیونکہ یہاں سے کشمیر کو سڑک جاتی تھی۔ گھوڑوں کا اڈا۔ یکّوں کا اڈا۔ باربرداری کے جانوروں کا اڈا۔ یہاں سے تانگے سرینگر جاتے تھے۔ راستے میں جگہ جگہ پڑاؤ آتے جہاں گھوڑے اور گاڑی بان بدل جاتے۔ یعنی پنڈی کی واحد اہمیت مواصلاتی تھی۔
پھر انگریز نے دیکھا کہ یہ جگہ چھاؤنی کے لیے موزوں ہے۔ انھوں نے شہر کے پاس چھاؤنی بنا دی۔ چھاؤنی میں بیرے، خانسامے اور خدمتگار آ گئے۔ پھر سیٹھوں نے تجارتی امکانات کو دیکھ کر یہاں بود و باش اختیار کر لی۔
پنڈی کی تین باتیں مشہور ہیں: زمین ہموار نہیں۔ درخت پھلدار نہیں۔ موسم کا اعتبار نہیں۔
موسم کے لحاظ سے پنڈی ایک خاتون ہے۔ یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ محترمہ کب مسکرانا چھوڑ کر گھورنا شروع کر دیں۔ اگر جون میں اولے پڑنے لگیں یا دسمبر میں سن سٹروک ہو جائے تو باعث تعجب نہ ہوگا
پنڈی میں مستقل رہائش اختیار کر لو تو دو اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ ایک پیٹ پھول جاتا ہے، باڈی گولہ گھومنے لگتا ہے۔ دوسرے قبل از وقت بال سفید ہو جاتے ہیں، جھڑنے لگتے ہیں اور نیچے ٹانٹ نکل آتی ہے۔

پھولے ہوئے پیٹ اور چمکی ہوئی ٹانٹ کا ایک فائدہ ضرور ہوتا ہے۔ شکل و صورت سے آپ معتبر نظر آنے لگتے ہیں۔ اگرچہ یہ معتبری اوپرہی اوپر کی ہوتی ہے۔ پھر بھی معتبری تو ہوتی ہے۔ اور وہ بھی مفت کی۔

پتا نہیں کیوں، لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ یہاں کے مقامی لوگ معتبر نظر آنے کے بڑے متوالے ہیں۔ چاہے وہ اوپر اوپر کی ہو یا بھیتر کی۔ وہ رکھ رکھاؤ کے دلدادہ ہیں اور معتبری رکھ رکھاؤ میں بڑی ممد و معاون رہتی ہے۔ بہر حال، یہ خصوصیت یہاں کی آب و ہوا کا تحفہ ہے۔

ہوا تو یہاں کی بڑی عمدہ ہے نہ اس میں دھواں ہوتا ہے اور نہ کارخانوں کی پیدا کردہ آلائش۔ چونکہ پہاڑیوں سے آتی ہے اور پہاڑیاں چیل کے درختوں سے چھان کر بھیجتی ہیں لہٰذا تازہ ہوتی ہے، پاکیزہ ہوتی ہے۔

راولپنڈی کا پانی بہت پتلا اور خشک ہے۔ اطبا کا کہنا ہے کہ یہ پانی شورہ ہی شورہ ہے۔ اس میں بوٹیاں نہیں ہوتیں۔ اسی وجہ سے معدے میں جا کر شور شرابا پیدا کرتا ہے۔

پندرہ بیس سال پہلے یہاں دونوں پانی دستیاب تھے۔ شوربے والا بھی، بوٹیوں والا بھی اور یہ پنڈیوں کی مرضی پر موقوف تھا کہ چاہیں تو شوربے والا پئیں، چاہیں تو بوٹیوں والا۔

اُن دنوں پہاڑیوں کی جانب سے بہت سے نالے پنڈی کی طرف بہتے تھے۔ ان میں برساتی بھی تھے اور چشمے بھی۔ چشموں کا پانی نہ شور تھا اور نہ خشک۔ اس میں دھاتیں تھیں۔ پتا نہیں کیا کیا تھا۔ بوٹیاں ہی بوٹیاں۔ ہم نے ترقی کے جذبے کے تحت جلد بازی کی اور سارے نالے اور چشمے راول ڈیم میں ڈال دیے۔

پنڈی کی مٹی میں پکڑ نہیں۔ قیام نہیں۔ بڑی بھُربھُری ہے۔ جیسے نوجوان کی طبیعت ہوتی ہے۔ ذرا سا پانی چلے تو یہاں کی مٹی اس کی اُنگلی پکڑ کر چل پڑتی ہے۔ اتنی ہرجائی ہے کہ بارش کا ہر قطرہ اسے اُنگلی لگائے پھرتا ہے۔

مٹی کی اس خصوصیت کی وجہ سے جیالوجی کے ماہر بڑے فکرمند ہیں۔ انھیں خوف دامن گیر ہے کہ اگر پہاڑیاں یونہی شدت سے بتاشے کی طرح گھلتی گئیں تو جلد ہی پہاڑیاں سپاٹ میدان بن جائیں گی۔ صرف چند ایک ہزار برس میں۔

پنڈی کی مٹی کی اس خصلت نے بلدیہ کو زچ کر رکھا ہے۔ بارش کی وجہ سے سڑکیں بیٹھ جاتی ہیں، پُل ننگے ہو جاتے ہیں اور باغیچوں کی سجاوٹ ختم ہو جاتی ہے۔

اسی وجہ سے پنڈی کے مُردوں کی کیفیت بڑی تکلیف دہ ہے۔ مٹی میں پکڑ نہ ہونے کی وجہ سے یہاں لحد والی قبر نہیں بن سکتی۔ سلامی والی قبر بنتی ہے۔ مُردے کو نیچے لٹا دیتے ہیں۔ اُوپر پتھروں کی سلیں رکھ کر

بکس بنا دیتے ہیں۔ پہلی ہی بارش میں اطراف کی مٹی گھل جاتی ہے اور سلیں نیچے گر پڑتی ہیں۔ بس چوروں کا خدا بھلا کرے، ورنہ روزِ قیامت تک مُردوں کی چھاتیوں پر پتھر کی سلوں کا بوجھ پڑا رہے۔

پنڈی کے رہنے والے شاید اسی مٹی سے بنے ہیں، اس لیے ان کی طبیعت بھی بھربھری ہے۔ اس میں استحکام نہیں۔ جذبے کی لہر آتی ہے اور ان کی اُنگلی پکڑ کر ساتھ لیے پھرتی ہے۔

جذبات ہی ان کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ تعلیم ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکی۔ تہذیب تو انھیں اپنے رنگ میں رنگ نہیں سکی۔

پانی کے شورے کی وجہ سے پنڈیوں کی طبیعت میں شوراشوری ہے۔ پیار میں شدت، غصّے میں شدت، نفرت میں شدت۔ دوست بن جائیں تو تن من دھن سے بنیں گے۔ مدد کرنے پر تُل جائیں تو جان چھڑانی مشکل ہو جائے گی۔ انتقام لینے کی ٹھان لیں تو یہ جذبہ پشت در پشت چلے گا۔

پنڈیئے نام کے راجے نہیں، مزاج کے راجے ہیں۔ رکھ رکھاؤ پر جان دیتے ہیں۔ گھر میں کھانے کو ہو نہ ہو مہمان بچ کر نہ جائے۔ یوں نوازیں گے جیسے حاتم ثانی ہوں۔ دوست مشکل میں پڑ جائے تو اس بات کا انتظار نہیں کریں گے کہ وہ مدد کے لیے پکارے، یوں چھاتی ٹھونک کر باہر نکلیں گے جیسے اپنے زمانے کے واحد مشکل کشا ہوں۔

چاہے زندگی حرام ہو جائے، چاہے سارا دھن لُٹ جائے، چاہے جان سے جانا پڑے لیکن عزت پر حرف نہ آئے۔ برادری میں سر اُونچا رہے۔ مونچھ اکڑی رہے۔ طرہ لہراتا رہے۔

پنڈیوں کا سب سے بڑا جذبہ گھر کی عزت ہے۔ اگر گھر کی عزت ایک ہزار روپیہ ماہوار خرچنے سے قائم ہو سکتی ہے تو وہ ایک ہزار روپیہ کمانے کے لیے تن من کی بازی لگا دیں گے لیکن ایک ہزار کمانے کے بعد اطمینان سے ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ جائیں گے۔ گیارہ سو کمانے پر کسی صورت تیار نہ ہوں گے۔ "ہٹاؤ، کون مشقت میں پڑے۔"

جب گھر کی عزت کا انتظام ہو جاتا ہے تو ان کے اندر کا محنت کش معدوم ہو جاتا ہے اور راجا باہر نکل آتا ہے۔ تخت پر بیٹھ جاتا ہے۔ اپنے طرّے کو مادا لگا لیتا ہے اور مونچھ مروڑنے لگتا ہے۔

پنڈیئے خوش باش لوگ ہیں۔ انھیں کھانے سے دلچسپی ہے۔کھلانے سے دلچسپی ہے۔ ملنے ملانے سے دلچسپی ہے۔ محفل سجانے سے دلچسپی ہے۔کھیل تماشے سے دلچسپی ہے۔ خاندانی جھگڑوں کی لت لگی ہے۔ دوستیاں بھی بہت اور دشمنیاں بھی بہت۔ روایات کو سینے سے لگائے پھرتے ہیں۔ اپنی بولی بولتے ہیں۔ اپنا لباس پہنتے ہیں۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنے رسم و رواج پر شرماتے نہیں، اُلٹا فخر کرتے ہیں۔

پنڈیئے گانا سننے کے بہت شوقین ہیں۔ زندہ ناچ گانا ہو تو کیا بات ہے۔ ویل دینے کی رسم چل نکلے تو اپنے رنگ میں آجاتے ہیں۔ پھر چاہے گانے والا ہو یا والی۔ کچھ فرق نہیں پڑتا۔ بس یہی دُھن سوار ہوجاتی ہے کہ ویل دینے میں کسی سے پیچھے نہ رہ جائیں۔

پُرانے زمانے میں پنڈی ایک قصبہ تھا جس کے اِردگرد چھوٹے چھوٹے گاؤں آباد تھے۔ ایک طرف "رتہ" تھا دوسری طرف "مریڑ" تھا اس سے پرے "جھنڈا" اور دُور "ڈھیری"۔

اس زمانے میں پنڈی شہر میں سب سے اہم جگہ راجا بازار تھی جہاں راجے موچھ مروڑتے، طرہ لہراتے گھومتے پھرتے تھے۔ اس بازار میں کھانے پینے کی دکانیں عام تھیں جہاں بڑے بڑے کھاٹ اور تخت بچھے رہتے جن پر بیٹھ کر قہوہ پیا جاتا، گوشت کے چپلی اور سیخ کباب نوش کیے جاتے۔

دوسری اہم جگہ ایک سڑک تھی جسے مری روڈ کہتے ہیں۔ پھر آہستہ آہستہ شہر پھیلتا گیا۔ گردونواح کے گاؤں شہر کے محلے بن گئے۔ مری روڈ پر تانگوں کے ساتھ ساتھ بسیں چلنے لگیں۔

پھر پاکستان کے قیام کے بعد دفعتاً مری کی اہمیت بہت بڑھ گئی۔ اس سے پہلے مری ایک ہل اسٹیشن ضرور تھا لیکن صحت افزا مقام نہ تھا، کیونکہ بہت گیلا تھا، بارشیں زیادہ ہوتی تھیں، ہوا نمی سے بھری رہتی تھی۔

تقسیم سے پہلے برِّصغیر میں بہت سے ہل اسٹیشن تھے جو ہل اسٹیشن ہونے کے علاوہ صحت افزا مقام بھی تھے۔ لہٰذا ہل اسٹیشنوں میں مری کی حیثیت شودھرانی کی سی تھی۔ قیامِ پاکستان کے بعد دفعتاً یہ شودھرانی باہمنی بن گئی۔ چونکہ مری واحد ہل اسٹیشن تھا جو ہمارے حصے میں آیا تھا لہٰذا مری کی اہمیت

بڑھ گئی۔ ساتھ پنڈی کی حیثیت بھی بڑھی ۔

پاکستان کے لیے مری ایک "ہالیڈے ریزارٹ" بن گیا۔ لوگ دُور دُور سے آنے لگے۔ پھر آہستہ آہستہ مری کی مال روڈ پر فیشن پریڈ ہونے لگی جو آج تک جاری وساری ہے۔ مگر اس پریڈ میں کبھی کسی مقامی خاتون نے شرکت نہیں کی۔ مقامی آبادی اس پریڈ کو عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھتی۔ یہ پوٹھوہاری خاتون کی عظمت کی دلیل ہے ۔

عام طور سے ایسے علاقے جہاں "ہالیڈے میکرز" کا اجتماع ہوتا ہے، ہالیڈے موڈ میں رچ بس جاتے ہیں اور عیاشی کی فضا کی لپیٹ میں آ کر ان کے اخلاق گر جاتے ہیں لیکن مری کے لوگوں نے آج تک اس ہالیڈے اسپرٹ کے اثر کو قبول نہیں کیا۔

عام طور پر یہ اصول ہے کہ پہاڑوں کے دامن میں رہنے والی خواتین جنسی لحاظ سے گرم ہوتی ہیں اور ان میں ضبط کے عنصر کا فقدان ہوتا ہے۔ مثلاً کانگڑہ ہے، چھمبہ ہے، شملے کے زیریں علاقے ہیں۔ لیکن پوٹھوہار اور آزاد کشمیر اس اصول سے مستثنیٰ ہیں۔ غالباً اس لیے کہ ان لوگوں کے دلوں میں اسلام کی خوشبو ہے اور وہ عزت کو سب سے بڑا وصف سمجھتے ہیں ۔

تقسیم کے بعد بھارت نے کشمیر کو ہتھیا لیا جس کی وجہ سے کشمیر کا راستہ بند ہو گیا۔ تجارتی نقطۂ نظر سے یہ پنڈی پر بہت بڑی ضرب تھی۔ اس ضرب تلے پنڈی کی ترقی رُک گئی اور یہ شہر کئی سال تک بیٹھا اونگھتا رہا۔

پھر دفعتہً پوٹھوہار میں ایک بھونچال آ گیا۔

صدر ایوب نے پوٹھوہار میں اسلام آباد کو پاکستان کا دارالخلافہ بنانے کا اعلان کر دیا۔
اس پر صاحبوں، افسروں اور کلرکوں کی اسپیشل گاڑیاں دھڑا دھڑ پنڈی پہنچنے لگیں۔
چک لالہ کی بارکیں اور پنڈی کے مضافات لوگوں سے کھچا کھچ بھر گئے۔

پھر پنڈی کے شمال میں مرگلہ پہاڑیوں کے قریب اسلام آباد نے سر اُٹھایا، مغربی طرز کے خوبصورت بنگلے، فلیٹس، کوارٹر، مارکیٹیں، ہموار مخملی کارپٹ سڑکیں، عجیب وغریب وضع کے

عالی شان دفتر، انوکھی وضع کے، روایت سے ہٹ کر مسجدیں اور چاروں طرف درخت ہی درخت، بوٹے ہی بوٹے۔ ایسے درخت اور بوٹے جو پاکستان میں کبھی دیکھنے میں نہ آئے تھے۔

اسلام آباد کا شہر اک معجزہ بن کر رونما ہُوا۔

نورپور اور سیدپور کے درمیان کا وہ زیریں علاقہ جہاں اسلام آباد تعمیر ہُوا ہے، ایک بنجر ویرانہ تھا جہاں کلّر زدہ زمین اور خاردار جھاڑیوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ کلر کی وجہ سے یہاں کچھ اُگ نہیں سکتا۔ اس خطّے میں کرلے سانپ رہتے تھے۔ بڑے بڑے کرلے تھے۔ نیولے تھے۔ اس علاقے میں دُور بین جیسی پتلی سڑکیں بنی ہوئی تھیں جو پنڈی سے نورپور اور سیدپور جاتی تھیں۔ یہاں حشرات الارض کی وجہ سے لوگ پیدل چلنے سے گریز کرتے تھے۔ اس علاقے میں آج ایک خوبصورت شہر، پھولوں سے مزیّن سڑکیں اور باغات اور لاکھوں درخت دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ واقعی اسلام آباد ایک معجزہ ہے۔ واقعی سی ڈی اے کا کام قابلِ تحسین ہے۔

اس شہر کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ نام کے سوا اس میں نہ اسلامی رنگ ہے نہ پاکستانی رنگ۔

درحقیقت اسلام آباد ابھی تک شہر نہیں بنا۔ اس میں عوامی رنگ پیدا نہیں ہوا۔ ابھی تک یہ شہر مغرب زدہ اہلِ کاروں کی ایک کالونی ہے۔ یہاں فائلوں کی باتیں ہیں۔ گریڈوں کے تذکرے ہوتے ہیں۔ دفتری سیاست کی سرگوشیاں اور سٹیٹس کی ذات پات رائج ہے۔ یہاں پاکستانی کلچر ڈرائنگ رومز میں سجاوٹ کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ اہلِ کاروں کے بیٹے بیٹیاں مغربی دھنوں پر امپورٹڈ ناچ ناچتے ہیں۔ السلام علیکم کی جگہ ہائی اور خدا حافظ کی جگہ بائی کہتے ہیں۔

اسلام آباد کے قیام کے بعد پنڈی کی کایا پلٹی۔ دیکھتے ہی دیکھتے مری روڈ گویا نالی سے دریا بن گئی۔ اتنی فراخ ہو گئی کہ ڈبل روڈ بن گئی۔ ویگنیں دونوں شہروں کے درمیان یوں چلنے لگیں جیسے وال کلاک کا پنڈولم چلتا ہے۔ سڑک کے کنارے مارکیٹیں اور اسٹور بن گئے۔ دونوں شہروں کے درمیان ویران علاقہ آبادیوں میں بدل گیا۔

آج اسلام آباد ایک انٹرنیشنل شہر کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔

آج پنڈی ایک اونگھتا ہوا شہر نہیں، ایک چاق و چوبند رو بہ ترقی سٹی بن رہا ہے۔

پنڈیے اپنے اِرد گرد نظر ڈالتے ہیں تو خوشی سے پھُولے نہیں سماتے۔ البتہ صاحبیت کے چڑھتے ہُوئے طوفان کو دیکھ کر سہمے سہمے نظر آتے ہیں۔ پنڈی کو دورِ جدید کی ترقی کی لپیٹ میں دیکھ کر گھبرائے ہُوئے ہیں۔ وہ دل ہی دل میں خائف ہیں کہ کہیں ترقی کی رو میں بہ نکلنے سے روایت کا دامن ان کے ہاتھ سے چھوٹ نہ جائے۔

انھیں اپنے رہن سہن اور لوک ورثے سے اتنا لگاؤ ہے کہ اس کے بغیر زندگی کا تصور ہی نہیں کر سکتے۔

پوٹھوہاریے جو سالہا سال مری کی فیشن پریڈ کو دُور سے دیکھتے رہے، دامن تر مکن ہشیار باش کی نظر سے دیکھتے رہے، گمانِ غالب ہے کہ وہ صاحبیت کی اس یلغار سے متأثر نہیں ہوں گے، بلکہ ہو سکتا ہے کہ مستقبلِ بعید میں ایک روز پنڈیے اسلام آباد پر یلغار کر کے اسے شہر بنا دیں اور اس شہر پر پوٹھوہار کا رنگ چڑھا دیں۔

پہلے پنڈیے اسلام آباد کو پنڈی کا ایک مضاف سمجھتے تھے لیکن اب وہ پنڈی کو اسلام آباد کا ایک محلّہ سمجھنے لگے ہیں۔ اسلام آباد پر وہ فخر محسوس کرنے لگے ہیں۔ شاید اس لیے کہ پوٹھوہار کے معروف بزرگ امام شاہ بری لطیف نے ڈھائی سو سال پہلے فرمایا تھا کہ نور پور کے گرد و نواح میں ایک شہر آباد ہوگا جو اسلامی دُنیا کا مرکز بنے گا۔

کاش کہ اسلام آباد کے معماروں کو شاہ بری لطیف کی عظمت کا احساس ہوتا اور وہ ان کے روضے کو "آؤٹ آف باؤنڈز" نہ کرتے بلکہ اسے اسلام آباد کا مرکز مان کر اس کے اِرد گرد شہر پلان کرتے۔

عورت کا المیّہ

آج کل عورت کا تذکرہ عام ہو رہا ہے۔ اخباروں میں، گفتگوؤں میں، جائزوں میں، بحثوں میں، چائے خانوں میں، مسجدوں میں، ادبی محفلوں میں۔

جب سے اسلامائزیشن کی بات چلی ہے، عورت کا تذکرہ بھی چل نکلا ہے۔ ایسے لگتا ہے جیسے اسلامائزیشن کے عمل کا عورت سے خصوصی تعلق ہے۔

چند ایک دانشور چائے خانے میں بیٹھے تھے۔ گپ شپ ہو رہی تھی۔ عورت کا ذکر چل نکلا۔ ایک نے کہا: عورت کی تمام تر توجہ بننے سنورنے پر مرکوز ہوتی ہے۔ دوسرا بولا: عورت بڑی باتونی ہے۔ کتر کتر باتوں کے ڈھیر لگانے کی شوقین ہے۔ تیسرے کہا: عورت کی سوچ کبھی ذات سے بے نیاز نہیں ہوتی۔ چوتھا بولا: مرد کی ذہنی اُڑان میں عورت واحد رُکاوٹ ہے۔ وہ سب عورت کے عیب گننے میں مصروف تھے۔ پھر کسی تفصیل پر بحث چھڑ گئی۔

ان کے قریب ایک شخص چُپ چاپ بیٹھا ان کی باتیں سُن رہا تھا۔ ایک دانشور نے اُس شخص سے مخاطب ہو کر پوچھا "کیوں صاحب، اس موضوع پر آپ کی کیا رائے ہے؟"
وہ شخص بولا "جناب، سبحان اللہ! کیا موضوع ہے۔ ڈیڑھ گھنٹے سے آپ اس موضوع پر بات کر رہے ہیں۔ ذرا نہیں اُکتائے۔"
شُکر ہے عورت میں اس موضوع کی عظمت کا شعور پیدا نہیں ہُوا، ورنہ ہم مردوں کے لیے مُشکل پیدا ہو جاتی۔

عورت کا المیہ یہ ہے کہ وہ بات کی عیب جوئی پر توجہ دیتی ہے۔ یہ نہیں دیکھتی کہ اس کی بات کس ذوق و شوق سے ہو رہی ہے۔

جب کرمی نگاہیں اس کا جائزہ لیتی ہیں کہ دوپٹہ سر کا ہوا تو نہیں، جسم کے پیچ و خم اُبھرے ہُوئے تو نہیں، بال جال بنے ہُوئے تو نہیں۔ عورت نگاہوں کا کرِڑا پن دیکھتی ہے۔ یہ نہیں دیکھتی کہ نظریں جائزہ لے رہی ہیں۔ آخر جائزہ لینے کے لیے کوئی بہانہ تو ہونا ہی چاہیے۔ بہانے کا سہارا لیے بغیر بے باکانہ جائزہ لینا ــــ اُونہوں! مرد فطری طور پر ایسی جسارت سے محروم ہے۔

عورت نے ابھی تک یہ بھید نہیں پایا کہ ہم مرد لوگ اس کی باتیں کرنے اور اس کا جائزہ لینے پر مجبور ہیں اور اس کے لیے بہانے ایجاد کرتے رہتے ہیں۔

پہلی غلطی تو ارسطو نے کی۔ سوچے سمجھے بغیر اعلان کر دیا کہ انسان عقلی حیوان ہے۔ بے شک عقل کا آنا جانا تو ہے لیکن عقل کا قیام نہیں۔ عقلیہ بات سوچنے کی صلاحیت تو ہے لیکن کیا خواہش بھی ہے؟ کبھی کبھار مُنھ کا ذائقہ بدلنے کے لیے ہم عقل کو اپنا لیتے ہیں۔ ویسے بنیادی طور پر انسان عقلی نہیں، جذباتی حیوان ہے۔

ارسطو کی اس بات نے بڑی غلط فہمیاں پیدا کیں۔ کچّے پھل کو یہ زعم ہو گیا کہ وہ پکا ہُوا ہے۔ اس پر وہ مارے خوشی کے ڈال سے ٹوٹ کر نیچے گر پڑا۔

دوسری غلطی سائنس دانوں نے کی۔ اُنھوں نے بن سوچے سمجھے کہہ دیا کہ مرد اور عورت ایک مخلوق ہیں۔ انھوں نے دیکھا کہ دونوں دو پاؤں پر چلتے ہیں۔ دونوں کے بازو ہیں ٹانگیں ہیں۔ دونوں کے شانوں پر سر رکھا ہُوا ہے۔ اور سر پر مُنھ ہے، خدوخال ہیں۔ لہٰذا یقیناً وہ ایک سپیشی (SPECIE) ہیں۔ سائنس دانوں سے یہ توقع نہ تھی کہ وہ سطحی مشاہدے کے بل بوتے پر فیصلہ دے دیں گے۔ اُنھوں نے اس حقیقت کو نہ جانا کہ اگرچہ دونوں ایوان باہر سے ایک جیسے ہیں لیکن اندر سے قطعی طور پر مختلف اور متضاد ہیں۔

سائنس دانوں کی اس خوش فہمی نے فرد اور عورت کے درمیان ایک دیوار کھڑی کر رکھی ہے، اس مفروضے کی بنا پر کہ دونوں ایک ہی مخلوق ہیں۔ مرد سمجھتا ہے کہ میں عورت کو سمجھتا ہوں۔ عورت سمجھتی ہے کہ میں مرد کو سمجھتی ہوں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ نہ مرد عورت کو سمجھتا ہے اور نہ عورت مرد کو سمجھتی ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش یا خواہش ہی نہیں ہے۔ کیسے ہو، جب پختہ یقین ہو کہ ہم ایک ہی مخلوق ہیں؟

میری دانست میں عورت مرد کی نسبت برتر مخلوق ہے۔

اگر یہ مان لیا جائے کہ انسان کی عظمت جذبے سے ہے، عقل کی بنا پر نہیں تو عورت یقیناً بہتر مخلوق ہے۔

جذبے کی عظمت سے انکار کرنا ممکن نہیں، کیونکہ محبت، خدمت، قربانی، میل ملاپ، رشتے، یہ سب اوصاف جذبات پر استوار ہوتے ہیں۔ جذبات جوڑتے ہیں۔ عقل کاٹتی ہے۔ یہاں تک کہ ایمان بھی جذبے کے زور پر پیدا ہوتا ہے۔ عقل تو شکوک و شبہات کو ہوا دیتی رہتی ہے۔

سب سے پہلی عقل کی بات یا دلیل ابلیس نے کی تھی۔ کہنے لگا: یا باری تعالیٰ! میں اسے سجدہ کیسے کروں؟ میں برتر ہوں۔ یہ مٹی سے بنا ہے اور میں آگ سے۔

اگرچہ مرد اور عورت دونوں میں جذبات موجود ہیں لیکن عورت کے جذبات زیادہ لطیف ہیں۔ ان میں قیام ہے۔ معصومیت ہے۔ روانی ہے۔

مثال کے طور پر مرد کے جذبات ہارمونیم کی سُر سے مشابہت رکھتے ہیں۔ پردے کو جتنی دیر دبائے رکھو گے، سُر پیدا ہوتی رہے گی۔ چھوڑ دو گے تو ختم ہو جائے گی۔ اس کے برعکس عورت کے جذبات کو تاروں والے ساز مثلاً سارنگی سے تشبیہ دی جاسکتی ہے۔ کسی تار کو چھیڑ دو تو اس کے ساتھ کے تار بھی لرزش میں آجائیں گے۔ مضراب ہٹا لینے کے بعد بھی سُریں گونجتی رہیں گی۔ تموجات جاری رہیں گے۔

عورت کا جذبہ جسم کے بند بند میں رچا ہوتا ہے۔ اور اس رچاؤ میں ایک مٹھاس ہوتی ہے۔ ایک روانی۔ ایک لطافت۔

عورت میں سنسیٹیوٹی یا حساسیت زیادہ ہوتی ہے۔ اس کے اندر کا ریسیور زیادہ حساس ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ مرد کی نسبت زیادہ جیتی ہے۔ خوشی اور غمی دونوں کیفیتیں اس پر زیادہ اثر انداز ہوتی ہیں۔ اور ان کیفیتوں کے تموّجات دیرپا اور گہرے ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس مرد پر یہ کیفیتیں سطحی اور وقتی اثرات رکھتی ہیں، جیسے کسی تالاب میں ایک پتھر پھینک دو تو نتیجتہً جو لہریں پیدا ہوں گی وہ عورت کے جذبات کی آئینہ دار ہوں گی۔ گہرائیوں سے اُٹھیں گی اور سطح پر چاروں طرف پھیل جائیں گی۔

اسی حساسیت کی بنا پر عورت مرد کی نسبت زیادہ جیتی ہے۔ چونکہ زندگی میں دُکھ کا عنصر زیادہ ہے اس لیے عورت کی زندگی میں دُکھ زیادہ ہوتا ہے۔ ہم مرد لوگ دُکھ اور سُکھ کے مفہوم سے اتنی گہری واقفیت نہیں رکھتے جتنی عورت رکھتی ہے۔

عورت کو فطرت کی سب سے بڑی دین ممتا ہے جو انسانی نسل کے تحفظ اور پرورش کا ذریعہ ہے۔ جو ایک ایسا دھارا ہے جس سے بہت سے مثبت جذبات پھوٹتے ہیں۔

دِقت یہ ہے کہ دورِ حاضر میں نئی روش کے تحت عورت نے لڑکی بن کر جینے کو اپنا لیا ہے۔ وہ عورت بن کر جینے سے الرجک ہو گئی ہے۔ پُرانے زمانے میں حُسن کا معیار صحت مند مٹیار ہوا کرتی تھی۔ اب پچکے ہوئے گالوں والی زرد رُو انمک لڑکی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ عورت میں ممتا کا دھارا سُوکھتا جا رہا ہے۔

وہ بچوں کو اپنانے سے شرمانے لگی ہے۔

اسے اماں کہلوانے سے چڑ ہو گئی ہے۔ کہتی ہے: مجھے آپا کہہ کر بلاؤ۔ باجی کہو۔ ماں نہ کہو۔

وہ بچوں کو دُودھ نہیں پلاتی۔ اس سے فگر خراب ہو جاتی ہے۔ بچے کو دُودھ نہ

پلانے کی وجہ سے بچّوں سے ماں کا رشتہ کمزور رہ جاتا ہے۔

ممتا کے جذبے کا صرف بچّوں سے ہی تعلق نہیں ہوتا، میاں سے بھی ہوتا ہے۔ چونکہ ظاہری پھوں پھاں اور ٹیں کے باوجود میاں درحقیقت ایک بچّہ ہوتا ہے، اس لیے سہاگ اپنے قیام کے لیے بڑی حد تک ممتا کا محتاج ہے۔ پنجابی میں مثل مشہور ہے کہ ووہٹی گجّی ماں ہوندی اے۔ مطلب یہ کہ بیوی درپردہ ماں ہوتی ہے۔

یہ لڑکی پن کا جنون کیسے پیدا ہُوا؟ مجھے اس کا علم نہیں۔ میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ ہمارے ہاں یہ جنون روز بروز شدّت اختیار کرتا جا رہا ہے۔

چند مشاہیرِ نفسیات کا مفروضہ ہے کہ چونکہ عورت کی سب سے بڑی خواہش توجہ طلبی اور چاہا جانا ہے، اس لیے اس کا رُوپ بہروپ مرد کی خواہش کے تابع ہے۔ اگر مرد موٹی عورت کو پسند کرنے لگیں تو عورتیں موٹی ہوتی جائیں گی۔ اگر مرد بھینگی عورتوں کو پسند کریں تو عورتیں بھینگی ہو جائیں گی۔ اگر مرد انیمک عورتوں کو پسند کرنے لگیں تو عورت کا جسم خون بنانا بند کر دے گا۔ پُرانے زمانے میں گلاب سے گالوں کو پسند کیا جاتا تھا۔ آجکل پچکے ہُوئے گالوں کو پسند کیا جاتا ہے۔

پتا نہیں یہ مفروضہ کس حد تک درست ہے۔ بہرصورت یہ امر مسلمہ ہے کہ آجکل ہمارے ہاں عورت پر لڑکی بن کر جینے کا جنون طاری ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ فیشن زیادہ دیر تک نہیں چل سکتا، کیونکہ یہ فطرت کے منافی ہے۔ اور فطرت کو بقائے نوعِ انسانی مقصود ہے۔ فطرت کا منشا ہے کہ عورت ماں بن کر جیئے۔

عورت کی زندگی کا سب سے بڑا المیہ محبت سے متعلق ہے۔ مرد اور عورت کی محبتوں میں ایک بنیادی فرق ہے۔

مرد محبت کرنا چاہتا ہے۔ محبت کرنا اس کے بس میں ہے۔ جسے چاہے، جب چاہے، کرے۔ محبت کرنے کا طلب یا وصال سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس

عورت کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ چاہی جائے۔ یہ فعل اس کے بس میں نہیں۔ اس کا انحصار دوسرے پر ہے۔ دُوسرا چاہے، نہ چاہے۔

آج کل آزادی کے دور میں یہ بات اور بھی پیچیدہ ہو گئی ہے، کیونکہ عورت خالی چاہے جانے کی متمنّی نہیں بلکہ اس بات کی خواہاں ہے کہ جو مرد اُسے پسند ہے، وہ اُسے چاہے۔

پتا نہیں کیوں ہم مردوں نے یہ خوش فہمی پیدا کر رکھی ہے کہ عورت کی چاہے جانے کی خواہش جسم سے تعلّق رکھتی ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ عورت سے جسمانی ملاپ کر لو تو وہ مطمئن ہو جاتی ہے۔ یہ مفروضہ قطعی طور پر غلط ہے۔ عورت کو درحقیقت ایک محبّت بھری گود چاہیئے۔ محبّت بھرا ماحول۔ محبّت بھری وفا۔

بنیادی طور پر وہ جسمانی ملاپ اس لیے گوارا کر لیتی ہے تاکہ محبّت بھری فضا قائم رہے۔ ٹوٹنے نہ پائے۔ میں یہ مانتا ہوں کہ ایسی عورتیں بھی ہیں جن کا مقصد صرف جسمانی ملاپ ہے۔ مگر ان کی تعداد بہت کم ہے۔ اتنی کم کہ آپ اسے نظر انداز کر سکتے ہیں۔ یہ صورتِ حال نارمل نہیں۔ آپ اسے بیماری سمجھ سکتے ہیں۔ ہومیوپیتھی میں ایسی ادویات موجود ہیں جو اس بیماری سے شفا دے سکتی ہیں۔

البتّہ ایک بات اہم ہے۔ وہ یہ کہ ناگواری کی صورت میں بھی، جسمانی قُرب کے دوران، ایک مقام ایسا آتا ہے جب عورت کا جسم جاگ اُٹھتا ہے۔ ذہن مغلوب ہو جاتا ہے اور وہ بے بس ہو کر رہ جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کلی عورت میں فطرت نے ٹانک رکھی ہے۔

بہرطور ایک بات مسلّمہ ہے کہ محبّت کے جذبے کے تحت مرد میں جسم کی طرف رُجحان عورت کی نسبت زیادہ ہوتا ہے۔

یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ شہوانی عورتوں کے مقابلے میں ایسی عورتوں کی تعداد کہیں زیادہ ہے جنھیں جسمانی ملاپ سے قطعی رغبت نہیں۔ بلکہ جن کے لیے جسمانی ملاپ

تکلیف دہ ہے۔ اور وہ اس تکلیف کو صرف اس لیے برداشت کر لیتی ہیں کہ محبّت کی فضا سے محروم نہ رہ جائیں۔

اگر ایسی عورتوں کو ناعورت کہا جائے تو شہوانی عورتوں کی نسبت ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ بلکہ نامردمردوں کی نسبت بھی ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔

عورت کا دُوسرا المیّہ یہ ہے کہ وہ اظہارِ محبّت کر دیتی ہے، اور یوں دل سے اُتر جاتی ہے۔

ویسے ماہرینِ نفسیات کا کہنا ہے کہ عورت میں جذب کر لینے یا سہ جانے کی طاقت بہت زیادہ ہے۔ مرد میں کرنے کی طاقت زیادہ ہے۔ اسی جسمانی طاقت کے بل بوتے پر وہ لاٹھی بنا پھرتا ہے، اور بھینس پر حکومت کر رہا ہے۔

سہ جانے یا جذب کر لینے کی طاقت افضل تر طاقت ہے۔ لیکن ہم نے کبھی اس طاقت کی عظمت کو تسلیم نہیں کیا۔ انسان کو مہذّب ہوئے صدیاں بیت گئی ہیں۔ لیکن آج بھی لاٹھی کی طاقت کا راج ہے۔ اس کے باوجود جذب کرنے اور سہ جانے کی طاقت مذہب کے، تہذیب کے اور روحانی ارتقا کے لحاظ سے افضل صلاحیّت ہے۔ عورت کی اس خصوصیّت کو مدِّنظر رکھتے ہُوئے چاہیے تو یہ کہ وہ محبّت کو بھی جذب کرے، اس کا اظہار نہ کرے اور مرد کے دل سے نہ اُترے، کیونکہ مرد تو بے پروا، بے نیاز اور بے وفا عورت سے محبّت کرتا ہے۔ یہ اس کی سرشت میں داخل ہے۔ ہتھیار ڈال دینے والی یا خود کو حوالے کر دینے والی عورت اس کے دل سے اُتر جاتی ہے۔ مرد کو تو چیلنج چاہیے۔

بے شک عورت محبّت کو جذب کیے رکھتی ہے۔ لیکن اس کا کیا جائے کہ محبّت عورت کے روئیں روئیں میں بسی ہوتی ہے۔ لہریں لے رہی ہوتی ہے۔ وہ مُنھ سے محبّت کا اظہار نہ بھی کرے تو بھی اس کا انگ انگ بولتا رہتا ہے۔ محبّت کا اظہار کرتا رہتا ہے۔ آرتی میں پھُول سجائے دیوتا کے گرد پھرتا رہتا ہے۔ دیوتا کو بتلائے بنا پتا چل جاتا ہے کہ پجارن تو مرمٹی۔

سپردگی کا یہ احساس مرد کے لیے ناقابلِ قبول ہے۔ لہٰذا پجارن اس کے دل سے اُتر جاتی ہے۔

ہمارے ہاں بہت سے گھرانے ایسے ہیں جہاں بیوی نے اپنی قدر و منزلت کھو دی ہے، صرف اس لیے کہ وہ میاں پر مرمٹی۔

اپنی عظمت قائم رکھنے کے لیے عورت کے لیے سب سے بڑا حربہ فاصلہ ہے۔ مغرب کی عورت نے جوشِ آزادی میں اس حربے کو ترک کر دیا ہے۔ خود کو عام کر دیا ہے۔ اور اپنی قدر و قیمت کھو دی ہے۔ اسی وجہ سے وہاں شادی کی تقدیس ختم ہو چکی ہے۔ جنسی ملاپ کی تقدیس ختم ہو چکی ہے۔ لہٰذا اختلاط گائے بھینسوں کے ملاپ کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ جنسی حس ختم ہوتی جا رہی ہے۔ مرد نامرد ہوتے جا رہے ہیں۔ ملاپ میں لذت کا عنصر ختم ہوتا جا رہا ہے۔

اسلام میں فاصلے کی تاکید اسی لیے کی جاتی ہے کہ عورت اور جنس کی تقدیس قائم رہے۔

پاکستان

جس زمانے میں پاکستان کے قیام کے لیے جدوجہد ہو رہی تھی، ان دنوں میرے دل میں پاکستان کے لیے کوئی جذبہ نہ تھا۔ نہ مثبت نہ منفی۔ میرے لیے پاکستان کا کوئی مفہوم ہی نہ تھا۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ مسلمان الگ ملک کیوں مانگ رہے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ مسلمانوں کے اس مطالبے پر ہندو کیوں چراغ پا ہوتے ہیں۔ حصولِ پاکستان کی جدّوجہد میرے لیے ایک ایسا ڈراما تھا جو سامنے مگر دُور، بہت دُور کھیلا جا رہا تھا۔ اس ڈرامے کو میرے جذبات سے کوئی تعلق نہ تھا۔ ایسے ہی جیسے کسی چیز کو آپ دیکھتے ہیں، اس پر سوچتے ہیں، ذہنی طور پر اسے سمجھتے بھی ہیں لیکن وہ آپ کی زندگی کا جزو نہیں بنتی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ میں اسلامی جذبے سے قطعی طور پر کورا تھا۔

اُسی دور کی بات ہے، میرا ایک دوست تھا مجید ملک۔ تھا تو مغرب زدہ لیکن قیامِ پاکستان کی جدّوجہد میں پیش پیش تھا۔ ایک روز میں نے ملک سے پُوچھا "بھئی، سمجھ میں نہیں آتا کہ قیامِ پاکستان کے لیے تم اتنے دُکھی کیوں ہو رہے ہو؟"

وہ ہنسا۔ بولا "ظاہر ہے۔"

میں نے کہا "ظاہر تو کچھ بھی نہیں۔"

بولا "بھئی، اس لیے کہ میں مسلمان ہوں۔"

اس پر میری ہنسی نکل گئی۔ میں نے کہا "بھائی میرے، نہ تم نماز پڑھتے ہو، نہ روزہ رکھتے ہو، نہ تمھارے رہن سہن میں اسلامی جھلک ہے۔ پھر تُم مسلمان کیسے ہوئے؟"

مجید ملک نے کہا "اس طرح کہ اگر میں گھر سے باہر نکلوں، دیکھوں کہ بازار میں ایک ہندو اور مسلمان آپس میں لڑ رہے ہیں تو میں یہ پوچھوں گا کہ بات کیا ہے، یہ نہیں سوچوں گا کہ کون سچا ہے اور کون جھوٹا یا قصور کس کا ہے۔ پوچھے بغیر میں ہندو کو پیٹنا شروع کر دوں گا۔ مسلمان ہونے کی یہی ایک نشانی ہے۔ اور میں تو بھئی خالی مسلمان ہی نہیں پکا مسلمان ہوں، پکا۔"

"کیا مطلب؟" میں نے پوچھا۔

ایک ساعت کے لیے اس نے سوچا۔ پھر بولا "مثلاً اگر ابھی اس کمرے کی چھت پھٹ جائے اور اُوپر سے ایک تخت اُتر آئے۔ تخت پر ایک فرشتہ بیٹھا ہو، فرشتہ مجھ سے کہے کہ اللہ میاں نے مجھے تمہارے پاس بھیجا ہے، فرمایا ہے کہ جاؤ مجید ملک پر اس حقیقت کا انکشاف کر دو کہ اسلام سچا مذہب نہیں ہے، تو میں فرشتے کو جواب دوں گا کہ اللہ میاں سے میرا اسلام کہنا اور عرض کرنا کہ حضور کا پیغام مل گیا۔ شکریہ۔ لیکن مجید مسلمان ہے اور مسلمان ہی رہے گا۔"

مجید کی اس بات نے مجھے سوچ میں ڈال دیا۔ کئی روز میں گہری سوچ میں پڑا رہا۔ شاید بنیادی طور پر مذہب جذبے ہی کا نام ہے۔ اس کے باوجود میرے دل میں جذبہ پیدا نہ ہوا۔ نہ اسلام کے لیے، نہ پاکستان کے لیے۔

پاکستان کے قیام سے کچھ عرصہ پہلے جب چھرا بازی کے واقعات عام ہو گئے تھے، میں بمبئی میں مقیم تھا۔ ان تشدد بھرے واقعات کو دیکھ کر مجھے ہندوؤں پر غصہ آنے لگا۔ آخر قیامِ پاکستان پر وہ اس قدر مشتعل کیوں ہو رہے تھے؟ کیوں تشدد پر تلے ہوئے تھے؟ سڑکوں پر اور گلیوں میں نہتے راہ گیروں کو خنجر مارنے سے کیا پاکستان کے قیام کو روکا جا سکتا ہے؟ پاکستان میرے قریب آتا جا رہا تھا۔

انہی دنوں بمبئی کی سٹیج پر پاکستان کے قیام کے خلاف کھیل کھیلے جا رہے تھے۔ ان کھیلوں کے رُوحِ رواں پرتھوی راج تھے۔ پرتھوی راج کو میں ایک عظیم فن کار سمجھتا ہوں۔ ان دنوں بھی میرے دل میں ان کے لیے بے پناہ عزت تھی۔ ایک روز میں کھیل دیکھنے گیا۔ پیش کش اعلیٰ تھی۔

اداکاری عمدہ تھی۔ لیکن پراپیگنڈہ بھونڈا تھا۔ کھیل ختم ہوا تو تھیٹر کے تمام دروازے بند کر دیے گئے۔ تماشائیوں کے باہر نکلنے کے لیے ایک خصوصی راستہ کھولا گیا۔ یہ راستہ ایک تنگ اور گھومتی ہوئی گلی پر مشتمل تھا جس میں سے صرف ایک آدمی گزر سکتا تھا۔ اس لیے تماشائی ایک دوسرے کے پیچھے لمبی قطار میں آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ گلی کے ایک فراخ گوشے میں پرتھوی راج تھیٹر والی میک اپ میں کھڑا تھا۔ اس کا سر عجز و احترام سے جھکا ہوا تھا۔ اس نے اپنے دامن کو جھولی بنا کر تھام رکھا تھا۔ جھولی نوٹوں سے بھری ہوئی تھی جس میں چند ایک چیک بھی تھے۔ ظاہر تھا کہ وہ قیامِ پاکستان کے خلاف پراپیگنڈا کرنے کے لیے "دان" مانگ رہا تھا۔ پرتھوی راج کو عجز کی تصویر بنے دیکھ کر میرے دل میں پیار کا ایک ریلا اٹھا، لیکن جھولی دیکھ کر غصہ آ گیا۔ یہ شخص کیا توقع رکھتا ہے مجھ سے ؟ ــــ جی چاہا کہ جیب سے ہاتھ نکال کر پرتھوی راج کو مکا دکھاؤں اور دانت پیس کر کہوں "اتنی جسارت!" لیکن طبعاً میں ایک کمزور آدمی ہوں اور محفل کے رنگ سے ہٹ کر بات کرنے سے ہچکچاتا ہوں۔ میرا ہاتھ مکا نہ بن سکا۔ الٹا اس نے پانچ روپے کا نوٹ نکال کر پرتھوی راج کی جھولی ڈال دیا۔

اس رات غصے کی وجہ سے مجھے نیند نہ آئی۔ مجھے اپنے آپ پر غصہ آ رہا تھا۔ میں نے پاکستان کے خلاف چندہ کیوں دیا؟ کیوں؟ میں نے پرتھوی راج کو مکا کیوں نہ دکھایا؟ اس کے بعد جب بھی خبر آتی کہ کسی غنڈے نے راہ گیر مسلمان کے پیٹ میں چھرا بھونک دیا ہے تو میں محسوس کرتا کہ وہ غنڈا میرے ان پانچ روپے کے عوض کرائے پر لیا گیا تھا۔ میرے اس پانچ روپے کے نوٹ کی وجہ سے ایک مسلمان کا پیٹ چاک ہو گیا تھا۔ غنڈے کے چھرے کے دستے پر میرا نام کندہ تھا۔

چھرا چلانے کی وارداتیں بڑھتی گئیں۔ نفرت کے جذبات کی وجہ سے میں غنڈوں کی طرف سے پیچھے ہٹتا گیا۔ پاکستان کے قریب، اور قریب اور قریب۔ بھارت سے میری یہ پسپائی نفرت اور ڈر کی وجہ سے تھی جس میں نفرت کا عنصر ڈر پر غالب تھا اور یہ نفرت کبھی کبھار

اتنی شدت اختیار کر لیتی کہ میرا جی چاہتا، بھرے بازار میں نعرہ لگاؤں "اللہ اکبر! پاکستان زندہ باد ہ!"

اُس روز احمد بشیر اور میں بمبئی کے ایک ہندو علاقے سے گزر رہے تھے۔ ذاتی طور پر میں کبھی اس علاقے سے گزرنے کی جسارت نہ کرتا۔ مگر میرا ساتھی احمد بشیر طبعاً خطرے سے دوچار ہونے کا دلدادہ ہے۔ وہ پیدائشی پاکستانی ہے۔ ڈر اور خوف سے بے پروا۔ خطرے کا پروانہ۔ وہ مجھے زبردستی ایسے مقامات پر لے جاتا تھا۔ دفعتہً ٹریفک رُک گئی۔ چوک میں ہندوؤں کا ایک ہجوم کھڑا تھا۔ "سب پیدل چلنے والے بائیں ہاتھ کی پٹڑی پر آجائیں" کسی نے لاؤڈ سپیکر پر اعلان کیا۔ تمام لوگ پٹڑی پر اکٹھے ہو گئے، اور باری باری کیو میں آگے بڑھنے لگے۔ میں نے گھبرا کر احمد بشیر کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں پھلجھڑیاں چھوٹ رہی تھیں۔ ہونٹوں پر تبسم تھا۔ پٹڑی پر ایک میز رکھا تھا۔ ایک آدمی رجسٹر سامنے رکھے کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ راہ گیر رجسٹر پر اپنا نام اور ولدیت لکھوا رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ نام لکھنے کا مقصد مسلمانوں کو چھانٹنا ہے۔ "آرتھر" میں نے باآواز بلند احمد بشیر سے کہا۔ پہلے تو اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا، پھر سمجھ گیا۔ "آرتھر، یہ سب کیا ہے؟" میں نے دُہرایا۔ "کچھ بھی نہیں، مائیکل" اس نے باآواز بلند کہا اور ہنسنے لگا۔ "گورنمنٹ کے نام کوئی عرض داشت بھیجی جا رہی ہے، جس پر دستخط کرا رہے ہیں۔ کیوں مسٹر؟" اس نے ساتھ کھڑے لالہ جی سے پوچھا "او کے؟"

جب میں رجسٹر پر دستخط کرنے لگا تو مجھ پر ایک دہشت سی سوار ہو گئی۔ جی چاہا کہ چیخ چیخ کر کہوں "میں محمد ممتاز ہوں، محمد ممتاز۔ میں مسلمان ہوں۔ میرے پیٹ میں چھرا بھونک دو۔ وہی چھرا جسے ان پانچ روپوں سے خریدا گیا ہے جو میں نے چندے کے طور پر دیے تھے۔ میں نے پاکستان کے خلاف جرم کیا ہے۔ یہی میری سزا ہے"۔ لیکن میرے حلق میں آواز نہ تھی کسی نے میرا اعلان نہ سُنا اور میں نے چپکے سے مائیکل مونٹی ولد جان مونٹی بقلم خود رجسٹر میں لکھ دیا اور آگے چل پڑا۔

یہ سچ ہے کہ مجھ میں جرأت نہ تھی۔ لیکن پاکستان اور میرے درمیان اب قطعی طور پر کوئی فاصلہ نہیں رہا تھا۔ پاکستان میرے جذبات میں داخل ہو چکا تھا۔ بظاہر ایک دیوار حائل تھی۔ جرأت کی دیوار۔

پھر جو میں نے چاروں طرف غور سے دیکھا تو کسی میں بھی جرأت نہ تھی۔ کانگرس مسلمانوں اور دنیا کو دھوکا دے رہی تھی۔ پرتھوی راج اپنے آپ کو دھوکا دے رہا تھا۔ سب جھوٹے تھے۔ صرف دو افراد سچے تھے۔ صرف دو۔ ان میں خلوص تھا۔ وہ پاکستانی جو اللہ اکبر کے نعرے لگاتا تھا اور وہ غنڈا جو مسلمان راہگیر کے پیٹ میں چھرا بھونکتا تھا ـــــــ اور میں۔ بے شک میں بزدل تھا۔ میرا دل جذبے سے خالی تھا۔ لیکن میں جھوٹا نہ تھا۔ نہ دوسروں کو فریب دیتا تھا، نہ اپنے آپ کو۔

۱۴ر اگست ۱۹۴۷ء کا دن آگیا۔ اس روز میں نے پہلی مرتبہ پاکستان کے لیے مثبت جذبہ محسوس کیا۔ رات کے بارہ بجنے والے تھے۔ ہم ریڈیو سیٹ کے پاس بیٹھے تھے۔ ریڈیو پر سگنیچر ٹیون بج رہی تھی۔ دف کی گمک عجیب سا ارتعاش پیدا کر رہی تھی، جیسے طبل جنگ بج رہا ہو۔ اونچے سُروں میں طوطی للکار رہی تھی۔ لیکن میرے لیے اس سگنیچر ٹیون کی کوئی خاص اہمیت نہ تھی۔ میں کسی کتاب کے مطالعے میں محو تھا۔ دفعتہً اعلان ہوا: ریڈیو پاکستان ـــــ میرے ہاتھ سے کتاب چھوٹ گئی ـــــــ سارے بدن پر چیونٹے رینگنے لگے۔ دل میں ایک ہوائی سی چھوٹی۔ سارے وجود میں رنگین ستارے ناچنے لگے۔ ـــــ پاکستان کے لیے یہ پہلا مثبت جذبہ تھا، جس نے ان جانے میں میرے بند بند کو جھنجوڑ دیا۔ جیسے چودھویں کا چاند سوئے ہوئے سمندر کو چابک مار کر جگا دیتا ہے۔

پاکستان کے قیام کے بعد بمبئی میں شہرت اور امارت کے واضح امکانات مہمل دکھائی دینے لگے۔ ساز و سامان، جس کے حصول کے لیے ہم بمبئی گئے تھے، اپنی اہمیت کھو چکا تھا۔ لہٰذا احمد بشیر اور میں جوں توں پاکستان آ پہنچے۔ یہاں پہنچ کر صرف ایک فکر دامنگیر تھا کہ اپنے عزیز و اقربا

کو ضلع گورداسپور سے نکال کر پاکستان لے آئیں۔ پاکستان ہمارے لیے دارالسلام بن گیا تھا۔ پاکستان میں ہمارے لیے، مسلمانوں کے لیے سلامتی تھی۔ اب مجھے شدت سے احساس ہُوا کہ میں مسلمان ہوں۔ چاہے میرے دل میں ایمان کی روشنی تھی یا نہیں تھی۔ چاہے میری زندگی اسلام کے رنگ میں رنگی تھی یا نہیں۔ چاہے میرے قلب میں اسلامی جذبہ تھا یا نہیں۔ بہرحال میں مسلمان تھا۔

قیامِ پاکستان کے بعد مہاجرین کے کیمپوں میں مسلمانوں کی حالتِ زار دیکھ دیکھ کر، مشرقی پنجاب میں کُشت و خون کے واقعات کے بارے میں سُن سُن کر، بھارت کے رویّے کو دیکھ دیکھ کر، یہ خیال مستحکم ہوتا گیا کہ پاکستان سے ہماری زندگی اور سلامتی وابستہ ہے۔ لیکن ابھی تک یہ جذبہ خام تھا۔ یہ جذبہ حفظِ ماتقدم کے لیے تھا۔ اپنی ذات کے لیے محدود تھا۔ ضرورتِ وقتی کی پیداوار تھا۔ بھارت کے طرزِ عمل کا ردِّ عمل تھا۔ یہ جذبہ اسلام کی عظمت کا حامل نہ تھا۔ آٹھ سال گزر گئے۔

اس عرصے میں ایک ایسے ادیب سے میری راہ و رسم ہو گئی جو اسلامی جذبے سے سرشار تھے اور جن کی زندگی میں عملی طور پر اسلامی رنگ نمایاں تھا۔ ایک روز میں ان کے ہاں گیا تو وہاں ایک معمّر آدمی خواجہ صاحب بیٹھے تھے۔ ہمارا تعارف ہو گیا۔ اس کے بعد مجھے کئی بار خواجہ صاحب سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ خواجہ صاحب کم گو تھے۔ اپنی بات کہنے کے بجائے دوسرے کی بات سننے کے عادی تھے۔ ذہین اور باریک بین تھے۔ دوسروں کی مدد کرنے کے دلدادہ تھے۔ اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ راست گو تھے۔ ایک روز میرے دوست نے مجھ سے کہا کہ خواجہ صاحب اچھے بزرگ ہیں۔ لیکن خواجہ صاحب میں بُزرگ کی خصوصیت دکھائی نہ دیتی تھی۔ میرے نزدیک بزرگ وہ ہوتے ہیں جو جبّہ دھاری ہوں۔ جن کی ہر بات سے ذاتی اہمیت مترشح ہوتی ہو۔ جو ڈائس بنا کر بیٹھنے کے عادی ہوں اور پند و نصیحت سے شغف رکھتے ہوں۔ خواجہ صاحب میں ایسی کوئی بات بھی تو نہ تھی۔ ان کی گفتگو میں روحانیت کی طرف کوئی اشارہ نہ ہوتا تھا۔ بلکہ عام دُنیاوی مسائل پر وہ بڑے زیرک انداز میں دُنیاوی نقطۂ نظر سے بات کرنے کے عادی تھے۔ ان وجوہات کی بنا پر میں نے خواجہ صاحب سے ملنا جلنا جاری رکھا ورنہ اگر مجھے ذرا بھی شُبہ

پڑھ جاتا کہ وہ بزرگ ہیں اور روحانیت سے تعلق رکھتے ہیں تو میں یقیناً ان سے پیچھے ہٹ جاتا، کیونکہ مجھے بزرگوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔

ایک روز میں قبرستان کی طرف جانکلا۔ دیکھا کہ ایک معمولی سی چاردیواری کے اندر خواجہ صاحب ایک مزار پر فاتحہ پڑھ رہے ہیں۔ میں رُک گیا۔ فارغ ہونے کے بعد خواجہ صاحب حسبِ دستور بڑے تپاک سے ملے۔ کہنے لگے "کہیے، کیا حال چال ہے؟" میں نے کہا "جی، کوئی خاص اچھا نہیں۔ بس غم کھا رہے ہیں۔" بولے "کیوں؟ غم کس بات کا؟" میں نے کہا "خواجہ صاحب، پاکستان کا کیا بنے گا؟ یہ کشتی تو ڈول رہی ہے۔" میں نے یہ بات تفریحاً کہ دی تھی۔ یہ درست ہے کہ مجھے پاکستان کے ڈولنے کا احساس تھا لیکن پاکستان کے لیے کوئی خاص لگن میں نے کبھی محسوس نہ کی تھی۔

خواجہ صاحب میری بات سن کر دفعتاً سنجیدہ ہو گئے "مفتی صاحب،" وہ بولے "پاکستان کا غم آپ کیوں کھاتے ہیں، جب کہ پاکستان کا غم کھانے کے لیے بڑی بڑی ہستیاں موجود ہیں؟ آپ کو اور مجھے غم کھانے کی کیا ضرورت ہے؟" ایک ساعت کے لیے وہ رُک گئے۔ پھر بولے "اس بڈّھے کو دیکھتے ہیں آپ؟" میں نے اُس جانب دیکھا جدھر خواجہ صاحب اشارہ کر رہے تھے۔ وہاں کوئی بڈّھا نہ تھا۔ کیا وہ اس قبر کی طرف اشارہ کر رہے تھے جس پر وہ ابھی ابھی فاتحہ پڑھ کر آئے تھے۔ خواجہ صاحب بولے "اس بڈّھے نے اپنی تمام زندگی قیامِ پاکستان کے لیے وقف کر دی تھی۔ یہ بوٹا اسی بڈّھے کا لگایا ہوا ہے۔"

"مفتی صاحب" وہ مسکرا کر کہنے لگے "پاکستان کے لیے بہت عظیم ہستیاں کام کر رہی ہیں۔ آپ کیوں غم کھاتے ہیں؟"

"تو پھر میں کیا کروں؟" میں نے ازراہِ مذاق کہا۔

"آپ صرف اتنا کریں کہ ہر کام سے پہلے سوچیں کہ کیا آپ پاکستان کے مفاد کے مطابق کام کر رہے ہیں۔ آپ کا قدم پاکستان کے مفاد کے خلاف تو نہیں۔ اس میں آپ کا اپنا فائدہ ہے۔

پاکستان تو بہر صورت پھلے پھولے گا۔ اس کی بہار دیکھ کر لوگ عش عش کریں گے۔ انشاء اللہ!"

خواجہ صاحب کی بات سن کر مجھے بے حد حیرت ہوئی۔ خواجہ صاحب نے تو کبھی ایسی بات نہ کی تھی۔ انھوں نے تو کبھی بڑ نہ ہانکی تھی۔ ان کی بات بڑی زیرک ہوتی جو عملی دنیا سے متعلق ہوتی تھی۔ وہ پیر پرستی کے حق میں نہ تھے۔ پھر وہ بڈھا کون تھا جس نے پاکستان کا بوٹا لگایا تھا؟ وہ بڑی ہستیاں کون تھیں جو پاکستان کا غم کھانے پر مامور تھیں؟ پاکستان میں کیا خصوصیت ہے کہ بڑی ہستیاں اس پر مامور ہوں؟ پاکستان ایک چھوٹا سا ملک ہے۔ اس میں ابھی تک کوئی اسلامی خصوصیت پیدا نہیں ہوئی ـــــ اور اسلامی ملک تعداد میں بیسیوں ہیں۔ سب کی حالت ناگفتہ بہ ہے ـــــ خواجہ صاحب کی بات مہمل نظر آتی تھی۔ ان کی بات کی طرف توجہ کرتا تو وہ بے معنی معلوم ہوتی۔ ان کے کردار کی طرف نظر جاتی تو از سرِ نو شش و پنج میں پڑ جاتا۔ خواجہ صاحب کی زیرکی۔ ان کی راست گوئی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

خواجہ صاحب میں ایک عجیب خصوصیت تھی۔ جب بھی وہ اللہ کا نام لیتے تو کچھ ایسے انداز میں بات کرتے جیسے اللہ ان کے پاس بیٹھا ہو، اور اللہ کا ایک خصوصی پروگرام ہو، اور وہ کُن کہ کر تخلیق کرنے والا اللہ نہ ہو بلکہ ہر لمحے محنت مشقت، اور مزدوری کرنے والا ہو، جس کے ہاتھ محنت کرتے کرتے بھدے ہو چکے ہوں اور جو ہر بات میں دوسروں کا ہاتھ بٹانے کا دلدادہ ہو۔ ان کی یہ بات مجھے کھلتی تھی۔ خواجہ صاحب نے اللہ کو مزدور بنا رکھا تھا۔

اللہ کا میں بڑا قائل تھا۔ میرے ذہن میں اللہ کی دو خصوصیات نمایاں تھیں: اس کی عظمت اور بے نیازی۔ اللہ کی عظمت کا احساس فلکیات اور جمادات کے مطالعے سے پیدا ہوا تھا۔ اور اس کی بے نیازی میرا اپنا تأثر تھا۔ میں اسے ربّ العالمین سمجھتا تھا، ربّ المسلمین نہیں۔ میرے نزدیک اللہ ایک عظیم شہنشاہ تھا جس کی ریاست سیکولر تھی۔ اسلام میرے نزدیک ایک ضابطۂ عمل تھا جو صرف بنی نوعِ انسان کے لیے باعثِ فلاح تھا جس کے لیے اللہ کو اپنے طرزِ عمل میں ردّ و بدل گوارا نہ تھا۔ میرے اللہ کو افراد سے دلچسپی نہ تھی۔ مذہب کے

نقطۂ نظر سے رعایت کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ پھر پاکستان کی امتیازی حیثیت کے کیا معنے؟
ساری بات ہی بے ہنگم تھی ـــــــ اس کے باوجود چونکہ وہ بات خواجہ صاحب نے کی تھی،
میرے دل میں گو مگو کا عالم پیدا ہو گیا۔ دل میں اک پھانس سی لگ گئی۔

پاکستان کی امتیازی حیثیت کا یہ پہلا تذکرہ تھا۔

چار سال بیت گئے۔

میرا تبادلہ ہو گیا اور مجھے ایک اعلیٰ افسر کے ساتھ منسلک کر دیا گیا۔ میرے نئے افسر
میں چند ایک خصوصیات نمایاں تھیں۔ وہ بے حد ذہین تھا۔ کم گو تھا۔ اس میں برداشت کا عنصر
اس قدر زیادہ تھا کہ دیکھنے والے کو غصہ آجاتا، اور اس میں ذات کا خیال قطعی طور پر مفقود تھا۔

صاحب نے مجھے بلایا۔ بولے "آپ کام شروع کر دیں"۔ میں نے کہا "یس سر"۔ بولے "اس صندوقچی
میں پچھلے ہفتے کے خطوط ہیں۔ ان سب خطوط کو غور سے پڑھیں، موضوع کے لحاظ سے انھیں ترتیب
دیں اور سمری بنا دیں۔ جو خط خصوصی توجہ کے قابل ہو اسے الگ کر دیں"۔ "یس سر" میں نے کہا۔
"چپڑاسی صندوقچی لے آئے گا" وہ بولے۔ "آل رائٹ سر"۔ میں کمرے سے باہر نکل آیا۔

میں نے پہلا خط کھولا۔ لکھا تھا: اے شاہ تو کتنا خوش نصیب ہے کہ تجھے پاکستان کی
بادشاہی کی عزت ملی۔

خط پڑھ کر میں سوچنے لگا: عجیب خط ہے۔ دوسرا خط کھولا تو اور بھی حیران ہوا۔ لکھا تھا:
خبردار! دیکھ پاکستان میں آٹا مہنگا نہ ہونے دیجو۔ تیسرے خط میں لکھا تھا: وہ وقت دور نہیں
جب پاکستان میں ایسا عالم ہو گا کہ مدینے کے رہنے والے دیکھ کر کہیں گے، سبحان اللہ!

ان خطوط کو دیکھ کر میں گھبرا گیا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ لکھنے والوں نے یہ خط کیوں لکھے تھے۔
ان کا مقصد کیا تھا۔ بہر طور ایک بات واضح تھی کہ توجہ حاصل کرنا مقصود نہ تھا۔ کیونکہ زیادہ تر خطوں
میں لکھنے والوں کے نام بھی مرقوم نہ تھے۔ یہ خط دعا گو، خادم یا عاجز پر ختم ہوتے تھے۔ بیشتر خطوط
کاغذ کے پرزوں پر لکھے ہوئے تھے۔ تحریر اور اندازِ بیان دونوں ہی خام تھے۔ اثر ڈالنے کا عنصر مفقود

تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ لکھنے والوں نے پیسے کیوں خرچ کیے تھے۔ وقت کیوں صرف کیا تھا۔

پھر میں نے ایک طویل خط اُٹھایا۔ یہ خط جنوبی ہند کے کسی شہر طائم سے موصول ہوا تھا۔ لکھنے والا سب جج تھا جو ۲۰ سال پیشتر ایک حادثے کی وجہ سے اپاہج ہو چکا تھا اور گزشتہ بیس برس سے صاحبِ فراش تھا۔ ان ۲۰ برس میں اس کا واحد کام عبادت تھا۔ خط میں تحریر تھا کہ میں یہ خط تمہارے لیے نہیں لکھ رہا بلکہ پاکستان کے لیے لکھ رہا ہوں۔ جلد ہی پاکستان ایک عظیم مملکت بن جائے گا۔ ایک عظیم فتح حاصل ہو گی اور پھر پاکستان دُنیائے اسلام کا ایک مرکز بن جائے گا۔

ان خطوط نے مجھے پاگل کر دیا۔ یہ کونسی دُنیا تھی؟ یہ کس قسم کے لوگ تھے؟ خط لکھنے سے ان کا مقصد کیا تھا؟ کیا یہ سب مذہبی ہسٹیریا کے مریض تھے؟ جنونی تھے؟ مجذوب تھے یا جاگتے میں خواب دیکھنے کے عادی تھے؟ لیکن ان میں کئی ایک خطوط پڑھے لکھے لوگوں کے بھی تھے۔ حیرت کی بات تھی کہ ان خطوط میں کسی فرد کا تذکرہ نہ ہوتا تھا۔ کسی فرد کی توقیر و تعظیم نہ ملتی تھی۔ یہ خط قصیدہ گوئی سے خالی تھے۔ ان خطوط میں کسی ظلِ الٰہی کو خطاب نہ کیا گیا تھا۔ ان کا موضوع پاکستان تھا۔ پاکستان کی خصوصی عظمت۔ پاکستان سے رسولؐ اللہ کا التفات۔ پاکستان پر اللہ کی برکت و رحمت۔ ان خطوط کو پڑھ کر میں پاگل ہو گیا۔ مجھ پر ایک عجیب سی وحشت سوار ہو گئی۔ یہ سب کیا ہے؟ یہ لوگ کون لوگ ہیں؟ یہ دُنیا کون سی دُنیا ہے؟ پاکستان کیا ہے؟ اسے کیا امتیاز حاصل ہے؟ کیوں حاصل ہے؟

طبیعت کے لحاظ سے میں ایک مجذوب واقع ہوا ہوں۔ عام حالات میں مجھ پر کسی واقعے کا اثر نہیں ہوتا۔ لیکن جب اثر ہو جائے تو میں شل ہو کر رہ جاتا ہوں۔ میرے اندر لاوا کھولنے لگتا ہے اور پھر گویا آتش فشاں جاگ اُٹھتا ہے۔ ان خطوط کو پڑھ کر پہلے تو میں سوچتا رہا، پھر نہ جانے کیا ہوا کہ عقل و خرد کے دونوں کنارے ٹوٹ گئے، جذبے کا دھارا بہہ نکلا اور میری میں ڈگمگانے لگی۔ دو روز میں دیوانوں کی طرح اپنے گھر میں صحرا نوردی کرتا رہا۔ پھر طوفان تھما تو میں سوچنے لگا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ صاحب سے مل کر کہوں کہ جنابِ عالی! یہ خط میرے بس کا روگ نہیں

ہیں۔ مجھے کوئی سنجیدہ کام دیجیے جسے عقل سے تعلق ہو۔

تیسرے روز میں تیار بیٹھا تھا کہ جب بھی صاحب اکیلے ہوں تو میں جاکر ان سے بات کروں۔ عین اس وقت صاحب کا چپڑاسی آگیا۔ میں نے سوچا، چلو اچھا ہوا۔ اس سے کہہ دیتا ہوں کہ صاحب اکیلے ہوں تو مجھے اطلاع کر دے۔ چپڑاسی نے آکر کہا "جی، صاحب بلاتے ہیں۔" صاحب کے کمرے میں داخل ہوتے وقت میں نے سوچا کہ صاحب اپنی بات کرلیں تو پھر میں اپنی درخواست پیش کردوں گا۔

اس وقت صاحب کچھ لکھنے میں مصروف تھے۔ انھوں نے مجھے دیکھ کر کہا "آپ گیٹ پر سیکورٹی کے کمرے میں چلے جائیں۔ وہاں ایک شخص مجھ سے ملنے کے لیے مصر ہے۔ آپ اس سے بات کریں۔ کہیں کہ میں نے آپ کو بھیجا ہے۔ اگر وہ آپ سے بات کرنے پر آمادہ ہو جائے تو اس سے بات پوچھ لیں کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ لیکن اگر وہ مجھ سے ملنے پر مصر رہے تو اسے جانے نہ دیں بلکہ مجھے اطلاع دیں ـــ میں اس سے ملوں گا۔"

"یس سر" ـــ صاحب کی بات سُن کر میں دروازے کی طرف مڑا۔ "اور دیکھیے" صاحب بولے "سیکورٹی کے کمرے میں بات نہ کریں۔ اسے باہر لے جائیں۔ علیحدگی میں۔ سمجھے؟"

"یس سر" ـــ اس وقت صاحب سے اپنی بات کرنے کا موقع نہ تھا۔ میں نے سوچا، واپسی پر بات کردوں گا۔

سیکوریٹی کے کمرے میں ایک دہقان قسم کا آدمی کھڑا تھا۔ میں اسے باہر باغیچے میں لے گیا۔ "صاحب کام میں مصروف ہیں" میں نے کہا "انھوں نے مجھے بھیجا ہے۔ اگر آپ یہ بتادیں کہ آپ انھیں کس سلسلے میں ملنا چاہتے ہیں تو ـــ"

میں ابھی جملہ ختم بھی نہ کر پایا تھا کہ وہ بولا "بابو جی، میں نے صاحب سے مل کر کیا لینا ہے۔ مجھے تو اس سے کوئی کام نہیں۔ میں اپنے گاؤں سے آرہا تھا۔ اس سڑک کے پاس مجھے ایک سانڈنی سوار ملا۔ اس نے مجھے اشارہ کیا۔ میں پاس گیا تو وہ کہنے لگا: میاں اس مکان کے اندر جاؤ۔

صاحب سے ملو اور ہمارا ایک پیغام اسے دے دو۔ سانڈنی سوار بزرگ آدمی تھا۔ میں نے اس کی بات مان لی اور ادھر آگیا۔ لیکن پولیس والے دوسرے کی بات ہی نہیں سُنتے۔ اپنی ہی کہے جاتے ہیں۔"

میں نے کہا "آپ پیغام مجھے دے دیں۔ میں صاحب تک پہنچا دوں گا۔" "سانڈنی سوار نے مجھ سے کہا تھا" وہ بولا "جا کر اس سے کہ دو کہ جو کاغذ وہ لکھ رہا ہے، وہ غلط ہے، اور جو وہ لکھ کر پھاڑ چکا ہے، وہ صحیح ہے۔"

"عجیب مہمل سا پیغام ہے!" میں نے سوچا "نہ سر نہ پاؤں۔ سانڈنی سوار کو صاحب کے نوٹ سے کیا واسطہ! اور پھر سانڈنی سوار یہاں کہاں! میں نے تو کبھی اس علاقے میں کوئی سانڈنی سوار نہیں دیکھا۔ یقیناً یہ دہقان پاگل ہے۔"

مجھے یقین تھا کہ صاحب بات سُن کر مسکرا دیں گے اور پھر کام میں مصروف ہو جائیں گے۔ لیکن ایک ساعت کے لیے وہ سوچ میں پڑ گئے۔ پھر نہایت سنجیدگی سے بولے "ذرا یہ ویسٹ پیپر باسکٹ تو اُٹھائیے۔" میں نے ٹوکری اُٹھا کر میز پر رکھ دی۔ وہ بڑی توجہ اور احتیاط سے کاغذ کے ٹکڑے ٹوکری میں سے چُننے لگے۔ یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی۔ کیا صاحب سانڈنی سوار کی بات سچ مان بیٹھے ہیں؟

صاحب نے وہ پُرزے میری جانب بڑھا دیے۔ بولے "اگر آپ کو فرصت ہو تو انھیں جوڑ دیجیے۔" "یس سر" میں نے کہا۔ صاحب نے وہ نوٹ اُٹھا لیا جو وہ لکھ رہے تھے اور اسے پھاڑ کر ٹوکری میں ڈال دیا۔ حیرت سے میرا منھ کھُلا کا کھُلا رہ گیا۔ یہ شخص جو اس قدر ذہین اور زیرک ہے کہ ہم ابھی بات کرنے کے لیے منھ کھولتے ہیں تو ہمارا عندیہ بھانپ لیتا ہے، یہ شخص جو ہر ایک کی بات سُننے کے باوجود اپنی رائے رکھتا ہے، جس کے خیالات میں انفرادیت اور ندرت ہے، جو پٹے ہوئے رسمی خیالات سے دُور رہتا ہے، جسے توہمات سے دُور کا واسطہ بھی نہیں، یہ شخص ایک مبہم سانڈنی سوار کی بات کو یوں اپنا رہا ہے جیسے ہمیشہ سے اسے ایسے سانڈنی سواروں

سے واسطہ رہا ہو۔ جیسے اس قسم کے پیغامات سے مانوس ہو۔ یہ کیا بھید ہے!

میں نے کاغذ کے پرزے جوڑے۔ وہ نوٹ پاکستان کے مجوزہ آئین کی ایک اہم شق تھی، جسے اسلام سے تعلق تھا۔

اس کے بعد صاحب سے خطوں کی بات کرنا بے معنی نظر آنے لگا اور میں از سرِ نو ان خطوں کی الف لیلہ میں کھو گیا۔ وہ خط روز موصول ہوتے تھے۔ جگہ جگہ سے موصول ہوتے تھے۔ لیکن عام طور سے ان کا موضوع ایک ہی ہوتا: پاکستان، پاکستان کا امتیاز، پاکستان کی آنے والی عظمت، درخشندہ مستقبل۔ آہستہ آہستہ میں اس طوفان میں بہہ گیا۔ میرے دل میں شکوک پیدا ہونے لگے۔ شاید یہ چوتھی سمت بھی حقیقت ہو۔ شاید اللہ میاں کسی ملک یا فرد میں خصوصی دلچسپی لینے سے گریز نہ کرتے ہوں۔ آخر وہ مالکِ ارض و سما ہیں۔ اگر وہ کوئی بات کرنا چاہیں تو انھیں کون روک سکتا ہے۔

ایک روز صاحب نے مجھے بلایا اور ایک کام دے کر اپنے ہی کمرے میں بٹھا لیا تاکہ وہیں بیٹھ کر ختم کر دوں۔ میں ایک کونے میں بیٹھ کر کام کر رہا تھا کہ چپڑاسی آیا۔ صاحب سے کہنے لگا "سر، میرا ایک چچا اب کی بار حج کرنے گیا تھا۔ وہ مدینہ شریف سے آپ کے لیے ایک پیغام لایا ہے۔ حکم ہو تو اسے بلا لوں۔"

صاحب نے بڑی سنجیدگی سے چپڑاسی کی بات سنی۔ بولے "بلا لو"۔ انھوں نے اپنا کام ایک طرف رکھ دیا۔ اٹھ کر بڈھے سے مصافحہ کیا اور بڑے عزو احترام سے اس کی بات سننے لگے۔

تمہید کے بعد بڈھے نے کہا "جناب، وہ جہلم کے رہنے والے ہیں۔ فوج میں سپاہی تھے۔ بڑی جنگ میں لام پر گئے تھے۔ وہاں سے مدینہ شریف میں سلام کے لیے حاضر ہوئے۔ بس، وہیں بیٹھ گئے۔ آج تک وہیں بیٹھے ہیں۔ اب وہ روضۂ مبارک کے چابی بردار ہیں۔ یہ بہت بڑا عہدہ ہے، جناب۔ انھوں نے آپ کو پیغام بھیجا ہے۔"

صاحب نے سر اثبات میں ہلا دیا۔

بڈھے نے بات شروع کی" انھوں نے فرمایا کہ سن ۴۶ء میں ہم نے خواب دیکھا۔ دیکھا کہ مسجد نبوی سے ایک بیل پھوٹی اور بڑھتے بڑھتے دُور نکل گئی، اور اس کے پرلے سرے پر سبز پتّیاں نکل آئیں "۔

صاحب نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"چار ایک سال کے بعد خواب میں پھر اسی بیل کو دیکھا۔ شاخ جوں کی توں قائم تھی لیکن پتّیاں مُرجھا گئی تھیں۔ اب پھر خواب میں ہم نے وہی بیل دیکھی ہے۔ وہ پھر سے سرسبز ہو رہی ہے۔ پھر سے کونپلیں نکل رہی ہیں۔ انھوں نے فرمایا تھا کہ ہماری طرف سے جا کر مبارک باد دینا، اور ہمارا پیغام دینا۔ کہنا، بھیڑوں کے رکھوالے خود سائے میں نہیں بیٹھتے "۔

جب تک وہ بڈھا بات کرتا رہا، کوشش کے باوجود میں اپنے کام کی طرف متوجہ نہ ہو سکا۔ جب اس نے کہا کہ ہماری طرف سے مبارک باد دینا تو میں نے محسوس کیا جیسے مجھے مبارک باد دی جا رہی ہو۔ اس روز مجھے پاکستان کا ہر بوٹا مزید ہرا بھرا نظر آنے لگا اور ہر سُوکھی شاخ سے نئی کونپلیں پھوٹتی نظر آنے لگیں۔ لاکھ لاحول پڑھتا۔ اپنے آپ کو قائم کرنے کی کوشش کرتا، لیکن بے سود۔ الف لیلہ کی اس دُنیا میں ایک عجب کیفیت تھی۔ عجب نشہ تھا۔ میری عقل مجھے ملامت کرتی، لیکن مجھے اس نشے کی لت پڑ رہی تھی ـــــــ پھر اللہ میاں میرے روبرو ایک سٹول پر آ بیٹھے۔ ان کے ہاتھوں میں اوزار تھے۔ وہ کام میں منہمک تھے۔ محنت کے پسینے سے شرابور تھے۔ وہ تعمیر میں منہمک تھے۔ پاکستان کی تعمیر۔ یہ میرے اللہ میاں تو نہ تھے۔ یہ تو خواجہ صاحب کے اللہ میاں تھے۔ میرے اللہ میاں جو دُور بہت دُور، اُوپر بہت اُوپر تخت پر بیٹھ کر کُن کہا کرتے تھے۔ جو عظیم تھے، بے نیاز تھے۔ دُور تھے، اُونچے تھے وہ اللہ میاں پتا نہیں کہاں چلے گئے تھے۔

اس کے بعد ایک ایسا واقعہ ہُوا جسے دیکھ کر میرا بند بند لرز گیا۔ خوف سے میری گھگھی بندھ گئی۔ صاحب کے ایک دوست نے فون کر کے انھیں بُلایا۔ کہنے لگے کہ ہمارے ہاں ایک درویش آئے ہوئے ہیں۔ پہلے یہ حیدر آباد میں آئی جی پولیس تھے، پھر بُلاوا آ گیا۔ سب کچھ چھوڑ کر الگ ہو گئے۔

بڑے دلچسپ آدمی ہیں۔ آپ سے ملنے کی خواہش رکھتے ہیں۔

صاحب درویش سے ملنے جانے لگے تو مجھے بھی ساتھ لے گئے۔ اس درویش کی شکل بڑی ڈراؤنی تھی۔ سیاہ رنگ، ہڈیوں کا ڈھانچا، خوفناک آنکھیں، کرخت آواز۔ صاحب کا تعارف کرانے کے بعد صاحب خانہ کسی کام سے باہر چلے گئے اور صاحب اور وہ درویش جو مجھے سرخ موٹی مرچ دکھائی دے رہا تھا اکیلے رہ گئے۔ میں ملحقہ کمرے میں بیٹھا انتظار کر رہا تھا۔ اخبار پڑھ رہا تھا۔

دفعتہً اخبار میرے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا۔ ملحقہ کمرے میں مرچ انگریزی بول رہا تھا۔ کہہ رہا تھا "فلے یُو الائیو۔ پُٹ برین آن یُو اینڈ پلیس یُو اِن دی سَن۔" ارے! یہ کیا صاحب سے کہہ رہا ہے؟ یہ درویش ہے یا قصائی؟۔

"میں یہاں صرف اس مقصد کے لیے آیا ہوں" اس کی کرخت آواز پھر گونجی "کہ تمھیں وارننگ دوں۔ تمھیں پتا ہے کہ اس سلسلے میں وارننگ نہیں دی جاتی۔ جو کوتاہی کرے، اسے ہٹا دیا جاتا ہے۔ رد کر دیا جاتا ہے۔ لیکن پاکستان کو خصوصی رعایت حاصل ہے۔ اس لیے وارننگ دی جا رہی ہے۔ اگر اب بھی کوتاہی ہوئی تو کھال ادھیڑ دی جائے گی، اور نمک لگا کر دھوپ میں رکھ دیا جائے گا۔"

یہ سُن کر خوف سے میرا خون جم گیا اور میں دیوانہ وار باہر نکل گیا۔ تین گھنٹے صاحب اور مرچ اس کمرے میں بند رہے۔

جب صاحب باہر نکلے تو ان کا منہ زرد تھا، جیسے تمام خون چوس لیا گیا ہو۔ وہ بمشکل چل رہے تھے۔ ایسے محسوس ہوتا تھا جیسے ان کی ہڈی ہڈی ٹوٹ گئی ہو۔

دو سال بعد ایسی ہی نوعیت کا ایک اور واقعہ ہوا۔ صاحب اور میں دورے پر کراچی گئے ہوئے تھے۔ ایک شام ہم سنٹرل جیل گئے۔ صاحب کو وہاں کچھ کام تھا۔ ابھی وہ کام سے فارغ ہوئے تھے کہ جیل کے ایک گارڈ نے آکر سلوٹ مارا۔ بولا "حضور، ایک قیدی آپ کا نام لے لے کر پکار رہا ہے۔ کہتا ہے اُسے بُلا دو۔"

ہم اس گارڈ کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔ ایک چھوٹے سلاخ دار کمرے میں ایک ہیجڑا بند

تھا۔ صاحب نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا۔ "تالا کھولو" صاحب بولے۔ تالا کھلا تو وہ اندر داخل ہو گئے اور گارڈ سے بولے "تم جاؤ۔" گارڈ چلا گیا۔ میں اوٹ میں کھڑا رہا

اسیر بڑے نے صاحب کو دیکھتے ہی چلا کر غصے سے کہا "تجھے خبردار کرنے کے لیے ہمیں قید ہونا پڑتا ہے۔"

یہ سنتے ہی مجھ پر خوف طاری ہو گیا اور میں وہاں سے بھاگا۔ ایک گھنٹے کے بعد جب صاحب وہاں سے نکلے تو انکی وہی حالت تھی جیسے مرج سے ملاقات کرنے کے بعد ہوئی تھی

یا اللہ! یہ کیا اسرار ہے۔ میرے ذہن میں پھر سے ایک کھلبلی سی مچ گئی۔ اگلے روز میں اکیلا جیل پہنچا۔ لیکن وہ قیدی وہاں نہیں تھا۔ میں نے اِدھر اُدھر سے اس کے کوائف پوچھے۔ پتا چلا کہ وہ باقاعدہ قیدی نہ تھا۔ جیل کے قریبی بازار میں دنگا کر رہا تھا کہ جیل کے ایک گارڈ نے لاکر کمرے میں بند کر دیا۔ صاحب کے جانے کے بعد اس کے کمرے کو مقفل کر دیا گیا تھا۔ کسی گارڈ کو علم نہ تھا کہ کس نے اسے رہا کیا ہے۔

ان واقعات نے مجھے پاگل کر دیا۔ پاکستان کی امتیازی حیثیت کا بھید اور بھی پُراسرار ہو گیا۔ لیکن اَن جانے میں مجھے پاکستان کی امتیازی حیثیت کا یقین ہو گیا۔ اور اللہ میاں اپنے مشقت زدہ ہاتھوں سے پاکستان میں جگہ جگہ اینٹیں رکھتے ہوئے نظر آنے لگے۔

پھر میرا تبادلہ ہو گیا اور میری خدمات ایک اور محکمے کو پیش کر دی گئیں۔ اس پر میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ گاہے گاہے بیٹھے بٹھائے مجھے وہ دور یاد آجاتا۔ میرے جسم پر چیونٹے سے رینگتے اور ایک عجیب کیفیت مجھے اپنی آغوش میں لے لیتی۔ سانپ گزر چکا تھا لیکن لکیر باقی تھی۔ اور وہ لکیر روز بروز روشن تر ہوتی جا رہی تھی۔ اس لکیر نے گویا زبردستی میرا زاویہ نگاہ بدل کر رکھ دیا تھا۔ اس کے باوجود ذہنی طور پر میں کچھ بھی نہ سمجھ پایا تھا۔ میری کیفیت یہ تھی کہ نہ گھر کا نہ گھاٹ کا۔ پاکستان کے لیے میرے دل میں خوامخواہ عقیدت پیدا ہو چکی تھی۔ میں پاکستانی ہونے پر فخر محسوس کرنے لگا تھا، اور پاکستان کے مستقبل کی طرف نگاہیں اٹھائے انتظار کر رہا تھا۔ کس کا انتظار؟

یہ مجھے علم نہیں۔

ایک روز جب میں اسلام آباد کے گرد و نواح میں گھوم رہا تھا، ایک ٹیکسی میرے قریب آکر رُک گئی۔ میرے ایک پُرانے دوست احمد نے ٹیکسی سے سر نکالا۔ اسے دیکھ کر میں چلایا "ارے! تم تو یورپ گئے ہُوئے تھے۔" "میں اسی ہفتے واپس آیا ہوں" احمد بولا "یہاں کیسے گھوم رہے ہو؟" میں نے پُوچھا۔ "بری شاہ لطیف جا رہا ہوں" وہ بولا۔ احمد کی زبان سے شاہ لطیفؒ کا نام سُن کر مجھے حیرت ہُوئی کیونکہ احمد تہذیبِ جدید کی پیداوار تھا۔ "تم وہاں جا کر کیا کرو گے؟" میں نے پوچھا۔ "آؤ یار" وہ بولا "میرے ساتھ چلو۔ ابھی واپس آجائیں گے۔"

جب ہم مزار پہ پہنچے تو فاتحہ خوانی کے بعد احمد بولا "یار، بڑی حیرت کی بات ہے۔ کیا یہ لوگ اس قدر صاحبِ نظر ہوتے ہیں؟ ڈاکٹریٹ کے سلسلے میں مَیں یورپ کی متعدد لائبریریوں میں گیا۔ وہاں ایک نسخہ ملا جس میں درج تھا کہ شاہ لطیفؒ نے نہ جانے کتنے سو سال پہلے فرمایا تھا کہ ہمارے نزدیک ایک اسلامی شہر آباد ہوگا جو دُنیائے اسلام کا مرکز بنے گا، اور یہ نسخہ دو ڈھائی سو سال پُرانا تھا۔ دیکھ لو، اسلام آباد نور پور سے آدھ میل کے فاصلے پہ ہے۔ صرف آدھ میل۔ حد ہوگئی۔"

جب ہم نور پور سے واپس آرہے تھے تو ٹیکسی رُک گئی۔ "کیوں بھائی، رُک کیوں گئے؟" احمد نے پُوچھا۔ ڈرائیور بولا "جناب، نور پور کی سڑک یہاں سے توڑ دی گئی ہے۔" ہم نے باہر دیکھا۔ سڑک ٹوٹی ہوئی تھی۔ دس پندرہ گز کا ٹکڑا کچا تھا۔ احمد نے قہقہہ لگایا۔ بولا "دیکھ لو مفتی، اسلام آباد نے سب سے پہلا کام یہ کیا ہے کہ بری شاہ لطیفؒ کو جانے والی سڑک کاٹ دی ہے۔ اور یہ شہر دُنیائے اسلام کا مرکز بننے والا ہے۔" اس نے ایک اور قہقہہ لگایا۔

"نور پور کے تانگے کو اسلام آباد میں داخل ہونے کی اجازت نہیں" ڈرائیور نے کہا۔

"سُنتے ہو؟" احمد پھر ہنسنے لگا۔

پھر جنگ چھڑ گئی۔ بھارت نے پاکستان پہ حملہ کر دیا۔ عجیب و غریب نوعیت کی خبریں آنے لگیں۔ یہ خبریں مافوق الفطرت عنصر سے بھری ہوئی تھیں۔ قدم قدم پہ معجزات کے

تذکرے تھے۔ اخباروں کے کالم ایسے بیانات سے بھرے ہوئے تھے۔ لوگ ان خبروں کو سُنتے اور سر دھنتے تھے۔

متعدد لوگوں نے خواب میں دیکھا کہ حضور سرورِ دو عالمؐ عجلت میں گھوڑے پر سوار ہو کر پاکستان تشریف لا رہے ہیں۔ جنگِ بدر کے شُہدا محاذوں پر پہنچ چکے ہیں۔ حضرت علیؓ، امام حسنؓ اور امام حسینؓ سفید ملبوسات پہنے سیالکوٹ کے قریب وجوار میں محاذ کی طرف جاتے ہوئے دیکھے گئے ہیں۔ ایک محاذ کے بھارتی قیدی کا بیان تھا کہ سفید پیراہن والی پاکستانی فوج بھارتیوں کو تحس نحس کر رہی تھی۔ ان کی تلواروں سے شعلے نکل رہے تھے۔ دُوسرے محاذ کے قیدی کا بیان تھا کہ سُرخ ٹوپیوں اور چھوٹے قد والے پاکستانی فوجیوں نے بھارتی سینا کا ناطقہ بند کر رکھا تھا۔ بھارتی توپچی نے کہا کہ گولے پھینکنا بے کار ہے۔ ایک سفید ریش بڈھا میرے گولے کیچ کر کے پرے پھینک دیتا ہے۔ بھارتی ہوا بازوں کا بیان تھا کہ جب وہ گولے پھینکتے تھے تو سفید ریش بڈھے انھیں ہاتھوں میں پکڑ کر زمین پر یوں رکھ دیتے کہ وہ پھٹتے نہ تھے۔

سارا پاکستان ان معجزاتی تذکروں سے گونج رہا تھا۔ ایک دانشور نے تحقیر بھرا قہقہہ لگایا یار، یہ پاکستانی عوام معجزے گھڑنے میں کمال رکھتے ہیں۔ آج کل ایسا ایسا معجزہ ایجاد ہو رہا ہے جس کا جواب نہیں۔"

"لیکن ــــــ" دوسرا بولا "یار اگر ان معجزوں سے ہٹ کر حقائق کی روشنی میں بات سمجھنے کی کوشش کی جائے تو بات بنتی نہیں۔"

"کیا مطلب؟" تیسرے نے کہا۔

"مطلب یہ کہ اگر حقائق کی روشنی میں دیکھا جائے تو ــــــ ہمیں جنگ ہار جانی چاہیے تھی اور بھارت کو پاکستان پر قابض ہو جانا چاہیے تھا۔"

"ہاں" ایک اور دانشور بولے "بھارتی حملے کا پلان فوجی اصولوں کے لحاظ سے عین پریکٹیکل تھا۔ اس میں کوئی سقم نہ تھا۔"

"لیکن یہ مافوق الفطرت داستانیں چھوڑو، یار" ایک نے کہا "خالص جدّت طرازی"۔ وہ قہقہہ مار کر ہنسا۔

"لیکن یار" ایک رپورٹر بولا "وہ ایک باتیں میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھی ہیں"۔

"وہ ایک باتیں ہر کسی نے اپنی آنکھ سے دیکھی ہیں" پہلے دانشور نے تضحیک بھرا قہقہہ لگایا۔ میں ان کی باتیں غور سے سُن رہا تھا لیکن مجھے کچھ کہنے کی ہمت نہ ہوئی۔ ایسے محسوس ہو رہا تھا کہ ان سب کے دلوں میں بار بار ایک ہی خیال اُبھرتا ہے۔ اور وہ اسے بھولنے کے لیے دلیلوں، قہقہوں کا سہارا لے رہے ہیں۔

جنگ نے پاکستان کے معمّے کو از سرِ نو میرے سامنے لاکر کھڑا کر دیا۔ لیکن اب مجھ میں مُدافعت کی طاقت نہ رہی تھی۔ اب مجھ میں اس بات کو شدّت سے رد کرنے کی ہمت نہ رہی تھی جسے میں اپنی عقل و خرد کے مطابق سمجھ نہیں سکتا تھا۔ جنگ کے دوران ان محیرّ العقل باتوں نے پاکستان کی امتیازی حیثیت پر مہر لگا دی تھی۔ اب میراللہ سٹول پر بیٹھ کر اینٹیں نہیں رکھ رہا تھا۔ وہ سفید گھوڑے پر سوار تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک لمبی زنگ آلود تلوار تھی۔ وہ پاکستان کے محاذوں پر گشت کر رہا تھا، اور اس کا چہرہ خراشوں سے بھرا ہوا تھا۔

جنگ کے دوران میرا ایک ہم کار مجھ سے ملنے آیا۔ ملاقات کے بعد میں نے پوچھا "کیا گھر جاؤ گے؟" بولا "نہیں۔ قاضی صاحب سے مل کر گھر جاؤں گا"۔ میں نے پوچھا "وہ کون ہیں؟" بولا "وہ ایک عابد آدمی ہیں۔ بہت اچھے لوگ ہیں"۔ میں نے کہا "مجھے بھی ساتھ لے چلو"۔

قاضی صاحب کے کمرے میں جا بجا مکہ مدینہ کی تصاویر آویزاں تھیں۔ جائے نماز پر تسبیحیں رکھی ہوئی تھیں۔ وہ بڑے اخلاق سے ملے اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ پھر مجھ سے بولے "آپ بھی کوئی بات کریں"۔

میں نے کہا "جی، پاکستان کے لیے دُعا فرمائیں"۔

دفعتاً وہ سنجیدہ ہو گئے۔ بولے "میں بہت چھوٹا آدمی ہوں، بہت ہی چھوٹا آدمی ہوں۔

میری کیا حیثیت ہے کہ میں پاکستان کے لیے دعا کروں۔ نہیں جناب، میں اتنی حیثیت کا مالک نہیں۔"

میں نے کہا "جناب قاضی صاحب، دُعا تو ہر کوئی کر سکتا ہے۔"

وہ بولے "ٹھیک ہے، لیکن پاکستان کی اور بات ہے۔ آپ کو پتا نہیں، مجھے بھی تھوڑی سی خبر ہے، بہت تھوڑی۔ میں چھوٹا آدمی ہوں، بہت چھوٹا۔ پاکستان پر بڑوں کا ہاتھ ہے۔ وہ پاکستان کے محافظ ہیں۔ اس کے نگہبان ہیں۔ آپ پاکستان کی فکر نہ کریں۔"

قاضی صاحب کی بات نے سوئی ہوئی بھڑوں کے چھتے کو پھر سے چھیڑ دیا۔

یا اللہ یہ بڑے کون ہیں؟ کیا وہی ہیں جو جہاد میں شامل ہونے کے لیے عجلت سے گھوڑے پر سوار ہو رہے تھے۔ کیا وہی ہیں جو سیالکوٹ کے گرد و نواح میں سفید پیراہن پہنے دیکھے گئے تھے؟

کیا یہ وہی تھے جو بھارتی توپچیوں کے گولے کیچ کرتے تھے؟ ہوائی جہازوں سے گرائے ہوئے بموں کو اُٹھا اُٹھا کر دُور پھینکتے تھے؟ کیا انہی بڑوں میں سے کسی نے بھارتی پائلٹ کی نظر بندی کر دی تھی اور اسے دریائے راوی پر چھ پُل نظر آنے لگے تھے؟ کیا انھوں ہی نے بھارتی پائلٹ کو حکم دیا تھا "بیل آؤٹ، بیل آؤٹ" اور وہ پاکستانی مزاحمت کے بغیر بڑوں کی آوازیں سن کر گھبرا کر بیل آؤٹ کر گیا تھا؟

کیا پاکستان کے لیڈروں کو اس بات کا شعور تھا کہ بڑے قدم قدم پر پاکستان کی امداد کر رہے ہیں؟ کیا انھوں نے کبھی یہ سوچا ہے کہ پاکستان کی مثالی ترقی میں ہماری جدّ و جہد کو ان نتائج سے کچھ مناسبت نہیں جو بظاہر ہماری کوششیں پیدا کر رہی ہیں؟ کیا انھیں اس حقیقت کا شعور ہے کہ بین الاقوامی سطح پر جو اہمیت پاکستان کو حاصل ہے وہ کس کی مرہونِ منت ہے؟ کیا پاکستان کے سربراہوں کو کبھی شک پڑا ہے کہ پاکستان کو امتیازی حیثیت حاصل ہے؟ اور کیا انھوں نے اس بات کی عملی کوشش کی ہے کہ پاکستان کی کشتی کو کھے کر اس امتیازی حیثیت کی طرف لے جائیں؟ کیا انھوں نے ان بڑوں سے رابطہ پیدا کرنے کی خواہش محسوس کی ہے جو پاکستان کی فلاح و بہبود اور

اس کے تحفّظ کے لیے پیہم مصروفِ عمل ہیں ؟

"ہاں ــــــــ" قاضی صاحب کی بات نے سوئی ہوئی بھڑوں کے چھتّے کو پھر سے چھیڑ دیا تھا۔

جنگ ختم ہوگئی لیکن بھڑوں کا چھتّا ابھی تک بھن بھن کر رہا ہے۔

قبرستان کے قریب ایک ننگ دھڑنگ مست اپنے آپ سے کہ رہا تھا "ابھی کیا ہے۔ ابھی تو خون کی ندیاں بہیں گی۔ بہُت مریں گے، بہُت۔ لاشیں ہی لاشیں۔ پھر بڑی فتح ہوگی۔ پھر بڑی فتح ہوگی۔ اور پھر سبحان اللہ! سبحان اللہ!" وہ جوش میں تالیاں بجا رہا تھا، جیسے مجھے چڑا رہا ہو۔

خواجہ صاحب کو مزار پہ فاتحہ پڑھتے ہوئے دیکھ کر میں رُک گیا۔

"کیا حال ہے، مفتی صاحب؟" وہ بولے۔

"فکر میں گھل رہا ہوں، خواجہ صاحب" میں نے کہا۔

"کس کے فکر میں گھلنے لگے؟" انھوں نے پوچھا۔

"پاکستان کا فکر لگا ہے" میں نے کہا۔

وہ سنجیدہ ہو گئے۔ ان کے چہرے پر غصّے کے اثرات تھے۔ بولے "مفتی جی، اللہ کا کام اللہ پر چھوڑ دو۔ اللہ کا کام اپنے ذمّے نہ لو۔ پاکستان کا فکر کرنے والے آپ کون ہیں، جی؟ آپ اپنی سوچیے۔ اپنی فکر کیجیے۔ واہ مفتی جی! اتنی سی بات آج تک نہیں سمجھ سکے؟"

چلتے چلتے میں نے جو سر اُٹھا کر دیکھا تو راستہ نامانوس نظر آیا۔ میں نے اسے اہمیت نہ دی اور چلتا رہا لیکن جوں جوں آگے بڑھتا گیا توں توں یہ احساس بڑھتا گیا کہ میں غلطی سے کسی اَن جانی سڑک پر نکل آیا ہوں۔ میں نے سوچا کوئی راہگیر ملے تو اس سے پوچھوں کہ یہ کون سا علاقہ ہے۔ کچھ دُور سڑک سے ہٹ کر

ایک بہت بڑا برڑ کا درخت تھا جس کے قریب ہی گھاس پھوس کا ایک جھونپڑا تھا۔ جھونپڑے کے باہر ایک شخص کھڑا تھا۔ میں نے سوچا اس شخص سے پوچھ لوں۔ جھونپڑے کے برابر پہنچا تو سیٹی سی بجنے کی آواز آئی اور سکوٹر کے پچھلے پہیے کی ہوا نکل گئی میں نے سکوٹر روک لیا۔ کیا مصیبت ہے، میں نے سوچا اب فالتو پہیہ فِٹ کرنا پڑے گا۔ سٹفنی کو دیکھا تو اس میں بھی ہوا نہیں تھی۔ اب کیا ہو گا، میں گھبرا گیا۔

میں نے سر اُٹھایا تو روبرو ہی وہ شخص کھڑا تھا جسے میں نے جھونپڑے کے سامنے دیکھا تھا۔

"کیا ہوا؟" اس نے پوچھا۔

"پنکچر ہو گیا ہے۔"

"اسے اُدھر کھڑا کر دے نا" وہ بولا۔

"یہ سڑک کدھر کو جاتی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"کہیں بھی نہیں جاتی" وہ بولا "ادھر پہاڑی کے نیچے جا کر ختم ہو جاتی ہے۔"

"آس پاس کوئی گاؤں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں" وہ بولا "اُدھر ایک رکھ ہے۔ وہاں سے کبھی کبھی ٹرک آتا ہے۔ تو یہاں دھوپ میں کیوں کھڑا ہے، جھونپڑے میں جا کر بیٹھ" اس نے کہا "میں سکوٹر کا دھیان رکھوں گا۔" جھونپڑے میں چٹائی بچھی ہوئی تھی۔ ایک کونے میں چادر سی لپٹی پڑی تھی۔ دوسرے کونے میں پانی کا گھڑا تھا، ساتھ ہی ٹین کا ڈبہ پڑا تھا۔ میں نے پانی پیا اور پھر دروازے کے سامنے بیٹھ گیا۔

چادر میں حرکت ہوئی اور ایک دُبلا پتلا سفید ریش چہرہ نکل آیا۔

اُٹھتے ہی بولا "تو آ گیا۔"

"جی" میں نے جواب دیا "میں راستہ بھول کر ادھر آ نکلا ہوں۔"

"ہاں" بڈھا بڑبڑایا "جب چاہتے ہیں راستہ دے دیتے ہیں، جب چاہتے ہیں راستہ بند کر دیتے ہیں۔"

میں نے کہا "جی میرے سکوٹر کی ہوا نکل گئی ہے۔ پنکچر ہو گیا ہے۔"

ملں" وہ بولا "ہم خود میں ہوا بھرتے رہتے ہیں۔ ان کا کرم ہو جائے تو ہوا نکل جاتی ہے۔"

پہلے تو میں اس کی باتوں پر ٹھٹھکا پھر سوچا کوئی مجذوب ہے جو اناپ شناپ بول رہا ہے۔

کچھ دیر کے لیے وہ چپ رہا پھر مدھم آواز میں بولا "تو جو نئے بُت بنا رہا ہے کیا تجھے قلم اس لیے دیا تھا کہ بُت بنائے؟"

قلم کی بات سُن کر میں چونکا۔ اسے کیسے پتا چلا کہ میں لکھتا ہوں لیکن بُت، بُت تو قلم سے نہیں بنائے جاتے۔

دفعتہً وہ بڈھا جوش میں آ گیا۔ کہنے لگا "کیا حیثیت ہے پاکستان کی۔ ایک چھوٹا چھٹنکی سا ملک۔ غریب ملک۔ نہ تین میں نہ تیرہ میں۔" وہ کچھ دیر کے لیے چُپ ہو گیا۔ پھر آپ ہی چھڑ گیا "اور یہاں کے لوگ۔ چاروں طرف سے میں میں کی آوازیں آتی ہیں مگر سے میں میں کر رہے ہیں ـــ کھائے جا رہے ہیں، کھائے جا رہے ہیں۔ اللہ کی اس دی ہوئی دیگ کو کھائے جا رہے ہیں۔ ساتھ اپنا اپنا کٹورہ بھرے جا رہے ہیں، اپنی اپنی کوٹھالی میں دانے ڈالتے جا رہے ہیں۔ ضرورت نہیں۔ طمع خالص طمع۔ دُوسرے چاہے بھوک سے مریں۔ پڑے مریں۔ میری کوٹھالی بھر جائے۔ کوئی ملک کا نہیں سوچتا۔ کوئی قوم کا نہیں سوچتا۔ کوئی دین کا نہیں سوچتا۔ آخرت کا نہیں سوچتا۔ بس آپا دھاپی پڑی ہے۔ بادشاہ بھی میں میں کر رہا ہے۔ فقیر بھی میں میں کر رہا ہے۔ بلّیاں چھچھڑوں کی رکھوالی پر بیٹھی ہیں۔ اس ملک کو تم بُت بنا رہے ہو۔ خوشخبریاں دے رہے ہو۔ یہ ملک تو اس لائق ہے کہ غرق کر دیا جائے۔ سمجھے؟" اس نے مجھے ڈانٹا۔ غصے بھری نگاہ مجھ پر ڈالی "بول کیا کہتا ہے؟ کیا تجھے اس لیے قلم دیا تھا کہ اس ملک کے قصیدے لکھے؟ بول!" وہ چلّایا۔

میں سر نوائے بیٹھا رہا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہوں۔ دیر تک وہ خاموش بیٹھا رہا۔ پھر بولا:

"حرص ہی حرص۔ طمع ہی طمع۔ اتنے حریص ہو گئے ہیں کہ اپنی غرض کے لیے اللہ کا نام بیچنے لگے ہیں۔ اسلام کو بیچنے لگے ہیں۔ اسلام کو داؤ پر لگا رہے ہیں۔ اللہ سے مخول کر رہے ہیں جھوٹے فریبی۔ جب بڑوں کا یہ حال ہے تو چھوٹوں کا کیا ہو گا۔ اور تو کہتا پھرتا ہے اس ملک پر اللہ کی رحمت ہے جہاں

اللہ کا نام ٹکے ٹکے بک رہا ہو۔ اتنی ناقدری توبہ ہے! توبہ ہے! اللہ کی ناقدری۔ دین کی ناقدری۔ وہاں رحمت ہو گی کیا؟ بول"۔ پھر وہ غصّے میں چلّانے لگا "تجھے یہاں اس لیے نہیں بلایا ہے کہ منہ میں گھنگھنیاں ڈال کر بیٹھا رہے۔"

"مجھے بلایا ہے؟" میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"اور کیا تو خود آیا ہے یہاں؟" وہ بولا "ہمیں یہاں تیرا انتظار کرنا پڑا۔ ہمیں پتا تھا کہ تو آئے گا اور تو آگیا۔"

"لیکن میرا کیا قصور ہے بابا؟" میں غصّے میں آگیا۔

"ہاں تیرا قصور ہے" وہ بولا "جن باتوں کو تو نہیں سمجھتا، نہیں جانتا، ان کے بارے میں کیوں بات کرتا ہے؟ کیوں اللہ کی خلقت کو گمراہ کرتا ہے؟"

"میں نے کب دعویٰ کیا ہے کہ میں سمجھتا ہوں، جانتا ہوں۔ میری تو کوئی حیثیت نہیں بابا" میں نے جواب دیا۔

"جو تو بے حیثیتہ ہے تو بے حیثیتہ بن کے رہ۔ بُہتی باتاں نہ بگھار۔ شیخیاں نہ مار۔ پر تو بھی ان جیسا ہے وہ اپنی بات بنانے کے لیے، اپنی حیثیت قائم رکھنے کے لیے اسلام کا نام برت رہے ہیں تو اپنی حیثیت بنانے کے لیے پاکستان کی وڈیائی کی باتیں کر رہا ہے۔"

"غلط ہے، بالکل غلط" غصّے سے میری کنپٹیاں بجنے لگیں "میں تو صرف وہ باتیں لکھ دیتا ہوں جو تمھارے جیسے باباؤں کی زبانی سنتا ہوں۔ میں نے کبھی اپنی طرف سے بات نہیں کی۔ میں نے کبھی بڑھا چڑھا کر بات نہیں کی۔ میں نے کبھی دعویٰ نہیں کیا کہ میں جانتا ہوں۔ تو بتا کیا لائل پور کے اس بابے نے مسجد میں جمعہ کی نماز کے بعد دو اڑھائی سو لوگوں کے سامنے نہیں کہا تھا کہ ایک دن آنے والا ہے جب یو این ہر قدم اٹھانے سے پہلے پاکستان سے پوچھے گی، کیا یہ قدم اٹھانے کی اجازت ہے اور انھوں نے کہا تھا اگر ایسا نہ ہوا تو تم آ کر میری قبر پر تھوکنا ــــ بتا کیا اس بابے نے جھوٹ بولا تھا؟ بول بابا۔ چپ کیوں ہو گیا؟" وہ دیر تک سر جھکائے بیٹھا رہا۔ پھر سر اٹھا کر کہنے لگا "نہیں، وہ بابا جھوٹ نہیں بولتا۔"

"کیا نورپور کے بابے نے اڑھائی سو سال پہلے نہیں کہا تھا کہ یہاں ایک اسلامی شہر آباد ہوگا جو عالمِ اسلام کا مرکز بنے گا؟"

"کہا تھا" اس نے کچھ توقف کے بعد کہا۔

"کیا وہ صدیوں سے بابے یہ کہتے نہیں آ رہے کہ ایک دن آنے والا ہے جب ہند میں اسلام کا ڈنکا بجے گا؟"

وہ خاموش بیٹھا رہا۔

"کیا مریڑ کے بابا نے جس کے حضور مجھے بھیجا گیا تھا، قیامِ پاکستان کے وقت شاہِ دکن کو دعوت نہیں دی تھی کہ آ تجھے شہنشاہِ ہند بنا دیں۔ کیا دکن کے سی این سی پنڈی میں آ کر بابا سے نہیں ملے تھے؟ بابا نے نشاۃ ثانیہ کی خبر نہ سنائی تھی۔ پاکستان کی مرکزی حیثیت کی بات نہیں کی تھی؟ بتا" میں غرایا۔

"تو نہیں سمجھتا" وہ بولا "بزرگوں کی باتیں برحق ہیں۔ لیکن تجھ میں سمجھ کی کمی ہے۔ تو ان کی بات کے رخ کو نہیں سمجھتا اور انھیں اس طرح بیان کرتا ہے کہ لوگوں کے دلوں میں غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اللہ تجھے سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ دیکھ" وہ توقف سے بولا "پاکستان کی کوئی حیثیت نہیں، کچھ حیثیت نہیں۔ ایک چھوٹا سا عام سا غریب ملک۔ ساری اہمیت اللہ کے دین کی ہے۔ وہ دن آنے والا ہے جب اللہ کے دین سے دنیا منور ہوگی۔ اور اللہ کا بھیجا ہوا وہ بندہ جس کے وجود سے دنیا منور ہوگی پاکستان میں آئے گا۔ ان کا قیام پاکستان میں ہوگا۔ انشاءاللہ پاکستان کی عظمت ان کے قیام سے وابستہ ہے۔ بذاتِ خود نہیں۔" وہ خاموش ہو گیا۔

پھر تڑپ کر بولا "دیکھ ضروری نہیں کہ وہ صاحب پاکستانی نژاد ہوں۔ کیا پتا کہ وہ یورپ کے ہوں یا افریقہ کے ہوں یا کہیں کے ہوں۔ البتہ ان کا قیام پاکستان میں ہوگا۔ اور یہ پاکستان کی بہت بڑی خوش قسمتی ہے، وڈیائی ہے۔ دیکھ" وہ بولا "کوئی بابا حتمی بات نہیں کر سکتا۔ کسی کو جائز نہیں کہ وہ حتمی بات کرے۔ وہ قادرِ مطلق ہے جو چاہے کرے۔ آخری فیصلہ اس کے ہاتھ میں ہے۔"

وہ خاموش ہو گیا۔ پھر کچھ دیر کے بعد بولا "آئندہ سے بڑوں کی باتوں پر قلم نہیں اٹھانا۔ سمجھا؟"

اس نے مجھے ڈانٹا۔ پھر وقفے کے بعد دھیمی آواز میں بولا "ہم تمھیں دو لفظ دیتے ہیں ان کا ورد کرتے رہنا۔" قریب پڑے چند کاغذات سے اس نے کاغذ کا ایک ٹکڑا اٹھایا۔

"میں پاک حالت میں نہیں رہ سکتا" میں نے کہا۔

"کچھ پروا نہیں" وہ بولا۔

"میں عربی نہیں پڑھ سکتا" میں نے کہا۔

"اچھا" وہ رُک گیا۔ پھر بولا "ٹھیک ہے" اور کچھ لکھنے لگا۔ لکھنے کے بعد اس نے کاغذ کا ٹکڑا ایک پُرانے لفافے میں ڈالا اور وہ لفافہ مجھے پکڑا دیا۔ کہنے لگا "گیارہ مرتبہ صبح اور گیارہ مرتبہ سوتے وقت اس کا وِرد کیا کر۔ اب تو جا اللہ تجھے سمجھنے کی توفیق عطا کرے۔"

میں اُٹھ بیٹھا۔ باہر میرا اسکوٹر سڑک کے قریب کھڑا تھا۔ میں نے سکوٹر اسٹارٹ کیا اور چل پڑا۔

کچھ دُور جا کر دفعتہً مجھے یاد آیا کہ میرے سکوٹر کا پہیا تو پنکچر تھا۔ میں سکوٹر روک کر نیچے اُترا۔ پہیے کو دیکھا۔ ہوا ٹھیک ٹھاک تھی۔ پھر میں نے سٹفنی کو دیکھا وہ بھی ہوا سے بھری ہوئی تھی۔ یہ کیسے ہُوا؟ مجھ پر حیرت طاری ہوگئی۔ دیر تک اسی عالم میں چلتا رہا، چلتا رہا۔ پھر جو نگاہ اُٹھائی تو دیکھا کہ راستہ مانوس تھا۔

ساری رات میں سوچتا رہا۔ بات سمجھ میں نہ آئی۔ شام کو میں پھر سکوٹر لے کر چل پڑا تاکہ اس سڑک کا پتا لگاؤں جس پر میں غلطی سے مڑ گیا تھا۔

کچھ دیر تلاش کرنے کے بعد وہ سڑک مل گئی۔ میں اس پر چل پڑا۔ بڑ کے درخت کو دیکھ کر مجھے تسلی ہوگئی لیکن بڑ کے آس پاس جھونپڑا دکھائی نہ دیا۔ بڑ کے نیچے ایک آدمی نماز پڑھ رہا تھا۔ میں اس کے پاس جا بیٹھا۔ جب وہ فارغ ہُوا تو میں نے پوچھا "یہاں ایک جھونپڑا تھا۔"

"جھونپڑا؟" اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا "نہیں" وہ بولا "یہاں کوئی جھونپڑا نہیں۔"

"تُو اِدھر کب آیا تھا؟" میں نے پُوچھا۔

"بابو! میں ریکھ میں کام کرتا ہوں۔ روز اِدھر سے گزرتا ہوں۔ دوبارہ۔ میں نے کبھی کوئی جھونپڑا

نہیں دیکھا۔"

"میں کل آیا تھا" میں نے کہا "بڑی دیر اس جھونپڑے میں بیٹھا رہا تھا۔" اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا جیسے میں پاگل خانے سے چھوٹ کر آیا ہوں۔

یہ واقعہ اس زمانے کا ہے جب پہلی مرتبہ میں نے پاکستان پر مضمون لکھا تھا۔ اسے شائع ہوئے ایک مہینہ گزرا تھا۔

میں ایک منہ زبانی مسلمان ہوں۔ میری زندگی عمل سے یکسر خالی ہے۔ میری زندگی میں چار ایک ایسے واقعات ہوئے ہیں جنھیں بیت کر مجھے پتا چلا کہ ہماری دنیاوی زندگی کے متوازی ایک روحانی نظام بھی چل رہا ہے۔

لیکن بنیادی طور پر میں ایک ادیب ہوں، دانشور ہوں۔ میرا باطن شکوک و شبہات سے اٹا پڑا ہے۔ ایسے واقعے سے میں چند ایک روز متاثر ہوتا ہوں پھر منکر ہو جاتا ہوں۔

چند ایک روز میں سوچتا رہا۔ پھر شکوک و شبہات نے گھیر لیا۔ سوچا، شاید میں نے خواب دیکھا ہو یا شاید وہ جھونپڑا اور وہ بوڑھا میرے ذہن کی اختراع ہو۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اس سڑک پر آنے جانے والوں نے وہ جھونپڑا نہ دیکھا ہو۔ ضرور یہ میرے ذہن کی اختراع ہو گی۔ یوں میں نے خود کو مطمئن اور محفوظ کر لیا۔

پھر وہ ایک ماہ کے بعد میں نے اپنی واسکٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈالا تو ایک مڑا تڑا لفافہ برآمد ہوا۔ اس میں کاغذ کا ایک ٹکڑا تھا، اوپر بسم اللہ لکھی ہوئی تھی۔ نیچے لکھا تھا: گیارہ بار صبح جاگتے وقت اور گیارہ بار رات سوتے وقت ورد کرو۔ اس کے نیچے لکھا تھا: چھوٹا منہ بڑی بات۔

محترمہ ہومیو پیتھی کے نام

مدیرِ اعلیٰ ماہنامہ ہومیو پیتھی کے نام ایک خط

مکرمی جناب عطا حسین کلیم صاحب

السلام علیکم

گزشتہ چھ ماہ سے میں آپ کا پرچہ باقاعدگی سے پڑھ رہا ہوں۔ لیکن آج تک میرے پلّے کچھ نہیں پڑا ہمارے ہاں ایک مثل مشہور ہے "آب آب کر مویوں بچہ فارسیاں گھر گالے"۔ آپ کا پرچہ مسلسل آب آب کر رہا ہے۔ پانی کی بات نہیں کرتا۔

میرا مقصد یہ نہیں کہ آپ کے پرچے کی نِندا کروں۔ آپ کا پرچہ ماشاء اللہ بڑے بڑے عالمانہ اور محققانہ مضامین پیش کرتا ہے۔ مہلک بیماریوں کے متعلق معلومات بہم پہنچاتا ہے۔ نادر ادویات کے خواص گنواتا ہے۔ یہ ہدایات قلم بند کرتا ہے کہ مریض کی کیس ہسٹری کیسے نوٹ کی جانی چاہیے۔ اس بات پر بحث کرتا ہے کہ کون سی سمٹمز میں کون سی پوٹینسی استعمال کرنی چاہیے۔ کون سی سمٹمز کو اہمیت دینی چاہیے۔ کون سی کو در خور اعتنا نہیں سمجھنا چاہیے۔ یہ تمام باتیں عالمانہ ہیں۔ تحقیق و تجربے کا نچوڑ ہیں۔ لیکن یہ سب باتیں ہومیو ڈاکٹروں کے لیے کام کی باتیں ہیں۔ عام قاری کے لیے ان کی حیثیت آب آب کی ہے۔

جناب کلیم صاحب، صرف آپ کا پرچہ ہی نہیں، یہاں پاکستان میں ہومیو پیتھی کے موضوع پر جتنے پرچے بھی شائع ہو رہے ہیں، ان سب میں عالمانہ اور محققانہ باتیں ہوتی ہیں جو

صرف ہومیو ڈاکٹروں کے لیے اہمیت رکھتی ہیں اور مجھ سے عام قاری کے لیے آب آب کی حیثیت رکھتی ہیں۔

کلیم صاحب، کیا یہ پرچہ آپ نے اس لیے جاری کیا ہے کہ یہاں کے ہومیوپیتھ ایک دوسرے کے تجربات سے مستفید ہوتے رہیں یا وہ اپنے نام کا جھنڈا لہرانے کے لیے عالمانہ کتابی چیزیں شائع کروا سکیں؟ اگر یہ درست ہے تو یقیناً آپ دورِ جدید کے حاتم طائی ہیں جو دوسروں کے مفاد کے لیے اپنا مال اور وقت قربان کر رہے ہیں۔ ایک بات تو ظاہر ہے کہ ہومیوپیتھ ڈاکٹر آپ کا پرچہ نہیں خریدیں گے۔

میں ایک ادیب ہوں۔ میں نے کبھی ادبی پرچہ نہیں خریدا۔ میں یہ توقع رکھتا ہوں کہ ادبی پرچوں کے مدیر مجھے اپنا پرچہ مفت بھیجیں گے اور وہ بھیجتے ہیں۔

اسی طرح ہومیو ڈاکٹر آپ سے پرچہ نہیں خریدیں گے۔ وہ توقع رکھیں گے کہ آپ اُن کو اپنا پرچہ اعزازی طور پر بھیجیں۔ اگر یہ پرچہ ہومیوپیتھ ڈاکٹروں کے لیے جاری کیا گیا ہے اور ہومیو ڈاکٹر خریدتے نہیں تو جناب کلیم صاحب، یہ فرمائیے کہ اس پرچے کو کون خریدے گا؟ میں تو نہیں خریدوں گا۔ اس لیے کہ یہ پرچہ میرے لیے تو خالص آب آب ہے۔ اس کے مندرجات عام قاری کے لیے نہیں ہیں۔

کلیم صاحب، آپ تو بنیادی طور پر ادیب ہیں۔ آپ ادبی پرچوں کے متعلق واقفیت رکھتے ہیں۔ آج کل ادبی پرچہ نکالنا ایک عیاشی ہے۔ کچھ سرپھرے لوگ اس عیاشی کے مرتکب ہو جاتے ہیں۔ ادبی اور ہومیوپیتھی پرچوں میں ایک بات مشترک ہے۔ وہ یہ کہ دونوں کے خریدار نہیں ہیں۔

پرانی بات ہے، پاکستان میں ایک جرمن ادیب تشریف لائے۔ انھوں نے راولپنڈی کے ادیبوں کو اکٹھا کیا اور انھیں سخت ڈانٹ پلائی۔ کہنے لگے کہ آپ اپنی تخلیقات کو عالمی ادیبوں اور قارئین کے سامنے کیوں نہیں پیش کرتے؟ دیکھیے میں جرمنی سے چل کر یہاں آیا ہوں تاکہ پاکستانی

ادب سے دُنیا کو رُوشناس کراؤں۔ اس ڈانٹ کے جواب میں پاکستانی ادیبوں نے آئیں بائیں شائیں کی۔ سچّی بات کہنے کی کسی کو ہمّت نہ ہُوئی۔

یہ صورتِ حال دیکھ کر میں نے جرمن پروفیسر صاحب سے کہا کہ جنابِ والا ہم پاکستانی ادیبوں کی ایک پرابلم ہے۔ ہمیں پڑھنے والا کوئی نہیں ہے۔ لہٰذا ہم معاوضے سے محروم ہیں۔ ہم شوقیہ اللہ واسطے ادب لکھتے ہیں۔ ہمارے ہاں ادبی پرچے نہیں چلتے۔ کچھ ایسی ہی کیفیت ہومیوپیتھی کے پرچوں کی ہے۔

ویسے بھی کلیم صاحب، آپ کو علم ہے کہ پرچے بکری کے زور پر نہیں چلتے۔ اشتہاروں کے زور پر چلتے ہیں۔ اور نہ آپ کے پرچے میں خدا کے فضل سے کوئی اشتہار نہیں ہوتا۔ اور جہاں تک میں آپ کی طبیعت سے واقف ہوں، آپ کبھی اشتہار حاصل نہیں کر سکیں گے۔ اب آیئے ایک سنجیدہ مسئلے پر غور کریں۔ آپس کی بات ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس وقت ہومیوپیتھی کے سامنے کون سا ایسا مسئلہ درپیش ہے جو اہم ترین حیثیت رکھتا ہے۔

اس وقت یقیناً یہ مسئلہ اہم نہیں کہ کیا ہومیوپیتھی حیاتین کو مانتی ہے۔ یہ مسئلہ بھی اہم نہیں کہ کیا سنگل ریمڈی ضروری ہے یا مرکبات کو بھی موقع دیا جائے۔ یہ مسئلہ بھی اہم نہیں کہ چھوٹی پوٹینسیاں زیادہ زود اثر ہیں یا اُونچی پوٹینسیاں۔ میں مانتا ہوں کہ ویسے تو یہ سب مسئلے اہم ہیں، لیکن اس وقت ان کی حیثیت ضمنی ہے۔

سوال یہ ہے کہ اس وقت کیا صورتِ حال ہے؟ مجھے اجازت دیجیے کہ میں اپنی بات تفصیلی طور پہ بیان کروں۔

ہمارے ہاں اس وقت صرف ایک طریقۂ علاج مروّج ہے۔ یہ طریقۂ علاج "بگ بزنس" کے ہاتھوں میں ہے۔ انھوں نے بڑی ہوشیاری سے اس طریقۂ علاج کو فیشن میں بدل دیا ہے۔ سٹیٹس کا نشان بنا دیا ہے۔ پرسٹیجس بنا دیا ہے۔

آج کے بزنس نے چیز کو رائج کرنے کا ایک انوکھا طریقہ دریافت کیا ہے۔ مثلاً

کسی مشروب کو رائج کرنا مقصود ہے تو اشتہار کے ذریعے آپ اسے سٹیٹس کا نشان بنا دیں۔ یہ نہ کہیں کہ کوک ایک فائدہ مند مشروب ہے بلکہ یہ کہیں کہ وہ لوگ کوک پیتے ہیں جنھیں امتیاز حاصل ہے۔ مثلاً پی آئی اے اشتہار دیتا ہے : باکمال لوگ لاجواب پرواز۔ اس جملے کی وجہ سے پی آئی اے میں سفر کرنا عزت کا نشان ہو گیا ہے۔ سٹیٹس کا نشان بن گیا ہے۔ بگ بزنس نے ایلوپیتھک دوائیاں کھانے کو سٹیٹس سمبل بنا دیا ہے بیگمات بڑے اہتمام سے طرح طرح کی گولیاں کھاتی ہیں۔ ڈرائنگ روم کی میز پر گولیوں کی بوتلیں قرینے سے لگی ہوتی ہیں تاکہ آتے جاتے لوگ دیکھیں یہ وٹامنز ہیں۔ یہ سالٹس ہیں۔ یہ ٹونک ہیں۔ یہ گولی معدے کو ٹھیک ٹھاک رکھتی ہے۔ ایسڈٹی کو دور رکھتی ہے۔

پرانے زمانے میں ڈاکٹروں کی دکانوں پر مفرد دوائیاں بوتلوں میں رکھی ہوتی تھیں۔ ڈاکٹر نسخوں میں مفرد دوائیاں لکھا کرتے تھے۔ دوائی کا نام اور اس کی مقدار سب درج ہوتے۔ ڈاکٹروں کے کمپاؤنڈر ادویات بناتے تھے۔ ایک ایک دوا کو میژرنگ گلاس میں ڈالتے، ناپتے، پھر بوتل میں ڈال دیتے۔ یعنی کمپاؤنڈر دوا کو ڈسپنس کیا کرتے تھے۔

اگر یہ طریقِ کار جاری رہتا تو کاروبار دوا ساز کمپنیوں کے ہاتھ میں نہ آتا۔ لہٰذا دوا ساز کمپنیوں نے بڑی محنت اور چالاکی سے مفرد دواؤں کا رواج ختم کر دیا۔ اس کی جگہ تیار شدہ مرکبات بنا دیے اور یوں کاروبار اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

ادویات کے بگ بزنس نے ایک بہت بڑا راز پا لیا ہے کہ آج کے دور میں لوگ افاقہ چاہتے ہیں۔ جھٹ پٹ افاقہ۔ ابھی ابھی ٹھیک کر دو تاکہ شام کی مصروفیات میں خلل نہ آئے۔ کیور یا شفا کے متعلق پھر کبھی فرصت میں سوچیں گے۔ اس لیے انھوں نے زیادہ تر توجہ افاقہ بخش ادویات پر مرکوز کر دی ہے۔ گولی کھاؤ۔ ٹھیک ہو جاؤ۔ کیور کی طرف توجہ کرنا گھاٹے کا سودا ہے۔ افاقے کے تحت آپ روز گولی کھائیں گے۔ جب تک جئیں گے، کھاتے رہیں گے۔ لہٰذا گولیاں زیادہ بکیں گی۔ ظاہر ہے کہ بزنس کے

نقطۂ نظر سے افاقہ بخش ادویات بنانا زیادہ منفعت بخش ہے۔ اس وجہ سے بگ بزنس نے کیورکی طرف توجہ ہی نہیں دی۔ ان کا مقصد صحت نہیں، کاروبار ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ایلوپیتھی ایمرجنسی کا سسٹم بن کر رہ گیا ہے۔ اور بیشتر عارضوں کی دوا سے آج تک محروم ہے۔

ایمرجنسی کے علاوہ ایلوپیتھی سرجری میں بڑی مہارت رکھتی ہے۔ اس لیے جس عارضے کی دوا موجود نہیں اُسے آپریشن سے ٹھیک کرنے کا دعویٰ کیا جاتا ہے۔ آپریشن دراصل ادویہ کے فقدان کی دلیل ہے۔ اس بات پر آج تک پردہ پڑا رہا ہے کہ ایلوپیتھی ادویہ میں قلاش ہے۔ اس کے پاس بہت سے امراض کی دوا سرے سے موجود ہی نہیں۔ اب صورتِ حال کچھ بدل رہی ہے۔ لوگ محسوس کرنے لگے ہیں کہ ایلوپیتھی میں ہر مرض کی دوا موجود نہیں۔

اللہ پاکستانی ڈاکٹروں کا بھلا کرے۔ انھوں نے اندھا دھند اینٹی بائیوٹکس دے دے کر لوگوں کو چوکنا کر دیا ہے۔ ان کے دلوں میں شکوک و شبہات پیدا ہونے لگے ہیں۔ بہت سے مریض ایسے ہیں کہ انگریزی دوائیاں کھا کھا کر ان کے ری ایکشنز کی وجہ سے مستقل مریض بن چکے ہیں۔ کچھ مریض ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں میری صحت اچھی بھلی تھی، لیکن جب سے میں نے آپریشن کروایا ہے، سارا نظامِ جسم ہی درہم برہم ہو گیا ہے۔

کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو ڈاکٹروں کی فیسوں اور ادویات پر خرچ کرتے کرتے قلاش ہو گئے ہیں اور اب کوئی متبادل طریقِ علاج سوچنے پر مجبور ہیں۔

کچھ لوگوں کو یہ احساس ہونے لگا ہے کہ ایلوپیتھی مرض کو دُور نہیں کرتی، بلکہ دبا دیتی ہے اور یہ دبا ہُوا مواد مُہلک تر صورت میں پھر سے اُبھرتا ہے۔

جناب کلیم صاحب، میں سمجھتا ہُوں کہ اس وقت سب سے اہم مسئلہ جو ہومیوپیتھی کو درپیش ہے، یہ ہے کہ لوہا گرم ہے، چوٹ لگائیے۔

اس وقت ہانمن کے گن گانے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ ہانمن کے لیے خاص نمبر شائع کرنا، اس کا فلسفہ بیان کرنا، بے معنی ہے۔ اس وقت ضرورت اس بات کی ہے کہ شہر کے سرکردہ ہومیوپیتھس ہر چند ماہ کے بعد ایک پریس کانفرنس بلائیں جس میں اخبار نویسوں کے علاوہ ادیب بھی موجود ہوں، دانشور بھی ہوں۔ اس پریس کانفرنس میں آپ وہ نکات پیش کریں جن سے ثابت ہو کہ بحیثیت طریقِ علاج ہومیوپیتھی کو ایلوپیتھی پر فضیلت حاصل ہے مثلاً:

۱۔ ہومیوپیتھی ادویات کے معاملے میں ایلوپیتھی کے مقابلے میں زیادہ "رچ" ہے۔ اور ہومیوپیتھی کے پاس بہت زیادہ تعداد میں دوائیاں موجود ہیں۔

۲۔ ہومیوپیتھک ادویات کا ری ایکشن نہیں ہوتا۔

۳۔ ہومیوپیتھی کی ہر خوراک انجکشن کی حیثیت رکھتی ہے کیونکہ وہ معدے میں نہیں جاتی بلکہ مُنھ سے سیدھی خون میں شامل ہو جاتی ہے۔

۴۔ ہومیوپیتھک ادویات بسا اوقات مریض کو آپریشن سے نجات دلا دیتی ہیں۔

۵۔ ہومیوپیتھک دوائیاں صرف شفا ہی نہیں بخشتیں، وہ امراض سے تحفظ بھی دیتی ہیں۔

۶۔ ہومیوپیتھک دوائیاں مقابلتاً بہُت سستی ہوتی ہیں۔ پاکستان جیسے غریب مُلک کے لیے ہومیوپیتھی زیادہ موزوں علاج ہے۔

۷۔ ہومیوپیتھی میں ایسی دوائیاں موجود ہیں جو شراب اور تمباکو جیسی بُری عادت چھڑا سکتی ہیں۔ اس کے علاوہ زیادہ چائے پینے، شراب نوشی اور تمباکو نوشی کے بُرے اثرات کو زائل کر سکتی ہیں۔

۸۔ ہومیوپیتھی میں ایسی ادویات موجود ہیں جو غم، فکر، وہم، عشق اور خوف کی شدّت کو کم کرنے کی قوّت رکھتی ہیں۔

۹۔ ہومیوپیتھی مُزمن بیماریوں کیلیے تیر بہدف کا کام کرتی ہے۔ چاہے بیماری سالہا سال پُرانی ہو۔

جناب کلیم صاحب، آپ اور ہومیو پیتھ ڈاکٹر میری نسبت ہومیو پیتھی کی فضیلت کے نکات سے زیادہ واقفیت رکھتے ہیں۔

لازم ہے کہ اس پریس کانفرنس میں خصوصی کیس پیش کیے جائیں، اُن پڑھے لکھے مریضوں کو پیش کیا جائے جنھوں نے ہومیو پیتھک علاج کے باعث مہلک امراض سے نجات پائی ہے، ان کی مصدقہ کیس ہسٹریاں ٹیسٹوں کی رپورٹوں کے ساتھ پیش کی جائیں۔

مقصد یہ ہے کہ صحافیوں اور دانشوروں کو یقین دلایا جاسکے کہ ہومیو پیتھک طریقۂ علاج یقینی طور پر ایلوپیتھی پر فضیلت رکھتا ہے۔ اگر ہم چند ایک اخبار نویسوں، ادیبوں اور دانشوروں کو یقین دلانے میں کامیاب ہو جائیں اور پریس میں ایسے کیسز کی اشاعت کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہومیو پیتھی کی طرف لوگوں کا عام رُجحان نہ ہو جائے۔ یہ ایک بہت بڑی خدمت ہوگی۔

آپ کے پرچے میں میں نے چند ایک مضامین چھپوائے ہیں۔ ان مضامین کا مقصد صرف یہ تھا کہ عام قاری کو ہومیو پیتھی کی طرف متوجہ کیا جائے۔ لیکن آپ کے پرچے کے عالمانہ اور محققانہ مضامین میں میرا مضمون ایسے لگتا تھا جیسے موروں میں ایک کوا آ بیٹھا ہو۔ یا جیسے شُدھ راگ میں ایک برجستہ سُر لگا دیا گیا ہو۔ چند لوگوں نے ان مضامین پر حیرت کا اظہار کیا۔ گمان غالب ہے کہ ہومیو ڈاکٹروں نے جتائے بغیر میرے مضامین کا مذاق اُڑایا ہوگا۔

کلیم صاحب! میں ہومیو پیتھی کا ایک پروانہ ہوں اور میری زندگی کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ لوگ ہومیو پیتھی کی طرف متوجہ ہوں اور اس سے مستفید ہوں۔ میرا ارادہ ہومیو پیتھک ڈاکٹر بننے کا نہیں ہے۔ چونکہ مجھ میں اس کی اہلیت نہیں، اس لیے میرا مقصد ذاتی مفاد نہیں ہے۔

آپ کو ایسے لوگوں کی اشد ضرورت ہے جن میں یہ جذبہ ہو کہ لوگوں کی توجہ ہومیو پیتھی کی طرف مبذول کریں۔ اس میں ہومیو پیتھی کا بھلا نہیں، نہ ہی ہومیو ڈاکٹروں کا بھلا ہے بلکہ اس میں ان لوگوں کا بھلا ہے جو انجانے میں فیشنی طریقۂ علاج کی وجہ سے اپنی صحت کو تباہ کیے جا رہے ہیں۔

ناقابلِ فراموش

میں معجزات کو مانتا ہوں لیکن ان سے متاثر نہیں ہوتا۔ میں کشف کو اہمیت نہیں دیتا۔

مافوق الفطرت واقعات میرے لیے باعثِ حیرت ضرور ہیں لیکن میں انھیں مافوق الفطرت نہیں سمجھتا۔ اگر آپ سچے دل سے مانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ قادرِ مطلق ہے تو پھر مافوق الفطرت کے معنی؟ اگر آپ تسلیم کرتے ہیں کہ انسانی عقل محدود ہے اور حسیات کا دائرۂ کار محدود ہے تو پھر حیرت واقعہ پر نہیں بلکہ اللہ کی عظمت پہ ہوتی ہے۔

سائنس جان بوجھ کر مافوق الفطرت سے مُنھ موڑے بیٹھی ہے۔ بیچاری کیا کرے۔ تسلیم کرے تو مشکل، رد کرے تو مشکل۔ اور مافوق الفطرت واقعات روئے زمین پر اکثر و بیشتر ہوتے رہتے ہیں۔ ہر مافوق الفطرت واقعہ اللہ کی طرف سے ایک پیغام ہے۔ ایک یاد دہانی "تمھارا رُخ ٹھیک نہیں۔ اسے ٹھیک کرو۔ اب بھی سمجھ جاؤ۔ دیکھو۔ غور سے دیکھو۔ سب کچھ سامنے پڑا ہے۔ عیاں ہے۔ کوئی پردہ حائل نہیں ـــ دیکھ لو۔"

بہرصورت، میری دانست میں سب سے بڑا معجزہ صرف ایک ہے جو مجھ پہ رونما ہوا۔ گمان غالب ہے کہ آپ اسے اہمیت نہیں دیں گے۔ کہیں گے کہ یہ تو ایک عام سی بات ہے۔ لیکن میرے نزدیک یہ اہم ترین واقعہ ہے جو کسی انسان پر وقوع پذیر ہو سکتا ہے۔

یہ ۱۹۵۵ء کی بات ہے۔

سکول میں میں ایک نالائق طالب تھا۔ رعایتی پاس ہو جاتا، کیوں کہ ہیڈ ماسٹر کا بیٹا

تھا۔ کالج میں دل نہ لگا کیوں کہ شدید احساسِ کمتری کا شکار تھا۔ بی اے میں عشق کا آزار لگا بیٹھا۔ پھر یہ بلبلہ پھوٹا۔ ایک تکلیف دہ خلا پیدا ہو گیا۔ اتفاقاً سامنے کتاب آ گئی۔ مطالعے میں ڈوب گیا۔ اس زمانے میں برٹرنڈ رسل، ویلز، ہالڈین، ہکسلے پیش پیش تھے۔ انھوں نے مجھے سائنسی اور سیکولر رُخ عطا کر دیا۔ پہلے ہی مذہب سے کورا تھا۔ مزید سپاٹ ہو گیا۔ پھر فلسفے سے نفسیات میں جا گھسا۔ نفسیات سے جنس اور سائیکک سائنس یعنی ای ایس پی میں جا پہنچا۔ مختصر یہ کہ ان دنوں میں ایک معقول پڑھا لکھا بے مذہب سیکلر تھا جسے روحانیت کا شعور نہ تھا۔

ان دنوں میں راولپنڈی میں وزارتِ اطلاعات کے ایک ذیلی دفتر میں کام کرتا تھا۔ پہلے بڑا صاحب مجھ پر بڑا مہربان تھا۔ پھر دفعتاً بظاہر بے وجہ میرے خلاف ہو گیا۔ اس نے مجھ پر دو کیسز کر دیے۔ ایک عام سا اور دوسرا سنگین نوعیت کا تھا۔ میں طبعاً ڈرپوک اور نروس آدمی ہوں۔ بار بار کی جواب طلبیوں اور انکوائری کمیٹیوں سے سخت گھبرا گیا۔

ایک دن حلقۂ اربابِ ذوق راولپنڈی کے سیکرٹری عزیز ملک، جو ایک جانے پہچانے صاحبِ طرز ادیب ہیں، مجھ سے کہنے لگے "مفتی صاحب، معلوم ہوتا ہے آپ پریشان ہیں۔ کیا بات ہے؟"

میں نے کہا "ہاں ہوں۔" اور میں نے اسے سارا قصّہ سُنا دیا۔

ملک بولا "اگر آپ کہیں تو میں کسی بزرگ سے درخواست کروں آپ کے لیے دعا کریں۔"

میں نے کہا "ضرور کیجیے۔"

کہنے کو تو میں نے کہہ دیا لیکن ان دنوں نہ میں بزرگ کے مفہوم سے واقف تھا، نہ دُعا کی طاقت کا شعور رکھتا تھا۔ عزیز ملک کو میں ادیب کی حیثیت سے جانتا تھا۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ وہ صاحبِ روحانیت بھی ہے اور ایک بزرگ کی خدمت میں پچیس سال سے باقاعدہ حاضری دیتا رہا ہے۔

چند ایک روز کے بعد ملک مجھ سے ملا۔ کہنے لگا "میں نے ان بزرگ سے آپ کا

تذکرہ کیا تھا۔ انھوں نے فرمایا: ہم تو اس لائق نہیں کہ دُعا کے لیے ہاتھ اُٹھائیں۔ بہتر یہی ہے کہ آپ مفتی صاحب کو سرکار قبلہ کی خدمت میں لے جائیں اور ان سے کہیں کہ وہ خود ان کی خدمت میں دُعا کے لیے گزارش کریں۔"

یہ سب باتیں میرے لیے بے معنی تھیں۔ میں ان کے مفہوم سے واقف نہ تھا۔ لیکن عزیز ملک کے جذبۂ ہمدردی اور حُسنِ اخلاق کی وجہ سے میں نے اس کے ساتھ جانا قبول کر لیا۔

ملک نے کہا "جمعے کے روز میں آپ کو سرکار قبلہ کی خدمت میں لے جاؤں گا۔"

جمعے کے روز عزیز ملک آ گیا اور ہم دونوں چل پڑے۔ چلتے چلتے ہم مریڑ کے قبرستان میں جا پہنچے۔ مریڑ راولپنڈی صدر کا ایک مضاف ہے جو ریلوے لائن پر واقع ہے۔ قبرستان میں ایک چوگان سا تھا جس کے گرد تار لگی ہوئی تھی۔ چوگان کے اندر کچھ پیڑ تھے۔ ایک لمبا چوڑا پختہ تھڑا سا بنا ہوا تھا۔ اس کے ملحق ایک چار دیواری تھی۔ اس چار دیواری میں ایک جانب کھڑکی نما دروازہ تھا۔

جب ملک اس کھڑکی نما دروازے میں داخل ہوا تو میں گھبرا گیا۔ میں سمجھا تھا کہ سرکار قبلہ کسی فرد کا نام ہو گا جس کے حضور مجھے لے جایا جا رہا ہے۔ کسی مزار یا قبر پر جانا میرے لیے ناقابلِ قبول بات تھی۔ کسی بزرگ سے دُعا کرانے میں پھر بھی کوئی بات تھی لیکن قبر سے مخاطب ہونا، کسی مرحوم و مغفور کو دُعا کے لیے کہنا، میرے لیے قطعی طور پر مضحکہ خیز تھا۔ اس وقت اگر مجھ میں اخلاقی جرأت ہوتی تو میں ملک سے کہتا "عزیز ملک، تم تو پڑھے لکھے آدمی ہو۔ ایک صاحبِ طرز ادیب ہو۔ صاحبِ عقل و دانش ہو۔ ذہنی طور پر حقیقت پسند ہو۔ پھر یہ کیا حماقت ہے؟ تم مجھے کہاں لے آئے ہو؟ اب میں اس مٹی کے ڈھیر سے کیا کہوں؟ کیسے درخواست کروں کہ دُعا کرو۔ یار، میرا مذاق تو نہ اُڑاؤ ـــــ" لیکن مجھ میں اتنی جرأت نہ تھی۔ اس لیے میں برے سے دل سے چُپ چاپ ملک کے پیچھے پیچھے اندر داخل ہو گیا۔ اندر رنگین ٹائلوں کا فرش بچھا تھا اور ایک طرف سفید ٹائلوں کا مرقد بنا ہوا تھا۔ مرقد کے پتھر پر لکھا تھا "حضرت سائیں اللہ بخش نقشبندی

قلندری!" نہ مجھے نقشبندی کے مفہوم کا علم تھا، نہ قلندری کا پتا تھا۔ ساری باتیں ہی مہمل تھیں۔

ملک نے کہا "مفتی صاحب، آپ کو کوئی آیت یاد ہے؟"

میں نے کہا "ہاں۔ صرف الحمد۔"

بولا "ٹھیک ہے۔ الحمد شریف پڑھیے۔ پھر درود شریف پڑھیے۔ اور پھر نہایت خشوع سے اپنی درخواست پیش کر دیجیے۔"

"خشوع ۔۔۔!" مجھے ہنسی آ گئی "نہ یقین، نہ ایمان۔ خشوع کہاں سے آئے گا۔"

بہرحال، میں نے دو سوکھے ہاتھ اُٹھائے، زبان نے روکھے انداز سے الحمد پڑھی اور پھر میں نے اپنی گزارش کر دی۔ وہ گزارش گزارش نہ تھی، منّت نہ تھی، التجا نہ تھی۔ جب سامنے قابلِ احترام ہستی کے وجود کا احساس ہی نہ ہو تو منّت کیسی، التجا کیسی۔ اس سارے عمل میں نہ ذہن شامل ہوا نہ دل۔ زبان نے بھی محض رسم ادا کی۔

چار دیواری سے باہر نکل کر میں نے سچّے دل سے زیرِ لب کہا "شکر ہے۔ جان چھوٹی۔"

ملک صدر میں رہتا تھا۔ میں شہر میں۔ ہمارے راستے الگ الگ تھے۔ اس لیے ملک نے مجھے خدا حافظ کہا اور رُخصت ہو گیا۔

چھ سات دن گزر گئے۔

اس دوران میں میں اس مزار اور دُعا کے لطیفے پر دل کھول کر ہنس لیا اور پھر اس واقعے کو بھول گیا۔ ایک روز ملک پھر آ گیا۔ کچھ مضطرب سا تھا۔ بولا "مفتی صاحب! ہم سے ایک غلطی سرزد ہو گئی ہے۔"

"وہ کیا؟" میں نے پوچھا۔

بولا "میں بھائی جان سے ملا تھا۔"

"یہ بھائی جان کون ہیں؟"

"وہ سائیں اللہ بخش کے بالکے ہیں۔"

"آپ انھیں بھائی جان کیوں کہتے ہیں؟"

ملک بولا "نقشبندی اپنے مرشد کو بھائی جان کہہ کر بلاتے ہیں۔"

"نقشبندی کون ہیں؟"

ملک ہنسا۔ بولا "آپ کو سب علم ہو جائے گا۔ چوں کہ بھائی جان نے بتایا ہے کہ مفتی ہمارا بھائی ہے، ظاہر ہے کہ آپ بہت جلد ہم میں شامل ہو جائیں گے۔"

اس خوش فہمی پر میں بہت محظوظ ہوا۔

ملک بولا "مفتی جی، ہم سے غلطی ہو گئی کہ ہم نے سرکار قبلہ کی خدمت میں جمعے کے روز حاضری دی۔ بھائی جان فرماتے ہیں کہ جمعے کے روز صاحب مزار اپنے مقام پر موجود نہیں ہوتے۔"

یہ سن کر میرا جی چاہا کہ قہقہہ مار کر ہنس دوں۔ مجھے ملک کی عقلِ سلیم پر شکوک پیدا ہونے لگے۔ میں نے حیرت سے ملک کی طرف دیکھا۔ یہ کیسا آدمی ہے! بظاہر اس قدر معقول لیکن باطن میں اس قدر مجہول!

ملک بولا "بھائی جان فرماتے ہیں' ایک مرتبہ پھر سرکار قبلہ کی خدمت میں حاضری دو لیکن جمعے کا روز نہ ہو۔"

"مائی گاڈ! یہ میں کس مصیبت میں پھنس گیا۔"

جی چاہتا تھا کہ ملک سے صاف صاف کہہ دوں "جناب والا، مجھے اور نہ بناؤ۔ بہت ہو لیا۔ اب جان بخشو۔" مگر ملک کے رُوبرو ایسی بات کرنا ممکن نہیں۔ اس کی شخصیت اتنی پُروقار ہے۔ اس کے انداز میں اس قدر خلوص ہے کہ آپ عاجز ہو کر رہ جاتے ہیں۔

میں نے بھی مجبوراً سرِ تسلیم خم کر دیا۔

اس کے باوجود میرے اندر بھتنے ناچ رہے تھے۔ "صاحبِ مزار اپنے مقام پر حاضر نہیں ہوتا۔ ہُنہ! جمعے کے دن چھٹی کرتا ہے۔ درخواستیں موصول نہیں کرتا۔ ہاہاہاہا ــــ ہا! مٹی کے تودے تلے دبا ہوا سرکار قبلہ!"

اندر ایک ہنگامہ مچا ہوا تھا۔ برٹرینڈ رسل مسکرا رہا تھا۔۔۔ طنز بھری مسکراہٹ۔ پکلے سر پیٹ رہا تھا۔ ڈیلز طعنے دے رہا تھا۔ فرائیڈ سر تھامے بیٹھا تھا۔ مارکس تلوار لہرا رہا تھا۔

چند روز کے بعد ملک پھر میرے دفتر آ گیا۔ بولا "اگر آپ کو فرصت ہو تو چلیے سرکار قبلہ کی خدمت میں حاضری دے آئیں۔"

ہم دونوں چل پڑے۔ میں یوں محسوس کر رہا تھا جیسے قربانی کا بکرا تھا۔ طبیعت غم و غصہ سے بھری ہوئی تھی۔ اس روز مجھے سائیں اللہ بخش کا مزار یوں لگ رہا تھا جیسے کسی مداری کا ڈیرا ہو۔

میں نے تمسخر آمیز انداز میں الحمد پڑھی، غیر دعائیہ انداز میں دعا کی، یوں جیسے کوئی کسی کا مذاق اڑاتا ہے۔

باہر نکل کر میں نے سچے دل سے لاحول پڑھی۔ چلو جان چھٹی۔ ملک اس کارِ خیر کی تکمیل پر بہت خوش تھا۔ اور میں اسے ذہنی مریض سمجھ رہا تھا۔ خیر، ملک نے مجھے خدا حافظ کہا اور رخصت ہو گیا۔

وہاں سے میرا گھر تقریباً ایک میل دور تھا۔ آدھا میل کھیتوں سے گزرنا پڑتا۔ اس کے بعد آدھ میل آبادی سے۔ ابھی میں مزار سے تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ میرے اندر گویا ایک ہوائی سی چلی۔ ایسے لگا جیسے اندر زور سے سوڈا واٹر کی بوتل کھل گئی ہو۔ بلبلوں کا ایک طوفان اٹھا اور پھر ان جانے میں میں کچے شیشے کے گلاس کی طرح تڑخ گیا۔ اور پھر پھوٹ پھوٹ کر بھیں بھیں کر کے رونے لگا۔

پتا نہیں میں وہاں کتنی دیر کھڑا روتا رہا۔ جب کچھ ہوش آیا تو میں نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ کسی نے دیکھا تو نہیں، شکر ہے قرب و جوار میں کوئی نہ تھا۔ پھر میں حیرت میں ڈوب گیا۔ یہ کیا ہوا؟ مائی گاڈ! ان دنوں اللہ سے متعارف نہ تھا، اس لیے مائی گاڈ، مائی گاڈ چلاتا رہا۔ اس زمانے میں نہ تو میں بزرگوں کی طاقت سے واقف تھا، نہ رقت کی کیفیت سے آشنا۔ نہ ہی مجھے علم تھا کہ بزرگ جادوگر ہوتے ہیں، طبیعت میں جلال بھی ہوتا ہے، احساسِ مزاح بھی اور تماشا دیکھنے کا شوق بھی۔ اس لیے یہ واقعہ میرے لیے حیران کن تھا۔ میں سمجھتا تھا اس

کیفیت کا صاحبِ مزار سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ تو کوئی ذہنی عارضہ ہے۔

اس زمانے میں ادب میں داستووسکی میرا راہبر تھا۔ اس کی تحریریں میرے بند بند میں رچی ہوئی تھیں۔ مجھے علم تھا کہ وہ نارمل نہ تھا۔ اس پر مرگی کے دورے پڑتے تھے۔ میں سمجھا شاید میں بھی داستووسکی کے نقشِ قدم پر چل نکلا ہوں۔ کچھ دیر تو میں نے آنسو پونچھے، منہ صاف کیا، پھر خود کو سنبھالا اور آگے چل پڑا۔ سو پچاس قدم چلا تھا کہ پھر وہی ہوا چلی۔ ڈرسے سوڈے کی بوتل کھلی، بلبلوں کا ایک طوفان اوپر کی طرف ابھرا۔ میں نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔۔۔ شدید کوشش کی لیکن اس وقت گویا میں میں نہ تھا۔ میری مَیں دو حصوں میں بٹ چکی تھی۔۔۔ ایک سوچنے والا میں، ایک محسوس کرنے والا میں۔ محسوس کرنے والے میں سے چھینٹے اڑ رہے تھے، جھاگ اُٹھ رہا تھا۔ بند بند بھن بھن کر رہا تھا۔ جیسے بھڑوں کا چھتا ہو۔ سوچنے والے میں کے ہاتھ سے کنٹرول نکل چکا تھا۔ وہ بے بس لاچار کھڑا تھا۔ مائی گاڈ! مائی گاڈ! ـــــ یہ کیا ہو رہا ہے!

اس آدھ میل کے فاصلے کے دوران مجھ پر تین دورے پڑے۔ اس کے بعد سوچنے والا میں بالکل فیوز ہو کر رہ گیا۔ عجز اور بے بسی سے چور، خوف اور حیرت سے ادھ موا۔ پھر آبادی کا علاقہ آ گیا۔ مجھ پر مزید خوف طاری ہو گیا۔ لوگ کیا کہیں گے؟ وہ مجھے پاگل خانے سے چھٹا ہوا سمجھیں گے۔ اگر کسی واقف کار نے دیکھ لیا تو؟ مجھے مائی گاڈ کہنا بھی بھول گیا۔ آبادی میں پہنچ کر میں نے مفلر سے منہ لپیٹ لیا اور بھاگنا شروع کر دیا ـــــ پھر مجھے پتا نہیں کیا ہوا۔ ایک جگہ لوگ حیرت سے میری طرف دیکھ رہے تھے، دوسری جگہ مجھ پہ انگلیاں اٹھا رہے تھے، کچھ تمسخر سے ہنس رہے تھے۔ دو ایک دھندلے سے آوازے سنائی دیے: پاگل ای اوئے۔ گھر کے دروازے پر پہنچ کر میں نے خود کو اچھی طرح سنبھالا۔ منہ پونچھا۔ آنکھیں صاف کیں۔ چہرے پر سنجیدگی سجائی اور اندر داخل ہو گیا۔ میں سخت خوف زدہ تھا۔ اگر گھر میں دورہ پڑ گیا تو؟ میں دورے سے نہیں، اپنی بیوی سے ڈرتا تھا۔

میری بیوی ایمن آباد کے شیخوں میں سے ہے۔ وہ سب نومسلم ہیں۔ انھیں بُت پرستی کسی صورت میں گوارا نہیں۔ لہٰذا وہ نہ پیر کو مانتے ہیں، نہ فقیر کو، نہ معجزات کو، نہ کشف کو۔ وہ صرف اللہ کی ذات کو مانتے ہیں۔ قرآن کے احکامات کو مانتے ہیں اور بس۔ اگر ان کا بس چلے تو پیغمبروں کو بھی بندے سے زیادہ حیثیت دینے سے انکار کر دیں۔ کسی بزرگ یا بابا کی بات کروں تو میری بیوی کے چہرے پر تمسخر بھری مسکراہٹ پھیل جاتی ہے۔ اس مسکراہٹ کی دھار میں بہت کاٹ ہوتی ہے۔ میں اس کاٹ سے خائف ہوں۔

اس وقت تک میری زندگی میں کوئی بابا داخل نہ ہوا تھا۔ سوائے کوٹلا سنز والے بابا کے۔

کوٹلا سنز کے بابا کے ڈیرے پر میں اتّفاق سے جا پہنچا تھا۔ اس عمل میں نہ طلب کا دخل تھا، نہ یقین کا، نہ ایمان کا۔ ہوا یوں کہ ایک روز صدر بازار میں گھومتے پھرتے مجھے قیوم مل گیا۔ قیوم میرا پُرانا اور بے تکلّف دوست تھا۔ وہ ایک مُنہ پھٹ، جاذب اور شوخ شخصیت کا مالک تھا۔ اسے پنڈی میں دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔

"ارے یار تم یہاں!" میں چلّایا۔

"کیوں؟ میرے پنڈی آنے پر بین لگی ہے کیا؟"

"مجھے اطلاع کیوں نہ دی؟"

"کیسے دیتا" وہ بولا "والدِ محترم ساتھ ہیں۔ باادب باملاحظہ ہوشیار کا عالم ہے۔ یار دوست کی گنجائش نہیں۔"

"چلو کسی ریستوران میں بیٹھ کر باتیں کریں۔"

"اونہوں۔ ریستوران نہیں۔ چل میں تجھے ایک ایسی جگہ لے چلتا ہوں جہاں فسٹ کلاس کڑک چائے ملے گی اور ایسی رنگین محفل کہ رنگ رس میں ڈوبے بیٹھے رہو گے۔"

وہ مجھے کوٹلا سنز کے بابا کے حجرے میں لے گیا۔

صدر بازار کے ایک کونے میں وہ ایک لمبا سا کمرا تھا۔ دیواریں اور فرش مٹی سے

اُپتے ہوئے تھے۔ فرش پر چٹائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ دونوں دیواروں کے ساتھ ساتھ بہت سے لوگ قطار میں احترام کی وجہ سے گٹھڑیاں سے بنے بیٹھے تھے۔ ایک سمت ایک پہلوان نما آدمی جس کا سر اور بھنویں منڈی ہوئی تھیں، سفید چادر لپیٹے بیٹھا تھا۔ اس کے پاس ہی تھالیوں میں دو مٹی کے دیے جل رہے تھے۔

اندر داخل ہوتے ہی میں نے محسوس کیا جیسے میں کسی اور دنیا میں آداخل ہُوا ہوں۔ مٹی کے دیوں کی دھندلی روشنی نے کمرے کو پُراسرار بنا رکھا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے الف لیلہ کا کوئی باب کھل گیا ہو۔

بابا کے منڈے ہُوئے سر اور بھوؤں کے گرد دو بڑے بڑے کان دیکھ کر مجھے یوں لگا جیسے وہ جیک دی جائنٹ کلر ہو، اور اس کے گرد قطاروں میں مُردوں کی لاشیں ڈھیر ہو رہی ہوں۔

قیوم نے داخل ہوتے ہی بڑے بے باکانہ انداز میں السلام علیکم کہا۔ گویا کسی نے سم سم پھونک دیا۔ اس پر دیواروں سے لگی ہوئی ڈھیریوں میں جان پڑ گئی۔ وہ سب کے سب اُٹھ کر کھڑے ہو گئے، اور باری باری ہم سے ہاتھ ملانے لگے۔ آخر میں بابا کی باری تھی۔ وہ جوں کا توں بیٹھا تھا۔ قیوم جُھکا۔ بابا سے مصافحہ کیا۔ بابا نے ہاتھ بڑھا کر اس کی کمر کو تھپکا اور پھر ہم ایک طرف کونے میں بیٹھ گئے۔ "بسم اللہ بسم اللہ۔ مہمان آئے ہیں" بابا بڑبڑایا۔ اس پر بابا کا خدمت گار اُٹھا۔ اس نے ایک بڑی کیتلی اُٹھائی اور پیالیوں میں چائے ڈالنے لگا۔ چائے کڑک تھی۔ گرم تھی۔ بے خوشبو کے لذیذ تھی۔

قیوم اور میں اندھیرے کونے میں بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ "ابے یہ لائینز ڈن (LIONS DEN) تو نے کیسے ڈھونڈا؟" میں نے پوچھا۔

وہ ہنسا۔ بولا "یہ امریکہ محترم والد صاحب کی دریافت ہے۔"

ماحول کی وجہ سے ہم وہاں ذاتی گفتگو نہ کر سکے۔ ماحول کی پُراسراریت نارمل گفتگو کرنے میں مزاحم تھی۔ ادھر بابا جنکارے انداز میں باتیں کیے جا رہا تھا۔ اس کی باتیں عالمانہ نہیں تھیں۔

پتا نہیں مجھے عالمانہ باتوں سے کیوں چڑ ہے۔ کوئی عالمانہ بات کرے تو مجھے ایسے لگتا ہے جیسے خالی زبان کرتب دکھا رہی ہو، اور بات کا دل سے کوئی تعلق نہ ہو۔ معافی چاہتا ہوں۔ میرا مقصد عالموں کی دل آزاری نہیں۔ لیکن کیا کروں۔ میں ایک انجان آدمی ہوں۔ جاننے سے دل چسپی نہیں رکھتا۔ ماننا چاہتا ہوں۔ اور ماننے کا ذہن سے نہیں، دل سے تعلق ہوتا ہے۔

بابا بڑی بڑی باتیں سیدھے سیدھے لفظوں میں بیان کر رہا تھا۔

میں نے قیوم سے کہا "یار، یہ بابا کیا چیز ہے؟"

قیوم بولا "تجھے کیا لگتا ہے؟"

میں نے کہا "یار، مجھے تو جن لگتا ہے، جن۔"

اس پر بابا محفل کو متوجہ کر کے بولا "یہ آج پہلا آدمی ڈیرے پر آیا ہے جس نے ہمیں پہچانا ہے۔ کہتا ہے بابا جن ہے۔"

سب کی نگاہیں ہماری طرف اٹھ گئیں۔

قیوم زیرِ لب بولا "یار، بابا بہت سنتا ہے۔ تو اور میں مل کر بھی اتنا نہیں سن سکتے جتنا یہ سنتا ہے۔"

"تجھے پتا ہے" بابا نے منہ موڑ کر کہا "بولنا لذت ہے۔ سننا انسان کو دکھی بناتا ہے۔"

"ارے! یہ تو بڑا حاضر جواب بابا ہے" میں نے سوچا۔ پھر میں نے محفل میں پھلجھڑیاں چلانی شروع کر دیں۔ وہاں لوگ احترام کے مارے منہ سے بات نہیں کرتے تھے۔ مجھے پھلجھڑیاں چلاتے دیکھ کر سب میری طرف متوجہ ہو گئے۔ اس پر بابا بولا "بھئی، کتنی خوشی کی بات ہے کہ ہماری محفل میں ایک جلیبیاں تلنے والا آ گیا۔"

اس کے بعد میں اور بابا دوست بن گئے۔ اور بابا لٹھ لے کر میرے پیچھے پڑ گیا کہ روز حاضری دوں۔ میری حاضری کو نہ اسلام سے تعلق تھا، نہ ایمان سے، نہ روحانیت سے۔ وہ تو ایک لذتِ کلام تھی جس کی وجہ سے لوگ حیرت سے میری طرف دیکھتے اور بابا تحسین بھری نظر ڈالتا۔

اس لذّت کے لیے میں وہاں روز جانے لگا۔ چائے عام ملتی تھی۔ مفت اور بار بار۔ مہینے کے مہینے گیارہویں کے دن بابا گیارہ دیگیں پکاتا اور ہمیں بڑے پیار اور توجّہ سے کھلاتا۔

ہاں تو اس وقت تک میری زندگی میں کوئی بابا داخل نہ ہوا تھا، سوائے کوٹلا سنز کے بابا کے۔ اور اس سے بھی میں بابا کی حیثیت سے نہیں ملتا تھا۔ اُلٹا میں نے اُسے مسند سے اُتار کر اپنے پاس زمین پر بٹھا لیا تھا۔

میری بیوی میرے بابا کے ہاں جانے پر میرا مذاق اُڑایا کرتی تھی۔ میں نے اسے لاکھ بار سمجھانے کی کوشش کی کہ نیک بخت میں بابا کے پاس نہیں جاتا، کوئی منّت نہیں مانگتا، کوئی مسئلہ نہیں پوچھتا۔ نہ طلب ہے نہ مانگ۔ میں تو ایک دوست کے ہاں جاتا ہوں اور وہ بڑا اچھا دوست ہے۔ لیکن میری بیوی میری بات نہ سمجھی اور میرا مذاق اُڑاتی رہی۔

ہاں تو اس روز جب میں گھر میں داخل ہوا تو مجھے یہ خوف لاحق ہو گیا تھا کہ اگر گھر میں دورہ پڑ گیا اور میں بھیں بھیں کر کے رو پڑا تو میری بیوی کیا کہے گی۔

اس مصیبت سے خود کو محفوظ کرنے کے لیے میں سیدھا اپنے بستر میں جا گھسا اور منہ پر رضائی لے لی تاکہ بیوی کی نگاہوں سے محفوظ رہوں۔

بیوی بولی "آتے ہی بستر میں پڑ گئے۔ خیریت تو ہے؟"

میں نے کہا "کچھ طبیعت خراب ہے۔ نیند آجائے تو طبیعت بحال ہو جائے گی۔"

وہ باہر چلی گئی اور باورچی خانے میں کام کرنے لگی۔ "چلو جان چھوٹی"، میں نے کہا۔ اور چپکے سے لیٹ گیا۔ پھر خیالات آنے لگے۔ میں ڈر گیا۔ اگر دھیان اسی واقعے پر مرکوز رہا تو پھر ٹسوے کی بوتل کھل جائے گی۔ اس لیے میں نے جان بوجھ کر خیالات کا رُخ موڑا۔ ہاں تو، اب نیا افسانہ لکھوں۔ مرکزی خیال کیا ہو؟

پھر دفعتہً ایک چار دیواری دوڑتی ہوئی آئی اور میری رضائی میں گھس گئی، اور دیکھتے ہی دیکھتے میرے چاروں طرف گھیرا کر کے کھڑی ہو گئی۔ پھر ایک مرقد اُبھرا۔ مرقد پر ایک بڈھا آدمی

سر پر رُومی ٹوپی لگائے بیٹھا حقہ پی رہا تھا ۔ پھر وہ تصویر متحرک ہو گئی، گویا رضائی میں فلم چلنے لگی۔ مرقد کی تمثی قریب آ گئی ۔۔ اور قریب ۔۔ اور قریب۔ ساری رضائی سائیں اللہ بخش سے بھر گئی۔ دفعتہً ہوائی اُبھری۔ آئی، آئی۔ میں نے سوچا۔ کہیں آواز پیدا نہ ہو۔ بیوی نہ سن لے۔ میں نے رضائی مُنہ میں ٹھونس لی۔ نوں ۔۔ اوں۔ سوڈے کی بوتل کھل گئی۔

پھر جو مجھے ہوش آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ بیوی سرہانے کھڑی آپ ہی آپ بڑبڑا رہی ہے۔ "یہ رونے کی آواز کہاں سے آئی تھی؟" میں نے جھٹ خراٹے لینے شروع کر دیے۔ وہ حیرت سے بڑبڑاتی ہوئی واپس باورچی خانے میں چلی گئی۔ "یہ کون رو رہا تھا؟ عجیب رونا تھا!"

اگلے روز جب میں چائے پی رہا تھا تو وہ آ کر میرے پاس بیٹھ گئی۔ بولی "ایک بات پوچھوں؟"

میں نے کہا "پوچھ"

بولی "آپ نے بابا بدل لیا ہے کیا؟"

میں گھبرا گیا۔ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہوں۔ "بابا بدل لیا ہے!" میں نے مصنوعی حیرت سے دہرایا۔

بولی "رات مجھے خواب میں اشارہ ہوا ہے"

یہ بھی ایک حیران کُن بات ہے۔ میری بیوی روحانی دُنیا کو بالکل نہیں مانتی۔ اس کے باوجود اسے اشارے ہوتے رہتے ہیں۔ میری بیوی کو عام طور سے ادھ سوتے ادھ جاگتے میں اشارے ہوتے ہیں ۔ اور حیرت کی بات ہے کہ وہ ہمیشہ سچے ثابت ہوتے ہیں۔ جب بھی گھر میں کوئی غیر معمولی واقعہ رونما ہونے والا ہوتا ہے تو وہ پہلے ہی سے اس کی خبر دے دیتی ہے۔

اس روز جب اس نے مجھ سے بابا بدلنے کی بات کی تو میں حیران رہ گیا۔ بہرحال، اس نے مصنوعی حیرت سے پوچھا "تجھے کیا اشارہ ہوا ہے؟"

بولی "آج صبح جب میں ادھ جاگی پڑی تھی تو کیا دیکھتی ہوں کہ ایک سبز پوش بزرگ

اندر آئے۔ بولے: تیرے میاں نے جو یہ بابا اپنایا ہے، بالکل صحیح ہے۔ اس سے پہلے والا غلط تھا۔"

میں کھسیانی ہنسی ہنسا۔ میں نے کہا "یہ تمھارا وہم ہے۔"

بولی "نہیں، وہم نہیں۔ انھوں نے مجھے نیا بابا دکھایا بھی تھا۔ اس نے سر پہ رُومی ٹوپی پہنی ہوئی تھی اور وہ حقہ پی رہا تھا۔"

دفعتہً میرے سامنے وہ چار دیواری اُبھری۔ سفید ٹائلوں کے مرقد پہ رومی ٹوپی پہنے بابا حقہ پی رہا تھا۔ پھر وہ چار دیواری گھومنے لگی۔ میرے اندر ہوائی سی چلی۔ میں چھلانگ مار کر اُٹھا اور باتھ روم کی طرف بھاگا۔ یہ دیکھ کر میری بیوی ہکا بکا رہ گئی۔

وہ باتھ روم کے دروازے پر آ کھڑی ہوئی۔ بولی "خیریت تو ہے؟" میں نے اس وقت مُنھ میں اپنی قمیص کا دامن ٹھونس رکھا تھا کہ بھیں بھیں کی آواز نہ نکلے۔ کچھ دیر وہ دروازہ کھٹکھٹاتی رہی۔ پھر چلی گئی۔

جب رقت کے دورے سے فارغ ہوا تو پہلی مرتبہ میرے مُنھ سے اللہ کے حضور التجا نکلی "یا اللہ! یہ کیا ہو رہا ہے!"

پہلی مرتبہ میں نے اللہ کو پکارا۔ خدا کو نہیں، مائی گاڈ کو نہیں، اللہ کو پکارا۔

آٹھ دس روز مجھ پر یہی کیفیت طاری رہی۔ گھر والوں کو پتا چل گیا۔ دفتر والوں کو علم ہو گیا۔ وہ حیران تھے کہ مفتی کو کیا ہوا۔ ان کا خیال تھا کہ بڑے صاحب نے مجھے زچ کر دیا ہے اور میں ٹوٹ چکا ہوں۔

یہ خبر بڑے صاحب تک پہنچی۔ وہ بہت خوش ہوئے۔ غالباً وہ یہی چاہتے تھے کہ میں ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جاؤں، اور ان کے قدموں میں بچھ جاؤں۔ میری انا کو یہ گوارہ نہ تھا۔

پھر میں ملک کی طرف بھاگا۔ لیکن ملک سے صاف بات کہ دینا مجھے گوارہ نہ ہوا۔ ایک پڑھے لکھے، سمجھ دار اور معقول آدمی کے لیے یہ تسلیم کرنا کتنا مشکل ہے کہ ایک مرحوم و مغفور

بابا نے اسے یوں چھلکا کر رکھ دیا ہے، جیسے ملک شیکر کی مشین دودھ کو چھلکا کر رکھ دیتی ہے۔

میں نے کہا "ملک، یہ جو سائیں اللہ بخش ہیں، جن کے مزار پر تم مجھے لے گئے تھے، یہ کون بزرگ ہیں؟"

ملک مسکرایا اور پھر بک شیلف سے ایک کتاب اٹھا کر لے آیا۔ کتاب کا نام تھا، "مردِ قلندر"۔ ملک نے کتاب میرے ہاتھ میں تھما کر کہا "یہ پڑھ لیجیے۔ آپ کو سب پتا چل جائے گا۔"

کتاب کے سرورق پر لکھا تھا "عزیزہ ملک" "یہ کتاب تم نے لکھی ہے کیا؟" میں نے ملک سے پوچھا۔

ملک نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ کتاب پڑھنے کے بعد پتا چلا کہ سائیں اللہ بخش کو روحانیت ورثے میں ملی تھی۔ آبائی پیشہ حجام کا تھا۔ بچپن میں پہلوانی کا شوق تھا۔ نوجوانی میں ہی عشقِ الٰہی میں والہانہ طور پر محو ہو گئے۔ خود کا ہوش نہ رہا۔ طبیعت میں قلندرانہ رنگ غالب تھا۔

"مردِ قلندر" پہلا تذکرہ تھا جو میری نظر سے گزرا۔ اس میں بہت سی باتیں میرے لیے حیران کن اور ناقابلِ قبول تھیں۔ اگر ان دنوں میں اس پریشان کیفیت میں نہ ہوتا جس میں کہ میں تھا تو مردِ قلندر کے چند ایک صفحات دیکھ کر لاحول پڑھ کر اسے پھینک دیتا۔ لیکن میں تو خود حیران کن مشاہدات کے درمیان جی رہا تھا۔

مردِ قلندر کا مطالعہ کرنے کے بعد بھی کچھ بھید نہ کھلا۔ الٹا اور بھی پراسرار ہو گیا۔

پھر اتفاقاً یوسف ظفر کے گھر بھائی جان سے ملاقات ہو گئی۔ ان کا نام خواجہ جان محمد تھا۔ بھائی جان کو دیکھ کر بات اور بھی الجھ گئی۔

میرا خیال تھا کہ بھائی جان بابا ٹائپ کی چیز ہوں گے۔ مردِ قلندر کا رنگ غالب ہوگا۔ لیکن میرے رُوبرو ایک خوش شکل، دراز قامت، چاق و چوبند، معزز اور معقول شخص کھڑا تھا۔ ان کی گفتگو مسائلِ حاضرہ پر مرکوز تھی۔ نقطۂ نظر حقیقت پسندانہ تھا۔ ان کا رویہ نہایت مخلصانہ تھا اور ان کے

برتاؤ سے اخلاص و محبت چھلک رہا تھا۔

بھائی جان کی شخصیت میں مذہبی عنصر مفقود تھا۔ ان کی گفتگو میں روحانی رنگ نہ تھا۔ لیکن ان کے پاس ایک کردار تھا، اور اس کردار میں اسلامی اصول رچے بسے تھے۔ وہ غلو اور لاف زنی سے پرہیز کرتے تھے۔ منھ زبانی دعوے کرنے کے حق میں نہ تھے۔ جو کہتے تھے اسے عملی طور پر کر دکھاتے تھے۔ عالمانہ بحث کرنے سے گریز کرتے تھے۔ پند و نصیحت کرنے کے حق میں نہ تھے۔ بھائی جان کے کردار سے میں بے حد متاثر ہوا۔ یہ کیسا بزرگ ہے جو زبان سے کچھ نہیں کہتا، عمل سے متاثر کرتا ہے!

میں نے تخلیے میں بھائی جان سے شکایت کی۔ میں نے کہا "جناب، میں نے تو سرکار قبلہ کو ایک دنیاوی مشکل میں مدد کرنے کے لیے پکارا تھا۔ انھوں نے یہ کیا ظلم کیا کہ رقت طاری کر کے میری شخصیت کو ہی مسخ کر دیا۔"

میری شکایت سن کر وہ دفعتہً سنجیدہ ہو گئے۔ بولے "میں تو ان کا ایک ادنیٰ غلام ہوں۔ وہ مالک ہیں۔ جو چاہتے ہیں کرتے ہیں۔ میں ان سے پوچھنے والا کون ہوں۔ مجھے افسوس ہے کہ اس بارے میں کچھ نہیں کر سکتا۔ یہ معاملہ سرکار قبلہ اور آپ کے درمیان ہے۔ آپ خود از سرِ نو ان کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی گزارش پیش کریں۔ مجھے تو صرف اتنا علم ہے کہ حضور نے فرمایا ہے کہ مفتی اب سے آپ کا بھائی ہے۔ سو آپ کی حیثیت میرے برابر ہے اور میرے دل میں آپ کے لیے برادرانہ محبت ہے۔ میں ہر طرح بھائی کی خدمت کے لیے تیار ہوں۔"

بھائی جان سے بات کرنے کے بعد میں نے ایک عجیب سا سکون اور اطمینان محسوس کیا۔

رقت کے دورے اسی روز ختم ہو گئے اور پھر وہ معجزہ رونما ہوا جو اس واقعے کا ماحصل تھا۔ اسی روز جب میں بھائی جان سے مل کر گھر واپس جا رہا تھا تو میں نے محسوس کیا جیسے میرے اندر بہت اتھل پتھل ہو رہی ہو، جیسے اندر کا حدودِ اربعہ بدل رہا ہو۔

پھر میری نگاہ سڑک کے کنارے اُگے ہوئے درخت پر جا پڑی۔ میں نے محسوس کیا

جیسے درخت کے پتّے پتّے پر اللہ لکھا ہوا ہو۔ پھر مجھے ہالڈین کا وہ مضمون یاد آگیا "سبز پتّے کا معجزہ"۔ پھر جو میں نے نگاہ اُٹھائی تو پتّوں میں سے اللہ میاں جھانک رہے تھے۔ میں گھبرا گیا۔ میں نے نگاہ پھیر لی۔ آسمان پر ہلکے ہلکے بادل تیر رہے تھے۔ ان بادلوں سے اللہ میاں میری طرف محبت بھری نگاہ سے دیکھ رہے تھے۔ پھر جیمز جینز کی "کائنات" میرے ذہن میں تازہ ہو گئی۔ میرے روبرو کائنات اپنی تمام وسعتوں اور عظمتوں سمیت رونما ہو گئی۔ عقب میں ایک نُور اُبھرا اور دیکھتے ہی دیکھتے سمٹ کر اللہ بن گیا۔ میرے چاروں طرف اللہ ہی اللہ ہو گیا۔ زمین، آسمان، شجر و حجر، انسان، جانور ہر چیز پر سے گویا پردہ اُٹھ گیا۔ پیچھے اللہ میاں مسکرا رہے تھے۔ میرے شبہات، وسوسے، عقل، دلیل سب کی دھجیاں اُڑ گئیں۔ اللہ تعالیٰ میرے رُوبرو کھڑے تھے۔ ساری دُنیا سمٹ کر اللہ بن گئی تھی اور میں حیران کھڑا دیکھ رہا تھا، دیکھتا رہا۔ میرا رُخ بدل چکا تھا۔

اور رُخ کا یوں آپ ہی آپ بدل جانا میرے نزدیک سب سے بڑا معجزہ ہے۔

عورت اور جنسیات

جنسیات کی رُو سے جسم کا وہ حصّہ جو خواہشات پر اثر نہیں رکھتا، محض دکھاوا ہے۔
جسم سے جسم کی صرف بیرونی شکل مراد لینا اور انسان کو مرد اور عورت میں تقسیم کرنا غلطی ہے۔

ترتیب دینا بذاتِ خود محدود تصوّر کا وصف ہے، اور انسانی تخیّل کے عجز پر دال ہے۔ فطرت ترتیب سے بلند تر اور بیگانہ ہے۔ چونکہ ہمارا تخیّل محدود ہے، ہم غیر ترتیب شدہ کائنات کا احاطہ نہیں کر سکتے۔ اس لیے چیزوں کو سمجھنے کی خاطر اپنی آسانی کے لیے ہمیں ایک نہ ایک ترتیب ایجاد کرنا پڑتی ہے، اور پھر اپنے عجز پر پردہ ڈالنے کے لیے ہر اصول کے ساتھ مستثنےٰ کی کلی ٹانکنی لازم ہو جاتی ہے۔

ہمارا ایمان ہے کہ مرد اُسے کہتے ہیں جو بظاہر مرد نظر آئے، یا جس نے پگڑی باندھ رکھی ہو۔ لیکن جسم کی بیرونی شکل یا پگڑی قابلِ اعتبار نہیں۔ ڈھکے ہوئے مرتبان کو دیکھ کر ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس میں مربا ہے یا اچار، لیکن یقین سے نہیں کہہ سکتے۔ کیوں کہ چیونٹیوں کی بات پر اعتبار کر لینا درست نہیں۔ تو جسم کی بیرونی ساخت سے اندرونی خواہشات کا صرف اندازہ لگایا سکتا ہے جو کسی صورت میں یقینی نہیں ہو سکتا۔

کسی فرد کا مرد یا عورت ہونا ان خواہشات پر مبنی ہے جن کا حامل جسم ہوتا ہے۔ جنسیات کے گورکھ دھندے میں ہمیں کئی ایک باتوں کا جائزہ لینا پڑتا ہے۔ مثلاً جسم کی بیرونی اور اندرونی ساخت، آرزوئیں، شعوری اور لاشعوری، اور وہ رجحانات جو ہویدا نہیں ہوتے بلکہ تاک میں بیٹھے رہتے ہیں کہ موقع ملے تو جھپٹ کر کسی انفرادیت پر چھا جائیں۔

جنسیات کے اس اُلجھاؤ کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ہم وثوق سے نہیں کہہ سکتے کہ فلاں جنس کون سی ہے اور فلاں کون سی، اور کسی ایک جسم میں فلاں جنس کہاں سے شروع ہوئی اور کہاں ختم۔

کہتے ہیں، پُرانے زمانے میں مرد اور عورت ایک جسم میں رہا کرتے تھے۔ آثارِ قدیمہ سے برآمد کیے ہوئے بُت، سکّے اور پُرانی کتابیں اس امر کی شاہد ہیں۔ پھر نہ جانے کس بات پر دونوں کا جھگڑا ہو گیا، اور وہ اس افراتفری میں ایک دوسرے سے جُدا ہوئے کہ ایک کی کئی ایک چیزیں اور خصوصیات دوسرے کے پاس رہ گئیں۔ جبھی سے ہر جسم میں عورت اور مرد کی خصوصیات غلط ملط ہو رہی ہیں۔ ہر مرد میں ڈاڑھی مونچھ کے باوجود عورت گھونگھٹ نکالے بیٹھی ہے۔ اور ہر عورت کے گھونگھٹ تلے مرد چھپا ہُوا ہے۔ یعنی کسی فرد کے بارے میں یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ اس میں مرد کہاں ختم ہُوا اور کہاں عورت اُبھر آئی۔ مرد اور عورت کی گزشتہ لڑائی آج بھی "جنسی ضد" کی صورت میں واضح ہے۔

مرد کے جسم میں نسائیت کا نفوذ کبھی اس حد تک پہنچ جاتا ہے کہ اس میں ظاہری مرد کے علاوہ کوئی اور مردانہ وصف نہیں رہتا۔ یعنی وہ صرف مردم شماری کا مرد رہ جاتا ہے۔ ایسے زنانہ مرد اکثر دیکھنے میں آتے ہیں جنھیں دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے گویا مٹّی کی ہنڈیا میں فیس کریم رکھی ہو۔

یہ اختلاطِ جنسی صرف ذہنی اور جذباتی خصوصیات تک محدود نہیں رہتا بلکہ جسمانی اعضا تک پہنچ جاتا ہے۔ کئی ایک نردوں میں انڈے دانیاں نکلتی ہیں، اور کئی ایک ماداؤں میں خُصیے۔

عورت میں مردانہ پن عام سہی، لیکن عام طور پر اس قدر تیز نہیں ہوتا کہ اسے نسائی کردار یا تقاضے سے بے نیاز یا بیگانہ کر دے۔ غالباً اس کی یہ وجہ ہے کہ تسلسلِ حیات زیادہ تر عورت کی ذات سے وابستہ ہے۔ اور جہاں تک ہم سمجھتے ہیں کائنات کا مقصد بنیادی طور پر

تسلسلِ حیات ہی ہے۔ اس لیے عورت کا جسم براہِ راست علمِ الحیات کے اصولوں یا قانون پر چلتا ہے، جس کے احکام نفسِ غیر شاعر کے ذریعے عورت تک پہنچتے ہیں، جن پر عمل کرنے پر وہ ازلی طور پر مجبور رہے۔ اسی وجہ سے عورت کی انفرادیت اس کے عورت پن پر حاوی نہیں ہو سکتی۔ بلکہ اس کی انفرادیت کے صرف وہ پہلو نشو و نما پا سکتے ہیں جو اس کے فرضِ اعلیٰ یعنی تسلسلِ حیات میں رخنہ نہ ڈالیں بلکہ ممد اور معاون ثابت ہوں۔

یعنی مرد کی نسبت عورت پر جنسیت زیادہ غالب ہے، اور جب اس کا عمد نسائیت کو نظر انداز کرنے کی کوشش کرے تو وہ بذاتِ خود مفلوج ہو جاتا ہے اور اس کے جسم کے نقار خانے میں طوطی بن کر رہ جاتا ہے۔ کتنی بار باہیں جھٹکنے کے لیے اٹھتی ہیں اور لپٹ جاتی ہیں۔ نفرت سے کھولتا ہوا جسم اپنا آپ حوالے کر دیتا ہے۔ چہرے کی زردی چھپانے کے لیے گال شرم سے تمتا اٹھتے ہیں۔ تھکی ہاری ٹانگیں ٹھمکنے پر مجبور رہ جاتی ہیں۔

آج جب کہ عورت علمی و ادبی سے لے کر سیاسی میدان تک نہ صرف مردوں کا مقابلہ کر چکی ہے بلکہ کئی ایک شاہراہوں پر مرد سے کہیں آگے نکل گئی ہے، مرد اور عورت میں ایسے امتیازات پیدا کرنا شاید جہالت سمجھا جائے۔ اس لیے یہ بات واضح کر دینا ضروری ہے کہ اس تفریق سے میرا یہ مطلب نہیں کہ عورت ان خصوصیات کی اہل نہیں جو آج تک مرد سے منسوب ہوتی رہیں۔ بلکہ اس کے برعکس چونکہ وہ تسلسلِ حیات کی ذمّے دار ہے، جس کے لیے اسے مرد کو تسخیر کرنا ہوتا ہے، اس لیے وہ ضرورت کے مطابق اپنے آپ کو ہر سانچے میں ڈھال سکتی ہے۔

تسخیرِ مرد کے عمل میں سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ یہ قلعوں کی سی تسخیر نہیں کہ ہاتھی گھوڑے لیے آئے اور محاصرہ کر لیا۔ یا تسخیرِ غرناطہ کی طرح واپس جانے کی کشتیاں جلا دیں۔ بلکہ یہ عمل "تسخیرِ ٹرائے" سے ملتا جلتا ہے جس میں توپوں اور ہتھیاروں کی بجائے ایک خوبصورت لکڑی کے گھوڑے کی ضرورت پڑتی ہے، جسے محصورین دیوتا سمجھ کر آپ

شہر میں گھسیٹ کر لے جائیں۔

قدرت نے عورت کو صرف تسخیر کرنے پر مامور نہیں کیا بلکہ ساتھ ہی طریقۂ تسخیر بھی متعین کر دیا ہے۔ قدرت نے عورت پر زیر دستی یعنی پیسیوٹی عاید کر دی ہے ورنہ اگر وہ زبردست جنس بنادی جاتی تو شاید تسلسلِ حیات کے سوا یہاں اور کچھ دکھائی ہی نہ دیتا۔

فطری طور پر عورت یہ چاہتی ہے کہ کوئی اسے پیار کرے۔ اور پیار وہی کر سکتا ہے جو عمد کا اہل ہو۔ کیونکہ محبت کرنا فاعلی جذبہ ہے اور ایسا فعل لازم ہے جو کرنے والے سے تعلق رکھتا ہے، جس میں زیادہ سے زیادہ کسی محبوب کا ہونا لازم ہے۔ یعنی مرد عورت کے علاوہ کسی اور چیز سے بھی محبت کر سکتا ہے۔ چاہے وہ جاندار ہو یا بے جان۔ اس کے برعکس عورت کی خواہش ہے کہ کوئی اسے پیار کرے۔ یعنی وہ ایسا "محبوب" نہیں بنا سکتی جو جاندار یا فاعلی نہ ہو۔ مرد کے لیے محبوب کا صرف ہونا وصال کے مترادف ہو سکتا ہے۔ لیکن عورت کے لیے نہیں، جب تک کہ محبوب کا عمد اور آرزو اس کی طرف مائل نہ ہوں اور محبوب کو محبت کرنے پر مشتعل نہ کریں۔

مرد صرف یہ چاہتا ہے کہ عورت اپنا آپ اس کے حوالے کر دے۔ وہ اس کی نفسیت پر چھانا نہیں چاہتا۔ لیکن عورت کے لیے فقط مرد کا ہونا کافی نہیں، جب تک مرد کا عمد اور آرزو اس کے لیے وقف نہ ہو جائے۔ تو ظاہر ہے کہ عورت کے لیے مرد کا جسم مقصود نہیں بلکہ اس کا عمد اور آرزو ہے۔ دوسرے الفاظ میں وہ اس کی نفسیت پر چھا جانا چاہتی ہے۔

جب مرد کے دن موجودہ زمانے کے خود ساختہ اقتصادی جھمیلوں میں کٹ جائیں، شام تفریح گاہوں کی بھینٹ ہو جائے، اور کل کا کام سرانجام دینے کے لیے رات کو گہری نیند سونا لازم ہو جائے تو عورت بے چاری چولہا چھوڑ کر کرکٹ گراؤنڈ، کانفرنس، لیبارٹری، فیکٹری اور طیارہ گاہ میں نہ آئے تو تسخیر مرد کا کام کیسے سرانجام ہو۔ چنانچہ اس فطری فرض کو ادا کرنے کے لیے وہ اپنا میدانِ عمل وسیع کرنے پر مجبور ہے۔ اس کے علاوہ "ہر محبوب" کا

یہ فرض ہے کہ عاشق کی آرزو کو اپنی طرف متوجہ کرے۔ چاہے اس کا نظامِ آرزو بدل دے تاکہ وہ اُسے پیار کرنے لگے یا اپنے آپ کو اس نظامِ آرزو کے مطابق بنا لے تاکہ اس کے لیے جاذبِ توجہ ہو جائے۔

پنجاب میں بھی مرد کے بڑھتے ہوئے انہماک کے خلاف عورت کی صدائے احتجاج خونیں لباس کی شکل میں بلند ہو رہی ہے۔ حالانکہ عورت اس امر سے قطعی ناواقف ہے کہ سُرخ کپڑے کو دیکھ کر سانڈ کیوں جوش میں آجاتے ہیں۔ بیاہ شادی پر سُرخ جوڑے کیوں پہنے جاتے ہیں، اور مہندی لگانے کا کیوں رواج ہے۔ نہ جانے نفسِ غیر شاعر جھک کر کان میں کیا کہہ دیتا ہے کہ وہ بن سمجھے جانتی ہے اور بن جانے سمجھتی ہے۔

عورت کی قوتِ تسخیر کا یہ عالم ہے کہ وہ ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر چند ایک ان جانی حرکات کی مدد سے مرد کو دُنیائے عقل و شعور سے گھسیٹ کر دُنیائے جذبات میں لا پھینکتی ہے۔ حتّٰی کہ اس کی آنکھیں انگارہ ہو جاتی ہیں، اور جسم چنگاری۔

فطری طور پر مرد اس کھلنڈرے لڑکے کی طرح ہے جو مدرسے سے بھاگ کر باہر آوارہ پھرنا پسند کرتا ہے۔ عورت مرد کو واپس گھر لا سکتی ہے، لیکن گھر کا نہیں کر سکتی۔ اگر مرد بسا اوقات یا عام طور پر باہر آوارہ پھرے تو عورت کو بھی کرکٹ گراؤنڈ، فیکٹری یا طیارہ گاہ میں جانا ہی پڑتا ہے۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ عورت کی کرکٹ اور طیارے میں دلچسپی بالواسطہ نہیں بلکہ ایک حقیقی اور مثبت شوق ہے تو ہمیں ماننا پڑے گا کہ عورت کی فطری خصوصیات میں تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔ اس کی انفرادیت مرد کی جنسیت پر حاوی ہوتی جا رہی ہے۔ لیکن پھر بھی ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ عورت کی یہ تبدیلی کس حد تک تسلسلِ حیات سے انحراف کے مترادف ہے۔ شاید وہ مستقبل کے مرد کے ماحول اور جذبات کے مطابق پھیل رہی ہو، تاکہ آئندہ تسخیرِ مرد ناممکن نہ ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ اگر مرد گھر توڑنے کی فکر میں ہو، حیا کو نااہلیت سمجھے اور ذہنی چمک کو نسائی آب پر ترجیح دینے لگے تو عورت ہرجائیت؛

خودنمائی اور ذہانت کو نہ اپنائے تو کیا کرے۔

توارث کے موجودہ نظریے کے مطابق مرد کی ترتیب مخلوط سمجھی جاتی ہے، اور عورت کی مفرد۔ مثلاً اگر مرد ع ک ہے تو عورت ع ع۔ عورت کے کسی موروثی رجحان یا خصوصیت سے اثر پذیر ہونے کے لیے لازم ہوگا کہ وہ خصوصیت دونوں ع پر موجود ہو، ورنہ صرف ایک ع پر موجود ہونے کی صورت میں وہ خصوصیت اس پر حاوی نہ ہوگی بلکہ مخفی ہوگی۔ وہ بذاتِ خود اس خصوصیت سے متأثر نہ ہوگی بلکہ اسے اپنی نرینہ اولاد میں بانٹ سکے گی۔ جیسے مچھر بذاتِ خود ملیریا کا مریض نہیں ہوتا لیکن اس مرض کو پھیلاتا ہے۔ اس کے برعکس مرد میں توارثی رجحان مقابلتہً ہویدا ہو جاتا ہے تو ظاہر ہُوا کہ عورت میں مرد کا نفوذ چاہے کسی حد تک ہو، وہ مقابلتہً عورت کے فرائضِ جنسی سے گریز نہیں کر سکتا۔ عورت میں نسائیت کا عنصر دوسرے عناصر سے غالب تر ہے، اور مرد کی تسخیر اس کا سب سے بڑا دوامی اور غیر شعوری جذبہ ہے۔ باقی اوصاف مثلاً حیا، زیردستی، نزاکت وغیرہ جو اسے تسخیر میں مدد دیتے ہیں، بالواسطہ ہیں، جو حالات اور ضرورت کے مطابق بدل دیے جا سکتے ہیں۔ تاریخ اس حقیقت کی شاہد ہے کہ یہ ضمنی خصوصیات فیشن کے مطابق ادلتی بدلتی رہی ہیں۔

کہتے ہیں، پُرانے زمانے میں، جب بے حجابی کا دور دورہ تھا، مرد عورت کی بے باکی سے اُکتا گیا۔ اس کے جنسی جذبات آزاد جنسی ماحول اور روزمرّہ اشتعال کی وجہ سے اس قدر ٹھنڈے پڑ گئے کہ کسی بے حیا عورت نے ضرورتِ وقتی کے ماتحت اسے از سرِ نو اُکسانے کے لیے حیا ایجاد کر لی، جس طرح برہنگی کے زمانے میں کسی چالاک اور بے حیا نے کپڑے ایجاد کیے تھے۔ تو ظاہر ہُوا کہ کوئی خصوصیت، چاہے ہم اسے نسائیت کا جزوِ لاینفک ہی سمجھتے ہوں، بذاتِ خود نسائیت سے اہم نہیں ہو سکتی۔ بلکہ نسائیت کے اہم ترین مقصد، تسخیرِ مرد، کے تحت رہتی ہے۔ اگر آج عورت زیردستی چھوڑ کر غالبیت اختیار کر لے تو بھی تعجب کی بات نہ ہوگی۔ کیونکہ شاید ضرورتِ وقت ایسی ہو۔ بہر حال، دیکھنے میں آتا ہے کہ

آج کل مرد میں زیردستی بڑھ رہی ہے اور مقابلۃً عورتیں بے باک ہو رہی ہیں۔ عورت کی ادنیٰ ترین تبدیلی، چاہے وہ لباس سے تعلق رکھے یا انداز سے، مرد کی کسی چھپی ہوئی یا نمایاں آرزو کا پرتو ہوتی ہے۔ اس کے برتاؤ کی کمترین تفصیل بھی اس کے دل کی عمیق ترین گہرائیوں میں وضع ہوتی ہے۔ اسی بات پر نہ جانے کس نے بحث کا اختتام کرتے ہوئے کہا تھا:

"بیگم صاحبہ، آپ نے بالکل بجا فرمایا۔ عورت لطیف اور رنگین تر مخلوق ہے اور مرد بھدی مخلوق۔ لیکن مرد کے نظامِ آرزو پر عورت حاوی ہے اور عورت کی خواہشات پر مرد حاوی ہے۔ یعنی مرد کی خواہشات ان تمام تر لطافتوں اور رنگینیوں سے معمور ہیں جو عورت سے وابستہ ہیں، اور عورت کی آرزوؤں پر مردانہ بھدّا پن چھایا ہُوا ہے۔"

"حیات" کے پیام یا احکامات لاشعور کے ذریعے نشر ہوتے ہیں، جو عزم اور عہد کا مرکز اور منبع ہے اور جس میں ایسی گہری حیاتی قوّتیں موجود ہیں جو ماحول اور وقت سے قطعی بے نیاز ہیں۔ چونکہ "حیات" کو براہِ راست عورت سے زیادہ گہرا تعلق ہے، اس لیے عورت کی زندگی زیادہ تر نفسِ لاشعور کی مدھم تال پر چلتی ہے۔ انسانی عقل صرف وہی بات سمجھ سکتی ہے جس میں کوئی نظام دکھائی دے، اور جو ماحول سے تعلق رکھے۔ شاید اسی لیے عورت کا برتاؤ آج تک ناقابلِ فہم سمجھا گیا اور اسے ابوالہول سے تشبیہہ دی گئی، جس کا جسم انسانی اور حیوانی اعضا سے مخلوط ہے۔

عورت کی نفسیت اس شخص کی سی ہے جو دو رُخے مزاج کے عارضے کا شکار ہو، کیونکہ اس کی نفسیت پر کبھی انفرادیت حاوی ہوتی ہے اور کبھی نسائیت۔ لیکن عورت کو اپنے دو رُخے پن کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ کیونکہ نسائیت کا رُخ لاشعوری اثر رکھتا ہے اور انفرادیت کا شعوری۔ نسائیت کے رُخ کو لاشعوری رکھنے کا مقصد اسے تلخی، انفعال اور پشیمانی سے محفوظ کر دیتا ہے کیونکہ قدرت کہیں کہیں توّت اور وقت کے بیجا تصرّف سے احتراز کرتی ہے۔ اس کے علاوہ شعوری حرکات میں وہ رس نہیں ہوتا۔ اگر اسے احساس ہو کہ وہ تسخیر کر رہی

ہے ، ہر مسکراہٹ پر جان لے کر ہونٹوں کی مدد سے مبہم وعدے کر رہی ہے یا ویسے ہی بنی نوعِ انسان کو جینے کی ترغیب دے رہی ہے اور جینے کے سیدھے سادے عمل میں رنگ بھر رہی ہے، تو یا تو وہ اس فطری پابندی کی قید کے خلاف بغاوت کر دے اور یا مروجہ اخلاق کے زیرِ اثر اس قدر پشیمان ہو کہ احساسِ گناہ سے دب کر رہ جائے، یا شایدان دمنی پابندیوں کو چھوڑ کر اپنے فطری فرض کو علانیہ اپنا لے۔ ہر صورت میں توازن قائم نہ رہ سکے گا جو بڑی حد تک مرد عورت کے مقدس ملاپ کو قابلِ آرزو بنانے کا ذمے دار ہے۔

پریم ساتھی ہونے کے باوجود مرد اور عورت دو اجنبی ہیں، جو ایک دوسرے کے ساتھ رہتے ہیں اور ایک دوسرے کے لیے پیغام اور دعوتِ حیات بن جاتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود مکمل طور پر ایک دوسرے سے واقف نہیں ہوتے بلکہ چاند کی طرح صرف ایک پہلو پیش کرتے ہیں۔

عورت کا اہم ترین مقصد تسخیر ہے، اور وہ اس مقصد کو پیش پیش رکھتی ہے تو مرد کا صرف وہ پہلو دیکھتی ہے جو تسخیر ہونے سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ اپنے اس مقصد سے بے نیاز اور بے واسطہ ہو کر نہ تو دُنیا کو دیکھ سکتی ہے، نہ اپنے آپ کو۔ ہاں، اپنے بچّے کو دیکھ کر اسے بے لاگ خوشی ہوتی ہے، جیسے کوئی راہی منزلِ مقصود پر پہنچ گیا ہو۔

خوشی حاصل کرنے کے لیے تلخ حقائق سے مُنھ موڑ لینا تو مرد اور عورت دونوں میں موجود ہے لیکن مرد حقائق سے زیادہ دیر تک جی نہیں چُرا سکتا بلکہ جلد ہی ناخوشگوار حقائق کے خلاف جدوجہد کرنا شروع کر دیتا ہے یا کم از کم ان کے وجود کو تسلیم کر لیتا ہے۔ لیکن عورت عمر بھر اپنی خیالی دُنیا میں بسر کر سکتی ہے، کیونکہ اس کا تصوّر اس قدر مکمل ہوتا ہے کہ ہر متصورہ بات اس کے احساسات پر واضح اثر چھوڑ جاتی ہے، جیسے کہ حقیقی مشاہدہ۔ بلکہ اگر وہ حقائق سے بے نیاز رہنے کا فیصلہ کر لے تو کوئی حقیقت، چاہے وہ رُوبرو ہی کیوں نہ ہو، اس کے احساسات پر اثرانداز نہ ہو سکے گی۔

لڑکے کو مرد بننے تک گرگٹ کی طرح کئی ایک رنگ بدلنے پڑتے ہیں۔ لیکن لڑکی پیدا ہوتے ہی مکمل عورت ہوتی ہے۔ اگرچہ بلوغت اس کے نسائی انداز میں رنگ بھر دیتی ہے اور ان غیر شعوری رجحانات کو جو پہلے ہی سے موجود ہوتے ہیں، نمایاں کر دیتی ہے۔

ابتدا میں لڑکے میں نسائی جھلک ہوتی ہے۔ لیکن اس کے برعکس عورت بڑھاپے میں مردانہ خصوصیات پیدا کر لیتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ نسائیت ایک ایسا عنصر ہے جو پھول کی خوشبو کی طرح اُڑتا رہتا ہے۔ حتیٰ کہ ایک عمر میں عورت صرف دیکھنے کی عورت رہ جاتی ہے۔ اس وقت اس میں نسائیت مدھم پڑ جاتی ہے اور ساتھ ساتھ انفرادیت اُبھرتی آتی ہے۔ بڑھاپے میں عورتوں کے ڈاڑھی مونچھ تک نکل آتی ہیں۔ مزاج میں مردانہ درشتی، شدید انانیت اور بے نیازی پیدا ہو جاتی ہے۔

تاریخ ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ حاکم عورتیں بڑھاپے میں مردانہ وار حکومت کرتی رہیں۔ شاید ملکہ الزبتھ اور میری سکاٹ اسی لیے دو مختلف قصے ہیں کیونکہ الزبتھ میں انفرادیت تھی اور میری نسائیت کے رنگ میں بھیگی ہوئی تھی۔

کسی چھوٹی بچی کو "تا" کا کھیل کھیلتے ہوئے دیکھیے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسے کھیل نہیں سمجھتی۔ کیونکہ زندگی میں "تا" اس کے لیے سب سے بڑی حقیقت ہے۔ بلکہ حقیقت میں زندگی اس کے لیے ایک مسلسل "تا" ہے۔ صرف اس کی زبان ہی "تا" نہیں کہتی بلکہ تمام جسم اس دلچسپ عمل میں زبان کا ساتھ دیتا ہے۔ لڑکا اس کھیل میں اس قدر دلچسپی نہیں لیتا۔ اس کی چالاک مسکراہٹ سے ظاہر ہوتا ہے جیسے وہ مذاق کر رہا ہے۔ لڑکے کو ایسے کھیل پسند ہیں جس میں کسی کو ستانے، دق کرنے اور پیٹنے کا موقع ملے۔

اگر "تا" کے کھیل میں لڑکی کا ساتھ نہ دیا جائے تو وہ سچ مچ روٹھ جائے گی۔ اس کی "تا" والی نگاہ میں بچوں کا کھیل نہیں بلکہ دیدہ بیتا کی جھلک نظر آتی ہے۔ تعجب کی بات ہے کہ جس قدر "حیا" کا اظہار آٹھ نو سال کی بچی میں پایا جاتا ہے، بالغ لڑکی میں نہیں ہوتا۔ شاید

اس عمر میں قدرت انھیں مشق کرنا سکھاتی ہو یا بلوغت میں خواہ شرما جانا عریاں اپیل کا احساس دیتا ہو۔

آٹھویں یا نویں سال میں بچیاں اس بات پر مصر ہوتی ہیں کہ انھیں مکمل عورت مان لیا جائے۔ وہ بڑی لڑکیوں کی حرکات و سکنات کو غور سے دیکھتی ہیں، اور ان کی سی باتیں اور انداز پیدا کرنے کی کوشش میں لگی رہتی ہیں۔ ایسا ظاہر ہوتا ہے جیسے انھیں بالغ لڑکیوں کی برتری کا احساس ہے۔ وہ خود کو یقین دلانا چاہتی ہیں کہ وہ بالغ ہیں۔ ان سے محبت کی جا سکتی ہے۔ اس لیے وہ بے تحاشا جھینپتی ہیں۔ اپیل کی مشق کرنے کے لیے عام طور پر وہ کسی بڑے مرد کو چنتی ہیں۔ شاید اس لیے کہ ان کی عمر کے لڑکے اس بارے میں بے حس ہوتے ہیں۔ ان کی حرکات کچھ ایسی ہوتی ہیں جن سے ظاہر ہو "اب تو میں جوان ہوں" یا "میں سب جانتی ہوں"۔ حتیٰ کہ دیکھنے والا بزرگ پریشان ہو جاتا ہے اور پھر جان چھڑانے کے لیے ہنس کر کہتا ہے "یہ بچے! ـــــ بے چارے معصوم"!

چونکہ عورت کا برتاؤ زیادہ تر مرد کے لیے وضع ہوتا ہے، اس لیے ضروری ہے کہ وہ مرد یا محبوب کی پسند کے مطابق ہو۔ چونکہ ہر جگہ کے مرد ایک سے نہیں ہوتے، اس لیے ہر جگہ علیحدہ انداز اپیل پیدا کیا جاتا ہے۔ مثلاً یورپ میں، جہاں آج کل ذہانت کا دور ہے، عورتیں اپنے انداز اور جذبات میں ذہانت کی جھلک پیدا کرنا جان چکی ہیں اور ذہانت کی گہرائیوں میں جائے بغیر ایک خوبصورت ذہین انداز پیدا کرنے میں کمال حاصل کر چکی ہیں۔ حتیٰ کہ ایک بیسوا بھی اپنے اجنبی ملاقاتی کو ہمدردی کا احساس دے کر اس مختصر ملاپ میں ذہنی رفاقت کا طلسم پیدا کر دیتی ہے۔ اس کے برعکس، شاید اس لیے کہ پاکستانی مرد غم خور عاشق کا پارٹ ادا کرنے سے خوش ہوتا ہے، پاکستان کی عورت بے نیازی اور لاپروائی کی اپیل پیدا کرتی ہے۔ لیکن حالات بدل رہے ہیں۔ پہلے وفا اور عزت کی اپیل پیدا کرنا لازم تھا، جس پر بے نیازی کا سہاگا خوب رہتا تھا، لیکن اب مغربی نقطۂ نظر حاوی ہوتا جا رہا ہے۔ اگرچہ

ابھی مغربی اپیل کی خوبیاں پورے طور پر دیکھنے میں نہیں آتیں۔ چونکہ عورت اور مرد کو مل بیٹھنے کی اجازت نہیں، اس لیے یہاں کی لڑکی اپیل کے ان طور طریقوں سے محروم ہے جو رُو برو بیٹھ کر عمل میں لائے جا سکتے ہیں۔ مثلاً گاڑی یا موٹر میں بیٹھ کر وہ ہچکولوں کے پردے میں بار بار ایک دوسرے سے ٹکرانے یا لمس کا احساس دینے کی اپیل پیدا نہیں کر سکتیں، اور سامنے بیٹھ کر گفتگو کرنے کی اپیل سے قطعی محروم ہیں۔ اس لیے ان کی اپیل زیادہ تر چھپ جانے، گھونگھٹ نکال لینے، شرما جانے اور جھینپ جانے تک محدود رہی۔ ظاہر ہے کہ جن قیود میں انھیں تحفظ کے لیے ڈالا گیا، انھوں نے ان ہی قیود اور رسومات کو اپیل کا ذریعہ بنا لیا تاکہ وضع داری کی وضع داری رہے اور اپیل کی اپیل۔ اس کے علاوہ آہستہ آہستہ کئی اور اندازِ اپیل پیدا ہوتے گئے۔ چنانچہ لڑکیوں نے اس سلسلے میں چھوٹے بچّے کے وجود کو بہت مفید مطلب پایا۔ کیونکہ وہ دور کھڑی ہو کر بچّے کو کھلانے کے بہانے اسے چھاتی سے لگا سکتی تھیں اور اس کا مُنھ چُوم سکتی تھیں۔

عورت کا برتاؤ، حرکات، انداز، فیشن، لباس اور شاید اخلاق بھی اپیل کی حیثیت رکھتا ہے۔ کبھی گاؤن ٹخنوں تک لٹک جاتے ہیں اور کبھی گھٹنوں تک سُکڑ کر پنڈلیاں عریاں کر دیتے ہیں۔ آستینیں ناخنوں تک ڈھلک آتی یا مونڈھے اور گلا ایک ہو جاتا ہے۔ بُرقع الاسٹک کی طرح سُکڑ کر خم و پیچ واضح کرنا شروع کر دیتا یا سیاہ ہو کر گورا رنگ نمایاں کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ مغرب میں پیٹ بھرنے والا کھانا گھر کھایا جاتا ہے اور حسین حرکات والا محفل میں۔ شاید مشرقی عورت کا مذہب اور خدا بھی پاکیزگی کی اپیل کا ایک ذریعہ ہو۔ مغرب میں تو عورتوں کے خیالات، سوشلزم اور ذہنی چمک محض اپیل کا انداز ہیں۔

یونانی تہذیب کے زمانے میں عورت کا بھرا ہوا جسم خوبصورت سمجھا جاتا تھا تو عورتیں مٹیار ہوتی گئیں۔ آج کل پتلے جسم کو خوبصورت سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے عورتیں دُبلا پتلا ہونا سیکھ رہی ہیں۔ یورپ کے مردوں نے پیروں کی خوبصورتی کی طرف توجّہ دی تو یک دم پاؤں کی

حفاظت کرنا فیشن میں آگیا۔ اُونچی ایڑی سے پاؤں کا خم نمایاں رکھا جانے لگا لیکن اس سے یہ قباحت نکلی کہ پنڈلیاں موٹی ہوگئیں۔ اب نہ جانے انھیں سڈول کرنے کے لیے کیا طریقہ استعمال کیا جائے گا۔

پاکستان میں آج کل عورت کے لیے مساوی حقوق کا علَم بلند ہو رہا ہے۔ جہاں تک شرعی اور سیاسی حقوق کا تعلق ہے، شاید مساوات ممکن ہو، لیکن مرد اور عورت کے جنسی تعلقات میں مساوات ممکن نہیں۔ عورت کا محبوب صرف وہ ہو سکتا ہے جو ذاتی عمد کا اہل ہو۔ عورت کی خواہش مرد کے عمد کو تسخیر کرنا ہے، جسم کو نہیں۔ اور اسے بذاتِ خود حصول سے اس قدر دلچسپی نہیں جس قدر کہ عملِ حصول سے۔ اگر مرد محبّت میں اپنی انفرادیت اور عمد کھو دے تو ظاہر ہے کہ عورت کے لیے اسے تسخیر کرنا بے معنی ہو جائے گا۔ اس لیے وہ ایسے محبوب میں چنداں دلچسپی نہ لے گی۔ چنانچہ مرد کے لیے عورت سے اس قدر محبّت کرنا جس میں اپنا آپ کھو جائے، خودکشی کے مترادف ہے۔ عورت سے محبّت کرنے میں صرف وہی فرد کامیاب رہتا ہے جو تسخیر ہونے پر آمادہ دکھائی دے، لیکن مکمل طور پر مسخر نہ ہو، یا کم از کم ایسا اثر پیدا کر سکے جس سے ظاہر ہو کہ اس کا ایک نہ ایک حصّہ ابھی قابلِ تسخیر ہے۔ ان حالات میں عورت صرف اسی کا ہونا گوارا کرے گی جسے وہ اپنے آپ سے بلند تر سمجھے گی۔

بہرحال، ایسی صورت میں عورت اور مرد میں صرف دو ممکن تعلّقات قائم ہو سکتے ہیں۔ یا تو مرد غالب ہو گا یا مغلوب۔ لیکن یہ واضح کر دینا بھی ضروری ہے کہ عورت کو مغلوب کر لینے کے بعد بھی مرد اس سے محبّت کر سکتا ہے (بلکہ شاید وہ مغلوب سے زیادہ محبّت کرتا ہے) لیکن مغلوب ہونے کے بعد عورت اسے پُرانے کھلونے کی طرح پھینک دے گی اور پھر اس میں قطعی طور پر دلچسپی نہ لے سکے گی۔ شاید اسی وجہ سے عورت اور محبّت میں ایک تباہ کُن کش مکش پیدا ہو چکی ہے۔ اسی لیے تو کہا جاتا ہے کہ عورت سائے کی طرح ہے۔ تم اس کا پیچھا کرو تو وہ دُور بھاگے گی، اور تم دُور بھاگو تو پیچھے پیچھے آئے گی۔ اس ضد کی وجہ سے

جو جو پیچیدگیاں اور دلچسپیاں پیدا ہوتی ہیں وہ تو آپ جانتے ہی ہیں۔ بہر حال، اس کی محبت میں اپنا آپ کھو دینا اپنی شخصیت کے پروں کو جلا دینے کے مترادف ہے۔ ایسا فرد ترس کے سوا اس سے کچھ اور حاصل نہیں کر سکتا۔

مرد کی ذہنیت ایک سیدھے سادے دہقان کی سی ہے، جسے آپ چودھری کہ کر جو جی چاہے کروالیں۔ اپنی خدمت میں لگا رکھیں تو بھی مضایقہ نہیں۔ مرد کو کوئی چودھری کہے تو وہ سمجھتا ہے کہ اسے چودھری تسلیم کر لیا گیا ہے۔ اسے یہ نہیں سوجھتی کہ آیا اس سے چودھری کا سا سلوک بھی ہو رہا ہے یا نہیں۔ عورت نے صدیوں مرد کے ساتھ رہ کر اس کی نفسیت کو پالیا ہے اور وہ چودھری صاحب کو چودھری کہنے میں ذرا تامل نہیں کرتی۔

نظرِ غائر سے دیکھا جائے تو مساوی حقوق دو مختلف جنسوں کے لیے بذاتِ خود سب سے بڑی بے انصافی ہوگی۔ اوّل تو مساوات میں توازن ممکن ہی نہیں۔ اگر ممکن بھی ہو تو مساوات توازن پیدا نہیں کر سکتی۔ کیونکہ توازن صرف "جس کا کام اسی کو ساجے" کے اصول پر قائم ہو سکتا ہے۔

عورت کے جسم میں جنسی خواہشات صرف جنسی اعضا میں مرکوز نہیں، جیسے کہ مرد کے جسم میں۔ یعنی مرد کی جنسی زندگی روزمرّہ زندگی سے مختلف چیز ہے۔ اگر مرد کی عام زندگی کو ایک اندھیری سڑک تسلیم کر لیا جائے تو اس کی جنسی آرزو وہ مدّھم بتّیاں ہوں گی جو یہاں وہاں دُور دُور چمکنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ لیکن عورت کی جنسی اور روزمرّہ زندگی میں کوئی فرق نہیں۔ عورت میں جنسی پہلوئیں چاروں طرف پھیلا ہوا ہے۔ جیسے صبحِ صادق کا اُجالا یا کسی جدید سینما ہال میں روشنی، جہاں بتّیاں دکھائی نہیں دیتیں۔ اسی وجہ سے عورت کی زندگی اُس وقت شروع ہوتی ہے جب اس کا بیاہ ہو جائے۔

نہ جانے یہ خیال کیسے عام ہو گیا کہ عورت کے لیے مرد کا اظہارِ محبت چند مخصوص جسمانی حرکات تک محدود ہے۔ اگر یہی بات مرد کے لیے کہی جائے تو زیادہ موزوں ہوگی۔

اس کے برعکس عورت اس بات کی خواہاں ہے کہ اسے ایسے محبت بھرے ماحول میں رہنے کی خوشی حاصل ہو جس کا تسلسل دوامی ہو۔ اگر چناؤ ممکن ہو تو وہ کسی کی محبوبہ بننے کو تیار نہ ہوگی، بلکہ ایسا جیون ساتھی تلاش کرے گی جو مردانہ خصوصیات کا حامل ہو۔ لیکن مشاہدے میں آیا ہے کہ مردانہ سیرت کو مردانہ جسم پر ترجیح دی جاتی ہے، اور محبت کی مدھم لَو کو طوفانی جذبے سے بہتر سمجھا جاتا ہے۔ اگر عورت کو اپنے چناؤ یا پسند کا ساتھی نہ ملے تو یا تو وہ خیال کے زور سے اسے ویسا ہی دیکھنا شروع کر دیتی ہے یا اپنے خیالی محبوب میں اس قدر کھو جاتی ہے کہ حقیقی ساتھی کو دیکھنے تک کی تکلیف گوارا نہیں کرتی۔

مرد فاعلی فرد ہے، یعنی اس کی زندگی "کرنا" کے مترادف ہے۔ اس کی خوشی اسی بات میں ہے کہ وہ کچھ کرتا رہے۔ جدّ و جہد کرے یا روٹی کمائے یا قوم اور ملک کی خاطر جان دینے پر آمادہ ہو جائے۔

اب غم اور خوشی کو لیجیے۔ غم اور خوشی دو کیفیتیں ہیں، جنھیں فعل سے تعلق نہیں۔ اس لیے عورت خوشی اور غم کو حقیقی طور پر جانتی ہے اور مرد مقابلۃً ان سے بیگانہ ہے۔ مرد کے لیے زندگی افراتفری یا ہماہمی کے مترادف ہے۔ درحقیقت مرد کو کچھ کرنے یا سرانجام دینے کے فعل سے دلچسپی ہے۔ تو جب تک کشمکش میں لگا رہے گا اُسے احساس رہے گا کہ وہ خوش ہے۔ لیکن عورت میں خوشی کا احساس بالواسطہ نہیں بلکہ مثبت جذبہ ہے۔ وہ خوشی سے یوں لُطف اندوز ہونا چاہتی ہے جیسے بکری جگالی کرنے سے۔ اس کے برعکس مرد کو خوش رہنے کا احساس ہُوا تو معاً بیٹھ رہنا اس کے لیے ناممکن ہو گیا۔ اُٹھ بیٹھا "چلو پک نک پر چلیں، کبڈی کھیلیں، سینما دیکھیں۔" نتیجہ یہ ہُوا کہ آپ کسی اور کام میں کھو گئے۔ خوشی کے احساس کی جگہ فعل نے لے لی۔

اب غصّے کو لیجیے۔ غصّہ ایک فعلی جذبہ ہے جس میں جی چاہتا ہے کہ کچھ توڑ پھوڑ دیں۔ کوٹھے سے کود پڑیں یا چینی کی طشتری اُٹھا کر دیوار سے دے ماریں۔ یہ خالص مردانہ جذبہ

ہوا جس سے عورت بیگانہ ہے۔ ہاں، انتقام ایک مسلسل کیفیت کا نتیجہ ہو سکتا ہے۔ اس لیے اس کی اہلیت عورت میں زیادہ ہے۔ اگرچہ عام طور پر بخش دیتی ہے۔

جنسی تعلقات میں مرد کی خوشی صرف دو لوبے تک محدود ہے، جسے تلذّذ کہتے ہیں۔ اور وہ بھی صرف اسی وقت تک رہتی ہے جب تک کہ توجّہ کی کیفیت ہے۔ لیکن عورت کے دل میں خوشی کا مدوجزر لہروں کی طرح مدھم اور دوامی ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ مرد کو جنسی تعلقات میں اس لیے خوشی ہوتی ہے کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ وہ عورت پر غالب ہے یا اس کی خوشی کا باعث ہو رہا ہے، اور بس۔

جہاں تک جینے کا جذبات سے تعلق ہے، عورت جیتی ہے اور زندگی کی ہر خوشی اور دُکھ کو ایک مادّی چیز کی طرح محسوس کرتی ہے۔ جہاں تک جینے کا کرنے سے تعلق ہے، مرد جیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ کیفیتی لُطف میں دوام ہے۔ شاید جبھی مہاتما بدھ نے نروان کی عظمت اور خوشی کو محسوس کیا۔ نہ جانے مہاتما جی میں کس حد تک عورت جی رہی تھی۔

جغرافیائی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو استوائی مرد اہلِ مغرب کے مقابلے میں زیادہ کیفیتی ہیں، اور اہلِ مغرب مقابلۃً زیادہ فعلی۔ استوائی علاقوں میں اِس تگ و دو کو تصوّر میں بھی نہیں لایا جا سکتا جو یورپ میں ہر سمے پیش پیش رہتی ہے۔ کیونکہ ان علاقوں میں نباتاتی افراط کو دیکھ کر یوں احساس ہوتا ہے جیسے قدرت آپ ہی آپ آکر آٹا گوندکر روٹی پکا کر چنگیر میں رکھ جائے گی۔ شاید اسی لیے تقدیر کا مسئلہ استوائی علاقوں پر حاوی ہے لیکن اہلِ مغرب تقدیر پر شاکر رہ کر بھوکوں مرنے سے گھبراتے ہیں۔ نروان کا مسئلہ صرف استوائی علاقوں میں ظاہر ہو سکتا تھا، ٹھنڈے ممالک میں نہیں۔

بہرحال، مرد فعلی انسان ہے اور اس کی زندگی ایک جذبے کے ماتحت نہیں گزر سکتی۔ اس کے نزدیک جذبہ کیفیت نہیں، بلکہ ایک ایسی عملی تحریک ہے جو اسے اُٹھا کر بٹھا دے اور کچھ نہ کچھ کرنے پر مائل کر دے۔ اسی لیے مرد تغیّر پسند ہے، ہرجائی ہے اور متلون مزاج

ہے۔ اس کے لیے زندگی جلنا ہے یا جلنا بجھنا اور پھر جل جانا۔ تاکہ پھر بجھ کر پھر جلنے کا امکان رہے۔ لیکن عورت ایک جذبے کے تحت جی سکتی ہے۔ وہ بیٹھے بیٹھے جی سکتی ہے، اور جینے کی کیفیت پر حاوی ہے۔ اس کے نزدیک خوشی اور غم سردی اور گرمی کی سی مثبت اور مخصوص کیفیتیں ہیں، جنھیں وہ یوں محسوس کر سکتی ہے جیسے بلّی پر ہاتھ پھیر کر نرمی محسوس کی جا سکتی ہے۔ وہ سلگنا جانتی ہے، جلنا نہیں۔ البتہ وہ جل جانے کو بجھنے پر ترجیح دے گی۔

لوک گائک

طفیل نیازی

غالباً ۱۹۶۳ء کی بات ہے، جب میں نے پہلی مرتبہ طفیل نیازی کو سُنا۔

میں ایک قلم مزدور ہوں۔ مجھے بہُت کچھ لکھنا پڑتا ہے۔ کچھ ہانڈی روٹی کے لیے۔ کچھ ذہنی عیاشی کے لیے۔ ان دنوں میری عادت تھی کہ ریکارڈر پر کوئی ٹیپ لگا لیتا اور پھر لکھنے میں مصروف ہو جاتا۔ موسیقی کے زور پر لکھتا رہتا۔ اس سے یہ اندازہ نہ لگا لیجیے گا کہ میں موسیقی سُننا جانتا ہوں۔ اُونہوں! یہ بات نہیں۔ میں موسیقی سے قطعی طور پر انجان ہوں۔ البتہ موسیقی سے شدت سے متاثر ہوتا ہوں۔

ایک روز میرے بیٹے عکسی نے مجھے ایک ٹیپ دیا۔ کہنے لگا "ابُو، یہ ٹیپ سُنو"۔ ٹیپ لگا کر میں لکھنے لگا۔ لکھتے لکھتے دفعتہً میں چونکا۔ ارے! مجھے ایسے لگا جیسے کوئی حبشی دُکھ اور مظلومیت پر کراہ رہا ہو۔ پکار رہا ہو۔

اُن دنوں طفیل نیازی کی آواز میں اُڑان تھی، پُکار تھی، دُکھ تھا، کرب تھا۔

گیت کے بول بھی عجیب سے تھے:

بول مٹّی دیا باویا وے   تیرے دُکھاں نے مار مُکا لیا
وے میرا سانول ماہی   آجا ہو او او۔ آجا ہو او او

ویسے تو میں سمجھتا ہوں کہ موسیقی بول سے بے نیاز ہے۔ ہاں، شوقین مزاج لوگوں نے اپنا دل خوش کرنے کے لیے زبردستی بولوں کو اہمیت دے رکھی ہے۔ آج کل وہ غزلیں سُنتے ہیں اور بولوں پر سر دھنتے ہیں۔ اور گائک اس بات پر بُرا نہیں مانتا۔ غزل

گانے والوں کو یہ احساس ہی نہیں رہا کہ بول، دُھن اور آواز میں ربط کا ہونا ضروری ہے۔ بول اور دُھن میں بے ربطی عام ہو چکی ہے۔ بول روتا ہے، دُھن چٹکیاں بجاتی ہے۔ یا دُھن آہیں بھرتی ہے اور بول ناچ ناچتا ہے۔

غزل کی گائکی میں بھلا ربط کیسے پیدا ہو جب کہ غزل کے ہر شعر کا موڈ گرگٹ کی طرح رنگ بدلتا ہو۔

اس روز طفیل کی دُھن اور بولوں میں بلا کی ہم آہنگی تھی۔ اس لیے بول میں جان پڑ گئی۔ مجھے ایسے لگا جیسے کوئی مجھ سے پُوچھ رہا ہو کہ :

بول، اے مٹی کے بنے ہوئے پُتلے۔ یہ تُو نے کیا کیا کہ اپنی زندگی کے معاملات کو اپنے ہاتھوں اُلجھا کر خود کو دُکھی بنا لیا؟ تیرا دُکھ ہم سے دیکھا نہیں جاتا۔ بول ہمارے پیارے ماہی، بول۔ یہ تُو نے کیا کیا؟ ہٹا، چھوڑ اِن اُلجھنوں کو۔ ہمارے دوار پہ آ کھڑا ہو۔

اس ہم آہنگی نے میرے رُوبرو ایک عظیم سچائی کو لا کھڑا کیا۔

پھر یہ بھی تھا کہ ان دنوں مجھے نیا نیا عشق لگا تھا۔ ایک اَن جانا، انوکھا عشق۔ سامنے نہ محبوب تھا، نہ وصال تھا، نہ فراق تھا۔ خالی لگن ہی لگن تھی۔

زندگی بھر میں نے کئی ایک محبوباؤں سے عشق کیا تھا۔ زندگی بھر خواہش کی انگیٹھی سُلگا کر بیٹھا اسے پنکھا کرتا رہا تھا۔ زندگی بھر میں بڑی محنت سے جگہ جگہ عشق لگاتا رہا۔ لیکن یہ عشق قطعی طور پر مختلف تھا۔ یہ عشق میں نے نہیں لگایا تھا۔ لگ گیا تھا۔ پتا نہیں، کیوں، کیسے۔ اس روز طفیل نیازی کے گیت نے ایک کیفیت پیدا کر دی۔ ایک سرشاری۔ یوں جیسے مٹی کا باوا کسی دوار پہ جا کھڑا ہوا ہو۔

صرف ایک گیت کی بات نہیں۔ اس ٹیپ میں طُفیل کے بیشتر گیتوں کا رنگِ تاثر بھرا تھا۔ بول زخمی پرندے تھے۔ دُھن دُکھ میں بھیگی ہوئی تھی۔ ایک گیت کے بول تھے :

دردوں مار لیا وے، میرا دل ڈردا نہ بولے

ایک کا مکھڑا تھا:

سجناں دچھوڑا تیرا جند نہ سہار دی

سارے ٹیپ میں ایسے ہی گیت بھرے ہوئے تھے۔ یہ ٹیپ کسی ادارے نے پروڈیوس نہیں کیا تھا۔ ادارے جب بھی کوئی گانا پروڈیوس کرتے ہیں تو اسے بنا سجا دیتے ہیں۔ چیز اور بنی سجی چیز میں، بہت فرق ہوتا ہے۔ جیسے باغیچے اور جنگل میں فرق ہوتا ہے۔ عام طور سے بنے سجے گیت محفل کے لیے ہوتے ہیں۔ اکیلے کے لیے نہیں۔

موسیقی اکیلے پر اور اثر رکھتی ہے، محفل پہ اور۔ اکیلے میں اندر کا انسان باہر نکلتا ہے۔

نفسیات کے ماہروں کا کہنا ہے کہ انسان ازلی طور پہ اکیلا ہوتا ہے۔ باہر کا انسان اس اکیلے پن سے خائف ہے اور اس خوف سے خود کو محفوظ رکھنے کے لیے اپنے گرد بھیڑ لگائے رکھتا ہے۔ کراؤڈ کا سہارا لیتا ہے۔ کراؤڈ میں حیوان کا عنصر غالب ہوتا ہے۔

طفیل کا وہ ٹیپ خانہ ساز ٹیپ تھا۔ اسے کسی نے بنایا سنوارا نہ تھا۔ اس میں نمائش کا عنصر نہ تھا۔ طفیل کے اندر کا آدمی گا رہا تھا۔ میں اکیلے میں سن رہا تھا۔ میرے اندر کا انسان میرے سامنے آبیٹھا تھا۔ ایسے لگتا تھا جیسے وہ میرے انوکھے عشق کی حقیقت سے واقف ہو۔ میرے بے نام محبوب کو جانتا ہو، جس کے بارے میں میں کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔

طفیل کے ان گیتوں نے مجھ میں تخلیق کی تحریک پیدا کی۔ پانچ سال مسلسل۔ پانچ سال طفیل کے گیت مجھ میں تخلیق کی تحریک پیدا کرتے رہے۔ طفیل میرا محسن بن گیا۔

چند ایک سال کے بعد طفیل راولپنڈی آگیا۔ میں بڑے اشتیاق سے اسے دیکھنے گیا۔ مگر دیکھ کر بہت مایوس ہوا۔

میرے رُوبرُو وہ طفیل نہیں تھا جو مجھ سے پوچھا کرتا تھا کہ "لول متی دیا بادیا"

اس طفیل میں تڑپ نہ تھی، پکار نہ تھی، تلخی نہ تھی، دُکھ نہ تھا۔ وہ ایک عام انسان تھا۔ اس میں مٹھاس تھی، عجز تھا، رواداری تھی۔ میں حیران تھا کہ وہ طفیل کدھر گیا جو ٹیپ میں کراہتا تھا، پکارتا تھا، بین کرتا تھا۔ شخصیت کے تضادات کو میں مانتا ہوں۔ لیکن شخصیت کی بنیادی وحدانیت کو بھی مانتا ہوں۔

ظاہر تھا کہ طفیل ایک منفرد فنکار ہے۔ اس نے یہ انفرادیت کیسے حاصل کی؟ میرے اندر ایک کھوج لگ گئی کہ اس گائک کے اندر دُکھ کے اظہار کی صلاحیت کیسے پیدا ہوئی۔ یہ فنکار کس دُھنکی میں ڈال کر دُھنکا گیا کہ رُواں رُواں ہوگیا۔ مجھے طفیل کی زندگی سے دل چسپی پیدا ہوگئی۔

طفیل شام چوراسی سے ایک میل دور مَڈیراں گاؤں میں پیدا ہوا۔ شام چوراسی پنجاب کا ایک مشہور و معروف قصبہ ہے جو گائکی کے ایک بڑے گھرانے کی وجہ سے مشہور ہے۔ ہمارے کئی ایک معروف گوّیے شام چوراسی سے تعلق رکھتے ہیں۔

مَڈیراں سکھوں کا ایک گاؤں تھا جہاں طفیل کا گھرانا مسلمانوں کا واحد گھرانا تھا۔ یہ گھرانا پکھاوج کا گھرانا تھا۔ طفیل کے آباؤاجداد بڑے بڑے پکھاوجیے تھے۔ وہ کھلے ہاتھ کا طبلہ بجانے میں ماہر تھے۔ یہ فن تال کا فن ہے اور ان دنوں اس کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ بالپن سے ہی طفیل کے کان میں سُر اور تال کی آوازیں پڑتی رہیں۔

عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ گانے کا گلے سے تعلق ہے۔ یہ خیال درست نہیں۔ بنیادی طور پر گانے کا کان سے تعلق ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ ہم ایک جیسا نہیں سُنتے۔ کچھ لوگ زیادہ سُنتے ہیں، کچھ کم۔ کچھ لوگوں میں سُنی ہوئی چیز کو یادداشت میں محفوظ کر لینے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ ایسے لوگوں میں گائک بننے کی صلاحیت زیادہ ہوتی ہے۔

جب طفیل بڑا ہوا تو اسے سکول میں داخل کر دیا گیا۔ سکول کا ہیڈ ماسٹر سُر کا

رسیا تھا۔ اسمبلی میں جب اس نے طفیل کو دُعا گاتے ہوئے سُنا تو اس کی توجہ طُفیل پر مرکوز ہوگئی۔ وہ اسے گانے کی ترغیب دینے لگا، اور زیادہ وقت اس کا گانا سُننے میں صرف کرنے لگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ طفیل کی توجہ پڑھنے کی بجائے گانے کی طرف لگ گئی، اور اس نے گھرانے کے خلاف بغاوت کردی۔ گھر والے چاہتے تھے کہ وہ پکھاوجیہ بنے، لیکن اس کے سر پر سُر کی لگن سوار ہوگئی۔

موسیقی کے دو پہلو ہوتے ہیں: سُر اور تال۔ تال جسم پر اثر کرتی ہے، سُر رُوح پر۔ تال پر ہاتھ چلتا ہے۔ سر چلتا ہے۔ پاؤں چلتے ہیں۔ رقص چلتا ہے۔ سارا جسم چلتا ہے۔ خواہش جاگتی ہے۔ سُر رُوح کے تاروں کو چھیڑتی ہے۔ دُکھ اُبھرتا ہے۔ درد جاگتا ہے۔ اندر کا انسان باہر نکلتا ہے۔ تنہائی کا تنبُو تن جاتا ہے۔ کائنات سے ایک اَن جانا تعلق بیدار ہو جاتا ہے۔ پھر سب کچھ ایک ہو جاتا ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ فن کار بنایا نہیں جاتا۔ بنا بنایا آتا ہے۔ البتہ قدرت اسے سُر کرنے کے لیے کٹھن راہوں پر ڈال دیتی ہے۔

فن کار خود رو ہوتا ہے۔ گملے کا بوٹا نہیں ہوتا۔ وہ ٹیڑھی لکیر ہوتا ہے۔ سیدھا کرو تو ٹوٹ جاتا ہے۔ نپے تُلے راستے پر نہیں چلتا۔ اپنا راستہ خود تلاش کرتا ہے۔ شعور کے جاگنے سے پہلے ہی طُفیل نے اپنا راستہ خود تلاش کرنے کا عزم کرلیا، اور قدرت نے سُر کے اس دیوانے کو سُر کرنے کے لیے رنگا رنگ کے مشاہدات کی دھُنکی میں ڈال دیا تاکہ دُھنک دُھنک کر رُواں رُواں ہو جائے۔

گھر والوں نے طُفیل کے تیور دیکھ کر محسوس کیا کہ سارا دھن جا رہا ہے۔ سوچا کہ چلو، آدھا بانٹ دیتے ہیں۔ بچپن کا شوق ہے، اسے پُورا کر دو۔ شاید کچھ دیر کے بعد سمجھ آجائے اور پکھاوجیہ واپس گھر آجائے۔ گھر میں طفیل کی بڑی حیثیت تھی۔ اس لیے کہ چار ایک بھائیوں کے گھروں میں صرف ایک نرینہ اولاد تھی۔ اس لیے وہ سب کا پیارا تھا۔ لاڈلا تھا۔

سب نے مل کر مشورہ کیا اور طفیل کو امرتسر کے قریب بمبہ گاؤں کے گردوارے میں نوکر کرا دیا۔ وہاں طفیل کے نانا ربابی کی حیثیت سے ملازمت کر رہے تھے۔

بمبہ گردوارے میں طفیل کا کام گورو نانک کی بانی کے بھجن میں سنگت کرنا تھا۔

گردوارے میں دھرپد بھی گایا جاتا تھا، جس کے ساتھ کھلے ہاتھ کا طبلہ بجتا تھا۔ یعنی پکھاوجیے کی واپسی کی صورت موجود تھی۔ دھرپد سنگیت کی پرانی شکل ہے جو آج کل کی مروجہ شکل خیال سے مختلف ہے۔

دھرپد میں دھنیں بندھی ٹکی ہوتی ہیں اور گائک کو اختیار نہیں ہوتا کہ ردوبدل کر سکے یا اپنا کمال دکھا سکے۔ دھرپد میں زیادہ تر حمدوثنا ہوتی ہے۔ گمان غالب ہے کہ دھرپد مندر کی پیداوار ہے۔ چونکہ دھرپد بندش کا صلہ کمپوزر کو جاتا تھا، اور گانے والے کے لیے اپنے کمال کو پیش کرنے کی کوئی صورت نہ تھی، اس لیے انھوں نے گائکی میں خیال کی طرز ڈالی جو آج تک رائج ہے۔

تین ایک سال طفیل بمبہ کے گردوارے میں نانک بانی گاتا رہا۔ پھر اس کا دل اُچاٹ ہو گیا۔ اس پر طفیل کے والد اسے گوندوال کی گئوشالہ میں لے گئے جو ترن تارن کے قریب واقع تھی۔

گوندوال گئوشالہ میں طفیل کا کام پارٹی کے ساتھ گاؤں گاؤں پھرنا اور گا گا کر گئو رکشا کا پرچار کرنا تھا۔

شاید گوندوال سے بھی طفیل کا دل اُچاٹ ہو جاتا، لیکن وہاں اس کے لیے دو خصوصی دلچسپیاں تھیں۔ ایک تو ہربلّبھ کا چھوٹا میلا اور دوسرے بٹالے کا تولا نتھو رام۔ تقسیم سے پہلے جالندھر میں ہر سال گائکوں کا بہت بڑا اکٹھ ہوا کرتا تھا۔ ہندوستان کے طول و عرض سے بڑے بڑے گائک اس اکٹھ میں شرکت کیا کرتے تھے، اور اپنے اپنے شاہ پارے پیش کرتے تھے۔ اس اکٹھ کو ہربلّبھ کا میلا کہا کرتے تھے۔ یہ میلا بڑے

میلے کے نام سے مشہور تھا، اور اس میں زیادہ تر گائک شُدھ راگ کے ہوتے تھے۔

گوندوال میں ایک ایسا ہی میلا لگتا تھا، چھوٹے پیمانے پر، جسے ہر بّلب کا چھوٹا میلا کہتے تھے۔

طفیل کے لیے یہ میلا بہت بڑی نعمت تھا۔ کیونکہ اسے بڑے بڑے گویّوں کو سُننے کا موقع ملتا تھا۔ یوں بچپن میں ہی شُدھ راگ اس کے کان میں بیٹھ گیا اور اس کی گائکی کی بنیاد بن گیا۔

بٹالے کا نتھو رام اکثر گوندوال آیا کرتا تھا۔ وہ کوئی مشہور گائک نہیں تھا، اسے نئی نئی انوکھی دُھنیں اور بندشیں کمپوز کرنے کا شوق تھا، اور اسے بیسیوں بندشیں یاد تھیں۔ نتھو رام نے طفیل میں کمپوزیشن کا احساس اور شوق دلایا۔

گوشالہ پہ چار پارٹی نے طفیل میں گاؤں گاؤں گھومنے کا اشتیاق پیدا کیا۔

گوندوال میں طفیل صرف چار سال رہا۔ پھر وہ راس دھاریوں کے ساتھ شامل ہو گیا۔

راس دھاریے جگہ جگہ گھوم پھر کر مجمع لگایا کرتے تھے۔ وہ ناٹک بھی کھیلتے تھے اور قصّہ گوئی بھی کرتے تھے۔ ان کا فن گانے، بیان اور ناٹک کا عجیب مگر دلچسپ ملغوبہ تھا۔

طفیل نے چند ایک برس ان سے ناٹک اور قصّہ خوانی کا فن سیکھا، اور پھر انھیں چھوڑ کر نوٹنکی میں شامل ہو گیا۔ نوٹنکی گھومتا پھرتا تھیٹر تھا۔

نوٹنکی میں طفیل نے سسّی پنّوں، ہیر رانجھا، سوہنی مہینوال، پُورن بھگت میں ہیرو کا پارٹ ادا کیا۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ اس نے تھیٹر کی بندشوں سے واقفیت حاصل کی۔

اس زمانے میں تھیٹر کی بڑی دُھوم تھی۔ تھیٹر کی دُنیا میں آغا حشر کا ڈنکا بجتا تھا۔

آغا حشر بڑی قابلیت اور صلاحیتوں کا شخص تھا۔ وہ ڈراما نگار تھا، شاعر تھا، ڈائرکٹر تھا، کمپوزر تھا اور اداکار تھا۔ اس نے تھیٹر کی بیسیوں دھنیں کمپوز کی تھیں۔

نوٹنکی میں طفیل نے ڈراما اور تھیٹر کمپوزیشن میں مہارت حاصل کی۔ آج تک وہ دوسروں کی پارٹیوں میں کام کرتا رہا تھا، پھر دفعتہً اس میں ذاتی شہرت کی آرزو جاگی اور اس نے نوٹنکی کو چھوڑ کر اپنی سنگیت پارٹی بنالی۔

آوارگی کے اس دور میں سُر کے جنگل میں یہ بھونرا پھول پھول پر بیٹھا۔ کانٹے کانٹے سے لہولہان ہوا۔ مندر میں بھجن گائے، گئوشالہ میں گئورکھشا کے گیت گائے، گُردوارے میں دھرپد الاپا۔ کیرتن کیا، راس دھاریوں کے ساتھ رام لیلا کھیلی، قصہ خوانی میں سُر اور بیان کی سنگت سیکھی، نوٹنکی میں عظیم عاشقوں کے کردار بیتے، اور ناٹک کی بندشوں میں دسترس حاصل کی۔ پھر سنگیت ٹولی میں لوک سنگیت سے پریم رچایا۔

یوں سنگیت کی بھول بھلیوں میں بادیہ پیمائی سے طفیل کو سُر تو مل گئی، نکھار بھی حاصل ہو گیا، لیکن ابھی درد کو جان بننا باقی تھا۔ موسیقار تشنۂ تکمیل تھا۔

سنگیت پارٹی قائم کرنے کا ایک فائدہ تو ہُوا کہ چند ایک ہی برس میں سارے علاقے میں طفیل کا نام مشہور ہو گیا اور اس کی پارٹی کی مانگ پیدا ہو گئی۔ لیکن انھی دنوں قیامِ پاکستان عمل میں آگیا اور طفیل کو اس علاقے کو چھوڑ کر پاکستان میں پناہ لینی پڑی۔

پاکستان میں اسے ملتان لے جایا گیا۔ وہ علاقہ نہ رہا۔ عزیز و اقارب نہ رہے۔ پروانے نہ رہے۔ وہ ایک بیگانے شہر میں اجنبی کی حیثیت سے آپڑا۔

جوں توں کر کے اسے سر چھپانے کے لیے ایک مکان تو مل گیا، لیکن گزارے کی صورت پیدا نہ ہوئی۔ آخر تنگ آکر اس نے ملتان میں حلوائی کی دکان کھول لی، اور دودھ دہی اور مٹھائی بیچ کر گزارہ کرنے لگا۔

چند ایک ماہ بعد ملتان کا ایک پولیس افسر طفیل کی دکان پر آنکلا۔ وہ طفیل کا پرانا فین تھا۔ اس نے طفیل کو پہچان لیا۔ بولا "طفیل، دُکان داری کر رہے ہو؟ نہیں یہ نہیں ہو گا۔ بھئی، اپنا کام کیوں نہیں کرتے؟" طفیل نے کہا "اپنا کام کیسے کروں؟ نہ ساز رہے، نہ ساتھی"۔

پولیس افسر نے مال خانے سے اسے ساز دلا دیے اور اُس نے گھوم پھر کر چند ساتھی تلاش کر لیے۔ اس کے بعد پولیس افسر نے ایک سنگیت محفل کا انتظام کیا اور طفیل کو شہر کے لوگوں سے متعارف کرایا۔ یوں طفیل کی سنگیت پارٹی پھر سے وجود میں آ گئی اور ملتان کے گرد و نواح میں اس کی شہرت پھیلنے لگی۔

ایک دفعہ میں نے تفریحاً طفیل سے پوچھا کہ بھئی، تم نے سنگیت کی بہت سی محفلوں میں شرکت کی ہے۔ کیا کوئی ایسی محفل بھی تھی جسے تم ناقابلِ فراموش سمجھتے ہو؟

اس سوال پر طفیل مسکرایا۔ بولا "ہاں، ایک محفل ایسی تھی جسے ہم کبھی بھول نہیں سکتے۔" پھر اس نے مجھے اس محفل کی روئیداد سنائی۔ کہنے لگا "ایک روز شام کے وقت ایک صاحب آئے۔ کہنے لگے کہ پرسوں ہمارے ہاں ایک تقریب ہے۔ آپ اپنی پارٹی لے آئیں۔ اس نے پیشگی کی بجائے ساری رقم مع آمد و رفت کرایہ ادا کر دی اور ہمیں جگہ کا اتا پتا سمجھا دیا۔ یہ جگہ شہر سے پچیس تیس میل دور تھی۔ مقررہ روز ہم شام کے وقت، وہاں پہنچ کر حیران ہوئے، کیونکہ ویرانے میں ایک بڑے بڑ کے درخت کے قریب ایک بڑا خیمہ لگا ہوا تھا اور خیمے کے باہر دریاں بچھی ہوئی تھیں۔ ہم وہاں پہنچے ہی تھے کہ وہ صاحب آ گئے۔ انھوں نے ہمارا خیر مقدم کیا اور دریوں پر بٹھا دیا۔

دو گھنٹے کے بعد ہمارے میزبان کے پانچ چھ ساتھی آ گئے۔ ان کے آنے پر محفل شروع ہو گئی۔ آدھی رات تک ہم گاتے رہے۔ پھر انھوں نے ہم سے کہا کہ کسی وجہ سے برات نہیں آئی۔ اب آپ یہیں آرام کریں۔ صبح دیکھا جائے گا۔ اس پر ہم نے محفل ختم کی اور وہیں دریوں پر لیٹ کر سو گئے۔ گرمیوں کے دن تھے۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ خوب

نیند آئی۔ صبح جب ہم جاگے تو نہ وہ شامیانہ تھا نہ دریاں تھیں۔ ہم سب زمین پر پڑے ہوئے تھے۔ سامنے بڑ کا درخت تھا جس کے قریب ہی ایک کھنڈر تھا۔ یہ دیکھ کر ہم پر خوف طاری ہو گیا اور اپنے ساز اُٹھا کر وہاں سے بھاگے۔

یعنی طفیل کی مقبولیت اس مخلوق تک بھی جا پہنچی تھی جو کھنڈر، بڑ اور ویرانوں میں رہتی ہے۔

پھر ایسی ہی ایک محفل میں ریڈیو پاکستان کے ایک نمائندے نے طفیل کو سُنا۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ ریڈیو ٹرانسکرپشن میں طفیل اور اس کی پارٹی تقریباً چھ ماہ تک اپنے گلے ریکارڈ کراتی رہی۔ اس دوران میں طفیل کو اپنا تھیٹر بنانے کا شوق چرایا اور اس نے میاں طفیل تھیٹر قائم کر لیا، جس میں آٹھ لڑکیاں تھیں، دس لڑکے تھے اور دس سازندے تھے۔

کہتے ہیں "رولنگ سٹون گیدرز نو ماس"۔ یہ کہاوت کسی سرمایہ دار نے بنائی ہے، جس کے نزدیک ماس صرف ساز و سامان ہے۔ فن کی دُنیا میں ٹھوکریں کھانا ازبس ضروری ہوتا ہے اور اگر ٹھوکریں کھاتے کھاتے دل کو ٹھوکر لگ جائے، شیشہ تڑخ جائے، اندر لوٹ پیدا ہو جائے، تو سمجھو کہ تکمیل کی صورت پیدا ہو گئی۔

لوٹ بنا سُر پیدا نہیں ہوتی۔ لوٹ نہ ہو تو نے سسکیاں نہیں بھر سکتی۔ لوٹ ہی سے درد رِستا ہے۔ رِس رِس کر انگ انگ میں بھر جاتا ہے۔ اب طفیل کی سنگیت کا پہلا دور ختم ہو رہا تھا۔ کراہ اور پکار سے نکل کر وہ درد بنتا جا رہا تھا۔ فن تلخی کی جگہ اسے مٹھاس بخش رہا تھا۔

ریڈیو اور ٹیلی وژن سے ہوتا ہُوا آخر وہ لوک ورثے میں پہنچ گیا۔ لوک ورثہ بھی ایک عجیب و غریب اِدارہ ہے۔ ۱۹۷۰ء میں دُنیا کے تمام مُلکوں کے سیانے رل بیٹھے۔ انھوں نے کہا: بھائیو، دُنیا میں جگہ جگہ ایک کھچڑا کلچر پیدا ہو گیا ہے، اور جو کوڑھ کی طرح پھیلنے لگا ہے۔ نوجوانانِ عالم اس کھچڑا کلچر سے بُری طرح متاثر ہو رہے ہیں۔

اگر یہ جھکڑ یونہی چلتا رہا تو ساری دنیا کو گرد و غبار سے بھر دے گا۔ نہ کسی ملک کی موسیقی رہے گی، نہ ناچ رہے گا۔ نہ روایت رہے گی، نہ رسم و رواج رہے گا۔ نہ آرٹ رہے گا، نہ دستکاری رہے گی۔ کسی ملک کی پہچان نہ رہے گی۔ اس لیے بھائیو، اپنی اپنی روایات، کلچر، آرٹ، لباس کو محفوظ کر لو ورنہ ہمارے تمام کلچر مونجو دارو بن کر رہ جائیں گے۔ اس پر ۳۲ ملکوں نے اپنے اپنے ہاں لوک ورثے کے ادارے قائم کر لیے، تاکہ اپنے کلچر کو محفوظ کر لیں۔ پاکستان نے بھی کلچر کی وزارت کے تحت لوک ورثے کا محکمہ قائم کر لیا۔

اس کھچڑا کلچر نے ہماری موسیقی کا ستیاناس کر دیا ہے۔ اس نے سُر کو رد کر دیا ہے، تال کو اپنا لیا ہے۔ تیز اور تیز، اور تیز۔ گانے کو رقص میں بدل دیا ہے۔ اس رقص میں کوئی جمالیاتی حرکت نہیں ہے۔ شدتِ دیوانگی، ہسٹیریا، جسم، جسم، جسم۔ جسم اور شدت کا ایک طوفان۔ جسم کی بوتل سے خواہش کا جن اُبھر رہا ہے۔

لوک ورثے میں شمولیت کے بعد طفیل کو ایک راستہ مل گیا، فن میں قیام پیدا ہو گیا اور وہ لوک دُھنوں کو شُدھ سنگیت میں رنگنے لگا۔

طُفیل واحد لوک گائک ہے جس کی گائکی کی بُنیاد شُدھ راگ ہے۔

طُفیل نے مشہور لوک گیت ماہیا پر تحقیق کی۔ ماہیا ایک مقبول عام لوک گیت ہے جو تقریباً ہر علاقے میں مخصوص علاقائی دُھن میں گایا جاتا ہے۔ تحقیق کے بعد طفیل نے ماہیا کو بیسیوں لوک دُھنوں میں سجایا، اور کئی ایک کو شُدھ راگ میں بھگو دیا۔

شُدھ راگ عوام کے لیے ناپسندیدہ سہی، لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ شُدھ راگ ہی وہ دھارا ہے جس سے سنگیت کا باغیچہ ہرا بھرا ہے۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم شُدھ راگ سے متاثر نہیں ہوتے۔ ویسے حقیقت یہ ہے کہ ہر راگ ایک مخصوص تاثر پیدا کرنے کے لیے تشکیل کیا گیا ہے، جو صرف جاننے والے پر ہی نہیں بلکہ اَن جان پر بھی لازماً اثر کرتا ہے۔ اگر ہم اَن جان اِس تاثر سے محروم رہتے ہیں تو قصور راگ کا نہیں،

گائک کا ہے۔

شدھ راگ کے گائک آپ کے اور میرے لیے نہیں گاتے۔ تاثر پیدا کرنے کے لیے نہیں گاتے۔ وہ اپنا کمال ظاہر کرنے کے لیے گاتے ہیں۔ میرا ایمان ہے کہ اگر فن کار پر نمائش کا جذبہ طاری ہو جائے تو اس میں تاثر نہیں رہتا۔ اگر گائک خود تاثر میں بھیگ جائے کہ اسے اپنے کمال کی سدھ بدھ نہ رہے، تو پھر تاثر کے چھینٹے اڑتے ہیں اور محفل کو بھگو دیتے ہیں۔

مجھے شدھ راگ گانے والوں سے شکایت ہے کہ وہ میرے لیے نہیں گاتے اور پھر مجھ سے ہی شکایت کرتے ہیں کہ میں گانا سننا نہیں جانتا۔ وہ مجھے اپنے ساتھ نہیں چلاتے۔ میں وہیں کا وہیں کھڑا رہ جاتا ہوں اور وہ دور نکل جاتے ہیں۔ پھر مجھے طعنے دیتے ہیں کہ میں ساکت و جامد ہوں۔ بے حس ہوں۔

طفیل میں یہ خوبی ہے کہ وہ میرے لیے گاتا ہے۔ سننے والوں میں تاثر پیدا کرنے کے لیے گاتا ہے۔

جائے پناہ سے جائے امتیاز

جن دنوں ہندوستان کے مسلمان قائدِ اعظم کی قیادت میں حصولِ پاکستان کے لیے جدّوجہد کر رہے تھے، اُن دنوں میں سکّہ بند دانشوروں میں گھرا بیٹھا تھا۔

میرے اِرد گرد سائنس دان اور فلسفی بیٹھے تھے۔ برٹرینڈ رسل، آلڈو، جولین، ہالڈین، فرائڈ، لیونگ، ایڈلر، شاپن ہار، نیٹشے۔ یہ سب لوگ مجھے سمجھا رہے تھے۔ زندگی کے متعلق سائنسی زاویۂ نظر سکھا رہے تھے۔

ایک کہتا: شک کرو۔ ہر بات پر شک کرنا سیکھو۔ ایمان سے بچ کر رہنا۔ کسی بات پر ایمان لے آئے تو آگے بڑھنے کی صلاحیت ختم ہو جائے گی۔ ایا بج بن کر بیٹھ جاؤ گے۔

دُوسرا کہتا: جذبہ ایک دلدل ہے۔ اس دلدل میں پھنس گئے تو ڈوب جاؤ گے۔ تیرنا چاہتے ہو تو فکر کو اپناؤ۔

تیسرا کہتا: میاں سیکلر بنو۔ مذہب تمھیں محدود کر کے رکھ دے گا۔ وسعت چاہتے ہو تو لادینیّت اختیار کرو۔

چوتھا کہتا: کوئی حرج نہیں، کوئی حرج نہیں۔ بے شک اللہ کو مانو۔ اللہ تو تھکے ہُوئے سر کے لیے تکیہ ہے۔ اگر اللہ نہ ہوتا تو بھی ہم اپنی تسلّی کے لیے اسے ایجاد کر لیتے۔ لیکن اللہ ایک پرسنل چیز ہے۔ اسے پرسنل ہی رکھو۔

ان کی باتیں سُن سُن کر مجھے اس بات پر ندامت محسوس ہوتی تھی کہ میں مسلمان ہوں۔ اگرچہ میں منہ زبانی مسلمان تھا، خالی نام کا۔ پھر بھی تھا تو مسلمان۔ جب بھی خیال آتا، شرم سے

میری گردن لٹک جاتی تھی۔

دوسرے مجھے اپنے بیک ورڈ وطن اور فرسودہ روایات پر شرمندگی محسوس ہوتی تھی۔ مشرقی مفکروں کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھتا تھا۔ فکر و نظر سے متعلق میرا مکہ مغرب تھا۔

آپ سے کہ دوں تو کیا حرج ہے کہ میرے ذہن میں سیاست کا خانہ جب بھی خالی تھا اب بھی خالی ہے۔ پتا نہیں ایسا کیوں ہے۔ بلاوجہ میرے دل میں یہ ایمان پختہ ہو چکا ہے کہ سیاست ہیرا پھیری کا دوسرا نام ہے۔

اب آپ خود ہی سمجھ لیں کہ جو شخص مذہبی جذبے پر ندامت محسوس کرے، وطن سے بیگانہ اور سیاست میں کورا ہو، تو اُسے مسلمانوں کے لیے ایک الگ وطن کے مطالبے سے کیا ہمدردی ہو سکتی ہے۔

ٹھہریے! اس سے آپ یہ اندازہ نہ لگا لیجیے گا کہ مجھے ہندوستانی مسلمانوں کی زبوں حالی اور مظلومیت کا احساس نہ تھا۔ نہیں، ایسی بات نہیں۔ میں نے اتنا کچھ دیکھا تھا، مجھے اتنا کچھ دیکھنا پڑا تھا کہ میں نے ڈر کر آنکھیں بند کر لی تھیں۔

میں نے سرکاری دفتروں میں مسلمانوں کی بھرتی روکنے کی سرگرمیاں دیکھی تھیں۔ تجارت میں مسلمانوں پر دروازے بند کرنے کی ہیرا پھیریاں دیکھی تھیں۔ چھوت چھات کے ذریعے انھیں احساسِ کمتری میں ڈبویا جا رہا تھا۔ دست کاری میں ان کی برتری کو مڈل مین بن کر لوٹا جا رہا تھا۔ کاشت کاری میں مہاجن بن کر قرض کی قینچی سے کاٹا جا رہا تھا۔ سوچے سمجھے دُور رس منصوبوں سے مسلمانوں کی املاک کو ہتھیایا جا رہا تھا۔ اور یہ سب کچھ کہاں ہو رہا تھا؟ اس صوبے میں جہاں مسلمان اکثریت میں تھے۔

میں اکثر بیٹھ کر سوچا کرتا: یا اللہ! اگر یہاں یہ حال ہے تو ان علاقوں میں کیا ہو رہا ہو گا جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں۔

میں یہ سب کچھ جانتا تھا، اس کے باوجود سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ مسلمان الگ وطن کا

مطالبہ کیوں کر رہے ہیں ؟

اس کی دو وجوہات تھیں :

پہلی وجہ یہ تھی کہ برائے نام مسلمان ہونے کے باوجود میری رگوں میں مسلمانی خون دوڑ رہا تھا۔ اور مسلمان ازلی طور پر ایک بیماری میں مبتلا ہوتا ہے۔ اس بیماری کو کہتے ہیں، فراخ دلی۔ اگر تعصب پائے بھی تو وہ سطحی رہتا ہے۔ دل تک نہیں پہنچ پاتا۔ بدقسمتی سے قوموں کی بقا کے لیے تھوڑا سا مثبت تعصب ضروری ہوتا ہے۔ میں سوچتا : اگر غیر مسلم لوگ چھوٹے دل کے مالک ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم بھی اپنے دل کو چھوٹا کر لیں۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ میں دانشور تھا اور مذہبی زاویۂ نظر سے سوچنا میرے شایانِ شان نہ تھا۔ جب بھی مجھے مسلمانوں کی زبوں حالی کا خیال آتا تو دفعتاً اندر سے دانشور سر نکالتا۔ یہ کیا سوچ رہا ہے تو ؟ ایسے چھوٹے خیالات کو دل میں رچاتے ہوئے شرم نہیں آتی تجھے، مذہبی جذبات کی دلدل میں پھنسنا چاہتا ہے کیا ؟ لاحول ولاقوۃ !

لاحول پڑھ کر میں ان کمینے خیالات کو اپنے ذہن سے جھٹک دیتا اور اپنے فکر کو تعصب کی آلائش سے پاک کر لیتا۔ پھر خود کو ایسے خیالات سے محفوظ کرنے کے لیے سوچتا : پاکستان کے مطالبے کا مقصد جانتا ہے تو ؟ وہ پاکستان جس کا مطالبہ کیا جا رہا ہے، ہو گا کیا؟ مذہبی جذبے سے گلا سڑا ہوا ایک ملک جس میں بندشیں ہی بندشیں ہوں گی۔ شلوار کی مہری چار انچ سے زیادہ نہ ہو۔ ڈاڑھی کی لمبائی ایک مٹھ سے کم نہ ہو۔ سر ننگا نہ ہو۔ پاجامہ ٹخنوں سے اونچا ہو۔ گانے بجانے پر پہرہ ہو گا۔ ناچنے کی اجازت نہ ہو گی۔ ادب پر اسلامی سنتری کھڑا ہو گا۔ پینٹنگ اور بت تراشی سخت سزا کی مستوجب ہو گی۔ فلموں میں مکالمات کی جگہ آیات ہوں گی۔ اس پاکستان کے لیے ہمدردی کے جذبات رچائے گا کیا ؟ لاحول ولاقوۃ۔

قائدِ اعظم کے کردار سے میں بے حد متاثر تھا۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ ان کے بدترین دشمن بھی ان کے کردار کے معترف تھے۔ کبھی کسی کو جرأت نہ ہوئی تھی کہ قائد کے کردار پر

حرف زنی کرے۔

قائد کی ذہن میں عزت کیوں نہ ہوتی۔ ان میں ہر وہ بات موجود تھی جس کا میں معترف تھا۔ جدید تعلیم سے آراستہ تھے۔ اصولوں کے پابند تھے۔ ہیرا پھیری نہ خود کرتے تھے، نہ دوسروں کو کرنے دیتے۔ عقل و خرد کے قائل تھے۔ جذبات سے مرعوب نہ ہوتے تھے۔

مجھے قائدِ اعظم سے صرف ایک شکایت تھی۔ سوچتا: قائد نے سیاست کو کیوں اپنا رکھا ہے؟ اگر ہیرا پھیری کرنے کی صلاحیت موجود نہیں تو ہیرا پھیری کے اکھاڑے میں کیوں آ کھڑے ہوئے ہیں؟

بڑے بڑے سیاسی اقدام کا تو مجھے شعور نہ تھا، البتہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر میں اکثر سوچا کرتا تھا۔ مثلاً گاندھی جی اپنے آپ کو مہاتما کہلواتے تھے۔ ہم سب انھیں مہاتما کہتے تھے اخباروں میں بھی ان کا نام مہاتما گاندھی چھپتا تھا۔ لیکن قائدِ اعظم انھیں ہمیشہ مسٹر گاندھی کہہ کر بلاتے تھے۔ بات سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ آخر قائد انھیں مہاتما کہہ کر بلانے سے کیوں گریز کرتے تھے؟ اتنی چھوٹی سی بات پر کیوں ضد کرتے ہیں؟ مہاتما تو ان کے نام کا جزو بن چکا تھا۔ پھر انھیں مہاتما کہنے میں کیا حرج تھا؟

یہ نہیں کہ مجھے مہاتما کے مفہوم کا علم نہ تھا۔ میں اچھی طرح سے جانتا تھا کہ مہاتما کا مطلب عظیم انسان ہے۔ لیکن مجھے اس حقیقت کا شعور نہ تھا کہ اگر آپ کسی کو بار بار عظیم انسان کہہ کر بلائیں تو ان جانے میں آپ اسے عظیم انسان ماننے لگیں گے۔ اور اگر آپ کسی کو عظیم انسان مان لیں تو پھر اس کی بات کو رد کرنا مشکل ہو جائے گا۔

پھر سلام کرنے کی تفصیل تھی۔ مہاتما گاندھی جب بھی قائد سے ملتے تو دونوں ہاتھ جوڑ کر ماتھے پر لے جاتے اور پھر جھک کر انھیں نمسکار کرتے۔ اس کے برعکس قائد رسمی اخلاق سے ٹوپی کو چھوتے اور ایک خشک اور کورا "گڈ مارننگ" کہہ کر نمسکار کا جواب دے دیتے۔

بات سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ قائد غیر مسلم لیڈروں سے بھیگتے کیوں نہیں تھے

پھر لباس کی بات تھی۔ کانگرسی لیڈر قومی لباس پہنتے تھے۔ لیکن قائدِ اعظم مغربی لباس پہننے کے قائل تھے۔ اور صرف یہی نہیں کہ مغربی لباس پہنتے تھے بلکہ ان کے لباس سے ہاؤس آف لارڈز کی بُو آتی تھی۔

یہ چھوٹی چھوٹی باتیں میری سمجھ میں نہیں آتی تھیں۔ شاید اسی لیے روزنامہ "ٹریبون" ان باتوں کو بہت اُچھالتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود میرے دل میں قائدِ اعظم کی عزت تھی۔

پھر قیامِ پاکستان کی بات پکّی ہو گئی۔

اس پر لاہور میں ایک قیامت خیز طوفان چل پڑا۔ اس روز شام کا وقت تھا۔ احمد بشیر اور میں دونوں کسی کام سے جا رہے تھے۔ مال روڈ کے فٹ پاتھ پر مولانا صلاح الدین احمد مل گئے۔ علیک سلیک کے بعد کوئی بات چل نکلی۔ معاً ایک شور اُٹھا۔ اس شور کی نوعیت تشدّد بھری تھی۔

دیکھا تو ایک جانب سے ننگی کرپانوں کا جلوس آ رہا ہے، اور پاکستان مُردہ باد کے نعرے لگ رہے ہیں۔ یہ جلوس بہت لمبا تھا اور اس میں سے تشدّد کے بھبکے اُٹھ رہے تھے۔ ساری مال روڈ سہم گئی۔ ابھی یہ جلوس ختم نہیں ہوا تھا کہ ایک گلی سے عورتوں کا جلوس برآمد ہو گیا۔ وہ سب بھاگ رہی تھیں اور ساتھ ساتھ پاکستان کا سیاپا کر رہی تھیں۔

دفعتہً مولانا صلاح الدین چونکے۔ "ارے صاحب"! وہ بولے "یہ جلوس تو ایک دھمکی ہے۔ فضا کے تیور ٹھیک نہیں۔ میں چلتا ہوں"۔

"وہ کیوں؟" احمد بشیر نے پوچھا۔

"صاحب، میرا مکان تو شُدھ ہندو محلّے کے عین وسط میں ہے۔ اللہ خیر کرے۔ مجھے گھر والوں کی خبر لینی ہے۔"

ان دنوں احمد بشیر عُمر کے اس حصّے میں تھا جسے گرین یُوتھ کہتے ہیں۔ وہ ڈر کے مفہوم سے واقف نہ تھا۔ اس کی دلیری حماقت کی حد تک پہنچی تھی۔ جلوس کو دیکھ کر وہ بہت خوش

تھا۔شاید اس لیے کہ اس کی نظر میں وہ جلوس آنے والے ایڈیونچر کا پیام بر تھا۔

احمد بشیر میری طرح منہ زبانی مسلمان تھا۔لیکن فرق یہ تھا کہ اس کے دل میں ایک اندھا اسلامی جذبہ موجیں مار رہا تھا۔

مولانا صلاح الدین کے جانے کے بعد احمد بشیر بولا "یار، تیری ہمشیرہ بھی کرشن نگر میں رہتی ہے۔چلو، اسے وہاں سے نکال لائیں۔"

جب ہم کرشن نگر پہنچے تو چوک میں ایک تانگے کے اِرد گرد بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ کوچوان کی لاش زمین پر پڑی تھی اور ایک معمّر ہندنی چلا چلا کر کہہ رہی تھی "ظالمو! یہ تم نے کیا کر دیا! اس نے تو مجھے ماں کہا تھا: ماتا جی، آپ میرے تانگے پر بیٹھ جائیں۔میں آپ کو خیریت سے کرشن نگر پہنچا دوں گا۔ یہ تم نے کیا کر دیا؟ اس کے پیٹ میں چھُرا گھونپ دیا!

تانگے کے ارد گرد بیس پچیس جوان کھڑے تھے جن سے وہ مخاطب تھی۔

پھر احمد بشیر نے ایک کڑکتا ہوا نعرہ مارا "اللہ اکبر!" وہ سب سہم کر پیچھے ہٹ گئے اور احمد بشیر میری ہمشیرہ کے گھر جا داخل ہوا۔

ہمشیرہ کو کرشن نگر سے نکالنے کے بعد میرے ذہن میں ایک نیا سوال اُبھرا کہ یہ لوگ پاکستان کے قیام کے خلاف ہیں تو بے شک ہوں لیکن تلواریں لہرانے، سیاپا کرنے اور خنجر چلانے کا مطلب؟ سیدھی بات ہے مسلمانوں کو سمجھاؤ کہ پاکستان کا قیام ٹھیک نہیں۔اس طرح ملک بٹ جائے گا۔اس پر بھی اگر وہ نہیں سمجھتے تو ٹھیک ہے۔ بنا لینے دو پاکستان۔یہ لڑائی جھگڑا کیوں؟ پھر یہ بھی ہے کہ پاکستان کے قیام کا مطالبہ تو ایک مثبت مانگ ہے اور "نہیں بننے دیں گے" ایک منفی بات ہے۔اور کوئی سمجھ دار آدمی منفی مانگ سے ہمدردی نہیں رکھ سکتا۔

پھر حماقت کی انتہا دیکھو کہ یہ لوگ مسلمانوں کے اکثریت کے علاقے میں چھرے بازی کی رسم ڈال رہے ہیں۔اگر مسلمان مشتعل ہو گئے تو کیا ہو گا؟ اتنی سی بات نہیں سمجھتے یہ مذہبی دیوانے ــــ لیکن ان کے لیڈر تو گھنے ہیں، ہم سیکولر ہیں۔ وہ انھیں سمجھاتے کیوں نہیں؟

بہرحال، لاہور میں تشدد کے واقعات ہوتے رہے۔ کبھی بھاٹی دروازے کے سینما ہاؤس میں بم پھٹ جاتا، کبھی رات کے اندھیرے میں مسلمان محلے میں بم پھینکے جاتے، کبھی ہندوؤں کے محلوں سے مسلمانوں کی چھرا زدہ لاشیں برآمد ہوتیں۔ ان واقعات کے ساتھ ساتھ میرے فکر کا رُخ بدلتا گیا۔

پھر ۱۹۴۷ء کی ابتدا میں احمد بشیر اور میں فلم سازی کے لیے بمبئی چلے گئے۔ وہاں کرشن چندر نے اپنے گھر "کوور لاج" میں ادیبوں اور فن کاروں کے لیے مفت کی سرائے کھول رکھی تھی۔ ہم نے بھی ایک کمرے میں بستر لگائے۔ اس کمرے میں میراجی پہلے سے براجمان تھا۔

بمبئی میں ان دنوں چھرا بازی زوروں پر تھی۔ دقت یہ ہوئی کہ احمد بشیر اور میرا حلیہ نیم مسلمانوں کا سا تھا۔ مگر میراجی کی میک اپ ہندو جوگیوں سی تھی۔ اگر ہم مسلمان علاقے میں گھومتے تو میراجی کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو جاتا، اور وہ تھر تھر کانپنے لگتا۔ ہندو علاقے میں گھومتے تو میری جان عذاب میں رہتی۔

احمد بشیر کے ذہن میں ڈر اور احتیاط کے خانے خالی تھے۔ اُلٹا اُسے تو یہ شوق تھا کہ کوئی چھرا لے کر اس پر لپکے۔ اس کے لیے ہندو اور مسلمان علاقے میں کوئی فرق نہ تھا۔

میری اپنی یہ کیفیت تھی کہ میں سوچتا تھا: اگر کوئی چھرا لے کر مجھ پر لپکا تو میں کہوں گا "ابے او رُک جا۔" وہ رُک جائے گا۔ پھر میں کہوں گا "تجھے پتا نہیں کیا، میں تو ایک سیکلر آدمی ہوں؟ میں تو نام کا مسلمان ہوں۔ مجھ پر حملہ کرتا ہے، احمق!"

پھر ایک روز حملہ ہو گیا۔

ہُوا یوں کہ اُس روز میں احمد بشیر سے بچھڑ گیا۔ دادر کے علاقے سے گزر رہا تھا۔ چلتا کم تھا، اِدھر اُدھر دیکھتا زیادہ تھا۔ پھر ایک اور راہ گیر آ گیا۔ وہ میرے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ شاید وہ بھی میری طرح خائف تھا۔

دفعتہً گلی سے ایک چھرے باز نکلا اور میرے ساتھی کی طرف لپکا۔ میرا ساتھی بہت

چلایا "نہیں، نہیں۔ میں نہیں"۔ لیکن حملہ آور نے اس کی بات سُنے بغیر اسے ڈھیر کر دیا۔ میں ڈر کر بھاگا۔

اس پر میں سوچنے لگا کہ یہ چھُرے والے تو بات ہی نہیں سُنتے۔ پوچھتے ہی نہیں کہ میاں تم کیسے مسلمان ہو۔

گھر پہنچ کر مجھے احساس ہوا کہ چاہے میں سیکلر تھا، چاہے دانش ور تھا، چاہے نام کا تھا، بہر صورت میں مسلمان تھا۔ اس روز میں نے سچے دل سے تسلیم کر لیا کہ میں مسلمان ہوں، اور پاکستان میری واحد جائے پناہ ہے۔ اس کے بعد بمبئی سے میرا دل اُچاٹ ہو گیا۔

بمبئی میں ہمیں بہت سا کام ملنے کی صورتیں پیدا ہو چکی تھیں۔ ہزاروں روپوں کے کانٹریکٹ حاصل کرنے کی اُمیدیں بندھ چکی تھیں۔ بلکہ ہم دونوں امارت اور عیاشی کے خواب دیکھنے لگے تھے۔ بمبئی کی امارت میری نظر میں ہیچ ہو کر رہ گئی۔ اس لیے ہم بمبئی چھوڑ کر لاہور آ گئے۔

ہمارے لاہور پہنچتے ہی راستے بند ہو گئے۔ کُشت و خون کا بازار گرم ہو گیا پھر تقسیم ہو گئی اور مشرقی پنجاب کی سرزمین مسلمانوں کے خون سے سُرخ ہو گئی۔

میں نے لاہور کے ریفوجی کیمپوں میں زندہ لاشوں کے ڈھیر دیکھے۔ اپنے عزیز و اقارب کو ضلع گورداسپور سے پاکستان لانے کیلیے میں خود وہاں گیا۔ وہاں کے خونی مناظر دیکھ کر میری روح میں ایک دراڑ پڑ گئی، جس میں سے ساری کی ساری دانشوری چو گئی۔ سیکلرازم کا پھوڑا پھٹ گیا اور میں مسلمان ہو گیا۔ صرف یہی نہیں بلکہ مسلمان ہونے پر فخر محسوس کرنے لگا۔ مجھے شدت سے احساس ہو گیا کہ پاکستان میرے لیے واحد پناہ گاہ ہے۔

قیامِ پاکستان کے بعد اگرچہ میرا زاویۂ نظر تو بدل گیا، یعنی ایک تو میں پاکستان کو اپنی واحد پناہ گاہ سمجھنے لگا، دوسرے میرے دل میں مسلمانوں کے لیے ایک جذبہ پیدا ہو گیا۔ پھر بھی میں اسلام سے کورا ہی رہا، اور میرے دل میں اپنے اللہ کے لیے شکر گزاری کے سوا اور کوئی جذبہ نہ اُبھرا۔

میں نے اپنا مطالعہ نفسیات سے شروع کیا تھا، پھر میں جنس میں جا پہنچا، اور وہاں سے چلتے چلتے پاراسائیکالوجی میں جا نکلا۔ ای ایس پی یعنی EXTRA SENSORY PERCEPTION کا مطالعہ میرے لیے حیران کن تھا۔ یوں سمجھیے کہ سائیکک سائنس میں پہنچنے کے لیے مجھے عقل و خرد کا بیریر پار کرنا پڑا۔ بالکل ایسے ہی جیسے ہوائی جہاز ساؤنڈ بیریر کو توڑتے ہیں۔

ای ایس پی دراصل ایک چھٹی حس کا نام ہے۔ یہ چھٹی حس قدرت کی طرف سے تحفۃً بھی ملتی ہے اور ریاضت سے بھی حاصل کی جا سکتی ہے۔ چھٹی حس کی ٹوہ میں چلتے چلتے میں تبت جا پہنچا۔ تبت سے متعلقہ کتابوں کے مطالعے سے ظاہر ہوا کہ وہاں یہ حس مقابلۃً عام ہے، اور وہاں کے پادری تیسری آنکھ کھولنے کے لیے باقاعدہ تربیت دیتے ہیں۔ پھر میری جستجو بھکشوؤں، جوگیوں، صوفیوں اور بزرگوں تک جا پہنچی۔

یہ جستجو تو اپنی جگہ قائم تھی، لیکن قیامِ پاکستان کے بعد قائدِ اعظم کے لیے جذبۂ شکر گزاری میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اسی وجہ سے میں قائدِ اعظم کی زندگی کے حالات کا بغور مطالعہ کرتا رہا۔ قائدِ اعظم کی شخصیت میرے لیے ایک معما تھی۔ حیرت کی بات تھی کہ پڑھا لکھا قانون دان جو سیکلر زاویۂ نظر کا حامل تھا، اسے ایک اسلامی مملکت بنانے کا اعزاز حاصل ہو گیا!

جناب اشرف علی تھانوی صاحب سے متعلقہ ایک کتاب پڑھتے پڑھتے دفعتہً میں چونکا۔ لکھا تھا :

مولانا شبیر علی فرماتے ہیں :

مئی ۱۹۳۸ء میں ایک دن دوپہر کے وقت مولانا اشرف علی تھانوی سر جھکائے متفکر بیٹھے تھے۔ دفعتہً انھوں نے سر اٹھایا۔ فرمانے لگے : میاں شبیر علی، ہوا کا رُخ بتا رہا ہے کہ لیگ کامیاب ہو گی۔

(تعمیرِ پاکستان اور علمائے ربّانی ـــــ صفحہ ۶۹)

ارے ! میں چونکا۔ اُس وقت بھلا کون سی ہوا چل رہی تھی، جس سے مولانا نے اندازہ

لگا یا کہ پاکستان کا قیام عمل میں آئے گا۔ ابھی تو لاہور ریزولیوشن بھی پاس نہ ہوا تھا۔

مجھے مولانا کے کشف پر حیرت نہ ہوئی تھی چونکہ میں کشف کو چنداں اہمیت نہیں دیتا۔ مولانا خود کشف و کرامات کو فروعات کے زمرے میں گنتے ہیں۔ مجھے حیرت اس لیے ہوئی کہ قائدِاعظم اور تائیدِ ایزدی کا ربط مل گیا۔

مولانا نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے فرمایا:

جو سلطنت ملے گی (پاکستان) وہ ان ہی لوگوں کو ملے گی جن کو آج سب فاسق و فاجر کہتے ہیں۔ مولویوں کو تو ملنے سے رہی۔ مل بھی جائے تو ان کے بس کا روگ نہیں۔ کیونکہ سلطنت کرنا دنیا داروں کا کام ہے۔ ہم سلطنت کے طالب نہیں، صرف یہ مقصود ہے کہ جو سلطنت قائم ہو وہ دیندار اور دیانت دار لوگوں کے ہاتھ میں ہو۔

اس پر مولانا نے طے کیا کہ قائدِاعظم سے رابطہ پیدا کیا جائے، اور انھیں دین کی تعلیم دی جائے۔ حیرت اس بات پر ہوئی کہ مولانا، جو مانے ہوئے عالم اور مجدّدِ دین تھے، انھوں نے ایسا فیصلہ کیوں کیا۔ کیونکہ سلطنتوں کے معاملات میں دخل دینا بزرگوں کا کام نہیں۔ پھر یہ بھی ہے کہ انھوں نے ایک ایسی مملکت کی بہتری اور بہبود کے بارے میں عملی طور پر قدم اُٹھانے کا فیصلہ کیوں کیا، جسے دس سال بعد وجود میں آنا تھا، اور جس کے سربراہ ہونے کا اعزاز محمد علی جناح کو نصیب ہونا تھا؟ اس قسم کی دخل اندازی بزرگوں کا مسلک نہیں۔

مجھے خیال آیا، کیا مولانا اشرف علی تھانوی کو حکم ملا تھا کہ ایسا کریں؟ اگر ایسا ہے تو ظاہر ہے کہ قیامِ پاکستان کو تائیدِ ایزدی حاصل تھی۔

خیر، مولانا اشرف علی تھانوی نے باقاعدہ طور پر وقفوں کے بعد علما کے وفد قائدِاعظم کے پاس بھیجنے شروع کر دیے اور یہ سلسلہ کافی دیر تک جاری رہا۔

حیرت کی بات ہے کہ قائدِاعظم نے تبلیغ کے اس سلسلے کو کیسے قبول کر لیا۔ بے شک قائدِاعظم مسلمانوں کے لیے ایک الگ وطن کا مطالبہ کر رہے تھے، لیکن ان کی جدوجہد مسلم سٹیٹ

کے لیے تھی، اسلامی مملکت کے لیے نہیں۔

ان کے نزدیک مذہب اور سٹیٹ دو الگ چیزیں تھیں۔ وہ سٹیٹ کو مذہب کے تابع نہیں سمجھتے تھے۔

بے شک قائد نے علما کے وفد کی باتوں کو غور سے سُنا ہوگا۔ کیونکہ وہ دوسروں کی بات توجہ سے سُننے کے عادی تھے۔ لیکن قائل ہوئے بغیر وہ دوسروں کی باتیں مانتے نہیں تھے۔ پھر انھوں نے وفد کی باتیں کیسے مان لیں؛

حیرت کی بات ہے کہ عُلما کے اس وفد سے دو ایک ملاقاتوں میں قائد کے بنیادی عقائد ہی بدل گئے۔ (روئیداد تبلیغ۔ صفحہ۷) ۱۲ فروری ۱۹۳۹ء کو دہلی میں وفد سے ملاقات کے بعد انھوں نے فرمایا "میری سمجھ میں اب خوب آگیا ہے کہ اسلام میں سیاست مذہب کے تابع ہوتی ہے۔"

پھر مولانا اشرف تھانوی کے مکتوب کے جواب میں قائد نے لکھا "آپ کی ہدایات پر عمل کرنے کی کوشش کروں گا۔ آیندہ بھی آپ مجھے ہدایات فرماتے رہیں"۔ (افاداتِ اشرفیہ در مسائلِ سیاسیہ۔ صفحہ ۹۶)۔

قائد کی مولانا سے عقیدت اس حد تک پہنچی کہ انھوں نے بمبئی کے تاجران کے جلسے میں کہا: (تعمیرِ پاکستان اور علمائے ربانی۔ صفحہ ۹۶) "مسلم لیگ کے پیچھے ایک بہت بڑا عالم ہے۔ اگر ان کا علم، تقدس اور تقویٰ ایک پلڑے میں رکھا جائے اور دوسرے پلڑے میں باقی سب عُلما کا تو ان کا پلڑا بھاری رہے گا ـــــ وہ مولانا اشرف علی تھانوی ہیں۔"

مولانا نے کیا جادو کر دیا کہ قائد کا زاویۂ فکر ہی بدل گیا؟ میں سمجھتا ہوں کہ اس دوران میں قائد کی داخلی زندگی میں ضرور کوئی انقلاب آیا ہوگا۔

مولانا کی طرف سے اس حد تک دخل اندازی اور قائد میں اس حد تک قبولیت، یہ دونوں باتیں اس کی شاہد ہیں کہ کوئی تیسری طاقت کام کر رہی تھی۔ یعنی تائیدِ ایزدی عملی طور پر

راستہ ہموار کر رہی تھی۔

ان حقائق کو جاننے کے بعد میری توجہ مولانا اشرف علی تھانوی کے مُرشد جناب حاجی امداد اللہ صاحب کی طرف مبذول ہوگئی۔ (حیاتِ امدادؒ۔ صفحہ ۶۱)۔

حاجی صاحب کی زندگی کے کوائف پڑھنے کے بعد مجھ پر انکشاف ہُوا کہ ہندوستان میں پہلی اسلامی مملکت انھوں نے خود قائم کی تھی، وہ خود اس کے سربراہ تھے اور انھوں نے اعلان کیا تھا کہ اس مملکت میں تمام قوانین اسلامی شریعت کے مطابق ہوں گے۔

یہ ریاست تھانہ بھون کے علاقے میں ۱۸۵۷ء میں قائم کی گئی تھی جس کے بارے میں حضرت مولانا حسین احمد صاحب لکھتے ہیں :

اعلان کر دیا گیا کہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب کو امام مقرر کیا گیا۔ حضرت مولانا رشید احمد صاحب کو قاضی بنایا گیا۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کو سپہ سالارِ افواج قرار دیا گیا۔ حضرت حافظ ضامن صاحب تھانوی کو میمنہ اور میسرہ کا افسر قرار دیا گیا۔

یہ سب بزرگانِ دین جہاد کے لیے تھانہ بھون جمع ہوئے تھے اور انھوں نے بڑی سنجیدگی سے اس اسلامی ریاست کی تنظیم کی تھی۔ یہاں تک کہ اسلحہ حاصل کرنے کے لیے انھوں نے باقاعدہ طور پر شاملی کی تحصیل پر حملہ کیا تھا۔

اگرچہ یہ ریاست دیر پا ثابت نہ ہوئی کیونکہ انگریزوں نے دوبارہ منظّم ہو کر حملہ کیا اور قبضہ کر لیا۔ پھر بھی یہ واقعہ عجیب ترین واقعہ ہے۔ اس لیے کہ بزرگانِ دین نے کبھی ریاست قائم کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ریاست قائم کرنا ان کا مسلک نہیں۔ پھر یہ ریاست کیوں قائم کی گئی ؟

بیان کیا جاتا ہے کہ انہی دنوں جب انگریز حاکموں نے عوام کے سامنے تذلیل کرنے کی نیت سے جناب حاجی امداد اللہ صاحب کے ہاتھ باندھ کر ان کا جلوس نکالا تو مجمع سے ایک مست آگے بڑھا اور جناب حاجی صاحب سے مخاطب ہو کر کہنے لگا :

یہ نہ سمجھو کہ تیری محنت اکارت گئی۔ جو بیج تو نے بویا ہے، نوّے سال کے بعد اس میں سے پودا پھوٹے گا۔

ان حقائق سے ایک بات واضح طور پر اخذ ہوتی ہے کہ قیامِ پاکستان کو تائیدِ ایزدی حاصل تھی۔ مجھے یقین ہے کہ قائدِ اعظم کو اس امر کا شعور تھا۔ لازماً ان کی زندگی میں کسی نہ کسی مقام پر ایسے واقعات یا مشاہدات ہوتے ہوں گے جن کی وجہ سے انھوں نے بزرگانِ دین سے رابطہ قبول کیا اور ان کی تلقین سے اس قدر متاثر ہوئے کہ اپنا اندازِ فکر ہی بدل دیا۔

ان انکشافات کے بعد میرے ذہن میں بار بار یہ خیال پیدا ہوتا کہ پاکستان کو کیا خصوصیت حاصل ہے کہ اس کے لیے اس قدر اہتمام کیا گیا؟

پاکستان ایک چھوٹی سی غریب مملکت ہے۔ بے شک اہلِ پاکستان میں اللہ محمدؐ اور قرآن پاک کے لیے گہرا جذبہ موجود ہے، لیکن نہ تو ہماری زندگی اسلامی رنگ میں رنگی ہے نہ فکر۔ اور اسلامی کردار کا تو ہمیں شعور ہی نہیں۔ اُلٹا ہماری خصلت میں ہر وہ عیب موجود ہے جو اسلام میں ممنوع ہے۔

اس کے علاوہ یہ کوئی واحد اسلامی مملکت نہیں۔ دُنیا میں بیسیوں اسلامی مملکتیں موجود ہیں جن میں بیشتر ہم سے بدرجہا بہتر ہیں۔ پھر پاکستان پر یہ خصوصی نظرِ کرم کیوں؟ ـــــ بات سمجھ میں نہیں آتی تھی۔

پھر میری تعیناتی راولپنڈی میں ہو گئی، جہاں میری ملاقات عزیز ملک اور یوسف ظفر سے ہوئی۔ عزیز ملک ایک جانے پہچانے ادیب ہیں، ساتھ ہی وہ عالمِ دین بھی ہیں اور زندگی بھر بزرگوں کے آستانوں پر حاضری دیتے رہے ہیں۔

میں نے ان سے بات کی تو وہ مسکرا دیے۔ بولے "میرے مشاہدے کے مطابق بزرگوں کا ایک خاص گروہ پاکستان کے قیام، اس کی بقا اور بہبود پر مامور ہے۔"

عزیز ملک کی اس بات نے مجھے ازسرِ نو حیرت میں ڈال دیا۔ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ

عزیز ملک عادتاً نہ تو جھوٹ بولتے ہیں، نہ غلو کو کام میں لاتے ہیں۔ اس کے باوجود مجھے ان کی بات پر یقین نہ آیا۔

پھر عزیز ملک نے مجھے جناب سائیں اللہ بخش سے متعارف کرا دیا۔ سائیں اللہ بخش صاحب کا مزار مریڑ کے قبرستان میں واقع ہے۔ نہ تو وہاں کوئی گنبد ہے نہ گدی ہے۔ نہ متولی ہے نہ پیر خانہ ہے۔

سائیں صاحب کے تذکرے "مردِ قلندر" کو پڑھ کر مجھے علم ہوا کہ آپ زندگی بھر ایک اسلامی مملکت کے قیام کے لیے دوسرے بزرگوں سے جو مکھی لڑائیاں لڑتے رہے تھے۔ ۱۹۳۶ء میں آپ نے "صدائے درویش" کے عنوان سے ایک کتابچہ طبع کر کے شاہِ دکن کو بھیجا، جس میں انھوں نے شاہ کو اسلام کا جھنڈا سربلند کرنے کی دعوت دی۔ کچھ دیر بعد شاہِ دکن نے اپنے کمانڈر اعلیٰ العدروس کو سائیں جی کی خدمت میں بھیجا۔ بند حجرے میں دونوں کے مذاکرات ہوئے۔

صدائے درویش کے اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ مردِ قلندر نے نظامِ دکن کو دعوتِ جہاد دی تھی اور ایک اسلامی سلطنت بنانے کی اپیل کی تھی۔ مثلاً "صدائے درویش" میں سائیں جی کے دو شعر ملاحظہ ہوں :

تاجِ شاہی زیبِ سر ہو، ہند کے دُولھا بنو
عرب سے عجم تک آویں مبارک بادیاں
بغل میں قرآں ہو اپنے دست ہو حیدر کی تیغ
بن کے حامی دینِ احمد کے سہارے شاہ دکن

سائیں جی اُمّی تھے لیکن جب بھی کیفیّت کا عالم ہوتا تو وہ شعر کہا کرتے تھے۔ ان اشعار میں وزن، قافیہ، ردیف کم ہوتے تھے۔ نفسِ مضمون یا اظہارِ کیفیت زیادہ ہوتا تھا۔ ظاہر ہے نظام نے سہارا نہ دیا۔

سائیں جی کی خواہش تھی کہ ہند میں اسلامی مملکت کا قیام ہو۔ کوئی ایسا مردِ مسلمان

مل جائے جو اس قیام کے لیے سہارا دے تو وہ اسے ہند کا دُولھا بنادیں۔

شرط صرف ایک تھی کہ اس مملکت کے ہاتھ میں دینِ محمدؐ کی تیغ ہو اور بغل میں قرآن ہو۔

آخر یہ سعادت قائدِ اعظم کو نصیب ہوئی۔ قیام تو ہو گیا لیکن ان کی زندگی نے وفا نہ کی اور وہ دین کے لیے جہاد کی شرط پوری نہ کر سکے۔

قیامِ پاکستان کی جدّوجہد کے دوران بہت سے بزرگ مضطرب اور بے قرار رہتے تھے۔ ہر تفصیل پر نگاہ رکھتے۔ ہر بات پر ردِّ عمل کا اظہار کرتے۔

سائیں جی نے بھی قیامِ پاکستان سے بہت عرصہ پہلے فرمایا تھا کہ اعلان جون میں ہو گا۔ اور ایک لکیر لگا کر فرمایا تھا: آدھے اِدھر آدھے اُدھر۔ یہ باؤنڈری کمیشن کے فیصلے کے متعلق اشارہ تھا۔

ان کو الف سے ظاہر تھا کہ بزرگوں کا ایک گروہ ہند میں ایک اسلامی مملکت کے قیام کے لیے بے قرار تھا، اور شاید عملی طور پر اس کام میں مدد کر رہا تھا۔ لیکن اس مملکت کے قیام کا مقصد کیا تھا؟ اس راز پر پردہ پڑا تھا۔

جب میں پہلی مرتبہ راجا محمد شفیع اور یوسف ظفر کے ساتھ عزیز ملک کی معیت میں سائیں صاحب کے مزار پر پہنچا تو وہاں جناب جان محمد بٹ اور آغا حنیف صاحب سے ملاقات ہو گئی۔

جان محمد بٹ، آغا حنیف اور عزیز ملک سائیں صاحب کی خدمت میں سالہا سال بیٹھے تھے۔ پہلی ہی ملاقات پر سلسلہ گفتگو کے بغیر جان محمد بٹ نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا "مفتی صاحب! آپ پاکستان کا فکر نہ کیا کریں۔ پاکستان کا فکر کرنے کے لیے بہت سے بزرگ موجود ہیں۔ یہ جو پردہ کر کے لیٹے ہوئے ہیں،" (انھوں نے سائیں اللہ بخش کے مزار کی طرف اشارہ کر کے کہا) "یہ ساری عمر کرتے رہے ہیں اور اب بھی کر رہے ہیں۔ موت کا تو انھوں نے سوانگ رچا رکھا ہے۔ سو مفتی صاحب، آپ پاکستان کا غم نہ کھائیں۔ آپ صرف یہ کریں کہ ہر کام کرتے وقت سوچ لیا کریں: میں کوئی ایسی بات تو نہیں کر رہا جو پاکستان کے مفاد کے منافی ہو، بس یہی کافی ہے۔"

"ارے؟" میں نے سوچا "اس ملبے تڑنگے غیر بزرگ شکل کے آدمی کو کیسے پتا چل گیا کہ پاکستان

میرے شانوں پر جذیرے کے بڈھے کی طرح سوار ہے۔

پھر چند ایک دنوں کے بعد جناب جان محمد بٹ سے گفتگو کے دوران میں نے پھر تقسیم کی بات چھیڑ دی۔ میں نے کہا "اچھا پاکستان ہے یہ جس کے قیام پر سرحدوں پر لاکھوں مسلمان شہید کردیے گئے۔" بٹ صاحب مسکرائے۔ بولے "مفتی صاحب، اگر آپ کوئی ملک بنائیں تو اس کی حفاظت کے لیے سرحدوں پہ گارڈز کا دستہ متعین کریں گے یا نہیں؟"

"ضرور کریں گے" میں نے کہا۔

"تو یوں سمجھ لیجیے کہ اللہ نے اس مملکت کی حفاظت کے لیے اس کی سرحدوں پر لاکھوں شہیدوں کا دستہ متعین کردیا۔ شہید مرتا تو نہیں نا۔ لہٰذا وہ رہتی دنیا تک ہماری حفاظت کریں گے"

یہ سن کر میں ہونچکا رہ گیا۔

"دیکھیے نا" وہ بولے "ان افراد کو شہادت کا درجہ نصیب ہوا اور ہمیں ایک حفاظتی فوج میسر آئی۔ آپ کو اس پر کیا اعتراض ہے؟"

جان محمد بٹ کی باتوں نے میرے دل میں پاکستان کی امتیازی حیثیت کے احساس کو دوچند کردیا، لیکن یہ امتیاز کیوں؟ کس لیے؟ کا عقدہ نہ کھلا۔ جب بھی میں ان سے کیوں، کس لیے، پوچھتا تو وہ مسکرا کر کہا کرتے "مفتی صاحب، آپ اللہ کی باتوں میں کیوں دخل دیتے ہیں؟ وہ مالک ہے۔ جو چاہے سو کرے۔"

جان محمد بٹ مجھ سے اکثر کہا کرتے تھے "مفتی صاحب، مستقبل کی کھڑکی سے جھانکنے کا شوق چھوڑ دیجیے۔ کیا فائدہ۔ اگر جاننا ہی ہے تو سرکار قبلہ کی نظمیں جو ہیں۔ ان میں مستقبل کے واضح اشارے موجود ہیں۔"

سائیں جی کی نظموں کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد مجھے چار باتوں کا پتا چلا:

۱۔ مملکتِ پاکستان کو حیران کُن وسعت حاصل ہوگی۔

۲۔ اس سلسلے میں شاہِ ایران کوئی اہم کردار ادا کریں گے۔

۳۔ پاکستان کی خُداداد مملکت ایک روز صحیح معنوں میں اسلامی مملکت بنے گی۔
۴۔ اور پھر نشأۃِ ثانیہ کا دور شروع ہو جائے گا۔

انہی دنوں میرا ایک دوست ہالینڈ سے آیا اور کہنے لگا کہ ہالینڈ میں ہیگ کے قریب ایک گاؤں میں اسلامی کتابوں کی ایک عظیم لائبریری ہے، جس میں مطالعہ کرتے ہوئے ایک کتاب میری نظر سے گزری، جس میں لکھا تھا کہ شاہ بری لطیفؒ نے دو ڈھائی سو سال پہلے فرمایا تھا کہ ہمارے قدموں میں ایک شہر آباد ہوگا، جو دنیائے اسلام میں بڑی اہمیت کا حامل ہوگا۔ ان کوائف سے صاف ظاہر ہے کہ پاکستان کو نشأۃِ ثانیہ کے سلسلے میں کوئی اہم خدمت ادا کرنی ہے۔

ایک تو میرے سر پر پاکستان کا بھوت سوار تھا، دُوسرا نشأۃِ ثانیہ کا سوار ہوگیا۔ یہ نشأۃِ ثانیہ کیا چیز ہے، بھلا؟

تقریباً دس برس کی بات ہے کہ اسٹرالوجی پڑھتے ہُوئے مجھے پتا چلا کہ مغرب کے ماہر فلکیات ایک گولڈن ایج کے اِنتظار میں بیٹھے ہیں۔" ارے! یہ گولڈن ایج کیا چیز ہے؟" میں نے سوچا۔

معلومات حاصل کرنے کے بعد یہ عقدہ کھُلا کہ مغربی ماہر نجوم اس بات پر متفق ہیں کہ کرۂ زمین پہ ایک ایسا دور آنے والا ہے جب زمین پر اطمینان، سکون اور امن کا دور دورہ ہوگا۔ نہ جنگ و جدل ہوگی، نہ لڑائی جھگڑے۔ بس امن ہی امن ہوگا۔ شر ختم ہو جائے گا۔ خیر ہی خیر رہ جائے گی۔

ان مشاہیر کا کہنا ہے کہ کرۂ زمین پر ایسے ایسے اور اتنے سارے مثبت اور مبارک سیاروں اور ستاروں کا اکٹھ ہو رہا ہے جو آج تک کبھی نہیں ہُوا۔

اِن سیاروں اور ستاروں کا اثر سارے کرۂ زمین پہ پڑے گا، اور یہ اثر اتنا صالح اور مبارک ہوگا کہ انسان کی زندگی ہی بدل جائے گی۔ ان کا کہنا ہے کہ تاروں کے یہ جھُرمٹ کئی ایک سالوں سے زمین کی جانب بڑھ رہے ہیں، اور ۱۹۸۰ء میں ان کا اجتماع مکمل ہو جائے گا

اور دُنیا پر اثر انداز ہونا شروع ہو گا۔

اس تفصیل کو جاننے کے بعد ایک اور بات میرے ذہن میں کوندی۔ ۱۹۸۰ عیسوی کا مطلب ہجری کی پندرھویں صدی کی ابتدا ہوئی۔ بچپن میں سُنتا آیا تھا کہ چودھویں صدی میں حد ہو جائے گی۔ بے حجابی کی حد۔ لادینیت کی حد۔ ہر بات کی حد۔ میں نے پندرہویں صدی کی بات کبھی نہیں سُنی تھی۔ تو کیا ہجری کی پندرہویں صدی میں حدیں ٹوٹ کر نئی زندگی شروع ہونے والی ہے؟

ہر مذہب کے لوگ نشأۃِ ثانیہ پر ایمان رکھتے ہیں اور بڑی بے تابی سے اس کے منتظر ہیں۔ عیسائیوں کو یقین ہے کہ حضرت عیسٰیؑ دوبارہ دُنیا میں تشریف لائیں گے۔ یہودی کا ایمان ہے کہ اللہ وہ سارے وعدے پورے کرے گا جو اس نے بنی اسرائیل سے کیے تھے۔ ہندو رام راجیہ کے منتظر ہیں۔ مسلمان جناب مہدی زمان کے دور پر ایمان رکھتے ہیں۔

رہا سائنس کا رویّہ تو جدید سائنس خود اس خیال کی حامی ہے کہ ہم ایک نیا موڑ مُڑنے والے ہیں۔ ہمارے سامنے نئی نئی کھڑکیاں کھلتی جا رہی ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سپیس ہم پر حیران کن حقائق کا راز کھولنے کے لیے بے تاب ہے۔ کیا پتا کب حقیقتِ کُل سپیس کی کھڑکی سے جھانک کر ہمیں کائنات کا راز بتا دے۔

برٹرینڈ رسل نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں فرمایا تھا:

"میں چاہتا ہوں کہ مرنے سے پہلے وہ سب باتیں کہہ ڈالوں جو میرے دل کی گہرائیوں میں چلتی ہیں، لیکن جنھیں میں کہہ نہیں پایا۔ جو جذبات سے نہیں بلکہ زندگی کے اس جھونکے سے تعلق رکھتی ہیں جو دور دراز کے کسی بے نام مقام سے آتا ہے اور ہم انسانوں کی زندگی کو عظیم خوف سے بھر دیتا ہے، اور غیر انسانی مخلوق کی بے رحم اور بے انتہا طاقت کی خبر دیتا ہے۔"

ڈی چاورڈن کا کہنا ہے "کاسمک قدروں کے حوالے سے جدید فزکس ہمیں یہ سبق پڑھاتا ہے کہ صرف محیّر العقل ہی سچائی کے قریب ہو سکتا ہے۔"

جے بی ایس ہالڈین کہتا ہے "صرف یہی نہیں کہ حقیقت ہمارے اندازے سے زیادہ محیّر العقل ہے، بلکہ اس قدر محیّر العقل ہے کہ ہمارا تخیل بھی وہاں تک نہیں پہنچ سکتا۔"

نیوکلیر فزیشسٹ چارلس مارٹن کا کہنا ہے "جدید سائنسی تحقیق کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ مستقبل کا سائنسی علم روایتی سائنس کے خطوط پر نہیں چلے گا۔ اُلٹا وہ ان تصورات پر مبنی ہوگا جنھیں ہم اس وقت ناقابلِ قبول سمجھتے ہیں۔"

لوی پادل کا کہنا ہے: "نئے سائنسی حقائق ابھی چند خواص تک محدود ہیں۔ اگر وہ انھیں ظاہر کر دیں تو لوگ انھیں پاگل سمجھیں گے۔

لوی پادل اور جیکس برجر اپنی کتاب "امپاسبل پاسی بلی ٹیز" میں ان کھڑکیوں کا ذکر کرتے ہوئے جو آج سپیس کے اُفق پر کھل رہی ہیں، نشاۃِ ثانیہ کے بارے میں لکھتے ہیں جس طرح سولھویں صدی میں احیائے علم کا دور شروع ہوا تھا، اسی طرح آج ہم ایک نئے احیائے علم حقیقت کی دہلیز پر کھڑے ہیں۔ آج ہیومینسٹک کلچر کی بنیادیں لڑکھڑا رہی ہیں۔ اُنیسویں صدی کا علم دم توڑ رہا ہے۔ آج ہم کا سماس میں ایک نئی سمت کی تلاش میں جا رہے ہیں۔ کل تک روایتی علوم کی جن حدوں نے ہمیں جکڑ رکھا تھا آج ہم وہ حدیں توڑ رہے ہیں۔ ہم میں ایک نئی بیداری کروٹ لے رہی ہے۔ ہم حیران کُن حقائق کی طرف رواں دواں ہیں، جہاں بعید از امکان امکانات نظر آتے ہیں، جن کے تحت انسانی ذہن میں ایک عمیق اور عظیم انقلاب آنے والا ہے، جس کے زیرِ اثر انسانی ذہن میں تخلیق کے عظیم راز کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہوگی۔ آیئے، ہم سب انسان کے اس نئے جنم کا انتظار کریں۔"

ادب اور ادیب

ادب کی سب سے بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ اس کا نام ادب رکھ دیا گیا ہے۔
اس نام میں ایک دھونس ملفوف ہے کہ خبردار! بے ادبی نہ کرنا۔ نتیجہ یہ ہے کہ ادب پر اخلاق کا ہیڈ کانسٹبل بٹھا دیا گیا ہے۔

مجھے اخلاق کی اہمیت سے انکار نہیں۔ دقّت یہ ہے کہ ہمارے ہاں اخلاق کا کوئی واضح تخیّل نہیں ہے۔ ہمارے ہاں اخلاق ایک اپاہج ہے جو سہاروں کے بغیر کھڑا نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا ادب پر اخلاق کے اجارہ داروں کی اجارہ داری ہے۔

مذہب کہتا ہے، میں اخلاق کا سربراہ ہوں۔ میرے بغیر اخلاق ایک بے جان چیز ہے۔ چلو، یہ بھی مان لیتے ہیں۔ لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ مذہب خود ایک جنگی غلام کی طرح ہے جسے صدیوں سے کوڑے مار مار کر اچھا خادم بننے کی تلقین کی جا رہی ہے۔

نیم عالموں اور ملّاؤں نے صدیوں سے مذہب پر زین کس کر سواری کر رکھی ہے۔ ذاتی وقار اور اقتدار کے حصول کے لیے انھوں نے مذہب کو ایک حربے کی حیثیت دے رکھی ہے، لہٰذا اخلاق خود مذہب کی نہیں بلکہ مذہب کے اجارہ داروں کے گھر کی لونڈی ہے۔ اخلاق وہ ہے جو انھیں گوارہ ہے۔ جو ناگوارِ خاطر ہے، بداخلاقی ہے۔

رسم و رواج کہتے ہیں، اخلاق ہماری گود میں پلا ہے۔ ہم نے اس کا منھ دھلایا ہے۔ اس کی آنکھوں میں کاجل لگایا ہے۔ اس کی پہچان یہ ہے کہ اس پر ہماری چھاپ لگی ہے۔ ہماری چھاپ نہ ہو تو مال جعلی ہے۔

یوں اخلاق کے اجارہ داروں نے تخلیق کرنے والوں پر پابندیاں لگا رکھی ہیں: اپنے کرداروں کو اُجلے کپڑے پہناؤ۔ ان کے برتاؤ کو رسم کی سنہری زنجیروں سے سجاؤ۔ کہیں جو جی چاہے مگر یہ ظاہر نہ ہونے پائے کہ وہ اخلاق کی حد بندیوں سے باہر نکلنا چاہتے ہیں ؎

قلم کو ضبط سکھاؤ، ادب نگاہوں کو

اگر ادب کا نام تخلیق ہوتا تو تخلیق کار پر پہرے دار نہ بیٹھے ہوتے۔

تخلیق کار نے منظر کشی کی۔ بولا:

ماں بچے کو گود میں لیے بیٹھی ہے۔ باپ حقہ پی رہا ہے۔

اخلاق کے اجارہ دار چونکے۔ کیا کہا؟ باپ حقہ پی رہا ہے؟ بے شک باپ حقہ پیتے ہیں۔ انھیں حقہ پینے کی عادت ہے۔ لیکن باپ کا حقہ پیتے ہوئے دکھانا مستحسن نہیں۔ باپ کو اس حرکت کا سزاوار دکھانا اخلاق کے منافی ہے۔ لوگ کہیں گے کہ متبرک باپ ہوتے ہوئے بھی بدبخت حقہ پیتا ہے۔ بچے پر کیا اثر مرتب ہوگا؟ بچے میں خوف پیدا ہو جائے گا کہ بڑا ہو کر مجھے باپ کی چلمیں بھرنی پڑیں گی۔

جدید دور کے علم بردار بولے "حقہ پینا ایک غلیظ اور فرسودہ رسم ہے۔ ایسی فرسودہ باتوں کو اچھالنا ادب کی شاہ راہ پر بیٹھ کر گندے پوتڑے دھونے کے مترادف ہے۔ ہاں، اگر باپ حقے کی جگہ سگرٹ پیے تو کوئی مضائقہ نہیں۔"

حفظانِ صحت والے چونکے۔ بولے "نہ نہ نہ۔ باپ کو سگرٹ نہ پلانا۔ بچہ کیا کہے گا کہ میرا باپ حالاتِ حاضرہ سے اس قدر بے خبر ہے۔ اسے اتنا ہی پتا نہیں کہ سگرٹ پینا کینسر پیدا کرتا ہے۔ اس لیے اس کے ہاتھ میں سگار تھما دو۔"

نتیجہ یہ ہے کہ ادیبوں کی کیفیت ہمیشہ سے ایسپ کے افسانے کے اس باپ اور بیٹے کی سی رہی جو گدھا بیچنے کے لیے گاؤں سے شہر کی طرف عازمِ سفر ہوئے تھے۔

ایسا کیوں ہے؟ صرف اس لیے کہ کسی مسخرے نے تخلیق کا نام ادب رکھ دیا۔

آپ کہیں گے، یہ مفتی ادب کے پردے میں کیا طوطا مینا کی کہانیاں لے بیٹھا۔ یقین کیجیے یہ طوطا مینا کی کہانیاں آپ بیتیوں سے اخذ کی گئی ہیں۔

جن دنوں مجھے مختصر افسانے لکھنے کا مرض لاحق ہوا ان دنوں میں ایک مدرسے میں معلم تھا۔

برسبیلِ تذکرہ ان دنوں مجھے یہ احساس نہیں تھا کہ میں ادب لکھتا ہوں۔ کیونکہ ان دنوں ادب کا لفظ پنجاب میں رائج نہیں تھا اور ہم اس خوش فہمی میں تھے کہ یہ لٹریچر ہے۔ ان دنوں میں اس لیے لکھنے پر مجبور تھا کہ اتفاقاً میری پہلی تحریر پر تالی بجی تھی۔

میں تالی کا بھوکا تھا۔ گھر میں کوئی درخورِ اعتنا نہ سمجھتا تھا۔ چونکہ ڈرپوک اور شرمیلا تھا، لہٰذا محلّے کا کوئی ہم عمر مجھے ساتھی بنانے کے لیے تیار نہ تھا۔ سکول میں نالائق ہونے کی وجہ سے کسی گنتی شمار میں نہ تھا۔ ایسے حالات میں ایک بار تالی کی آواز سن کر ادسان کھو بیٹھا۔ "ایک بار سنی ہے دوسری بار سننے کی ہوس ہے۔"

اگر اس وقت مجھے پتا چل جاتا کہ ادب میں پاؤں دھر رہا ہوں تو ڈر کر بھاگ اٹھتا کیونکہ ان دنوں ادب میرے لیے ایک دھونس تھی۔

گھر سے دن رات ابا جی کی آوازیں سنائی دیتیں: باادب! باملاحظہ! ہوشیار! محلّے کے چوگان سے بڑے بوڑھے گزرتے تو ان کے کھنکھار چلا چلا کر کہتے "باادب! ہوشیار!" سکول میں اساتذہ کی خشمگیں نگاہیں خبردار کرتی رہتیں۔

جن دنوں مجھے افسانے لکھنے کا مرض لاحق ہوا ان دنوں میں ایک مدرسے میں معلم تھا۔ خوش قسمتی سے مدرسے میں میرا نام ممتاز حسین تھا۔ مگر اردو جریدوں میں ممتاز مفتی چھپتا تھا۔ چونکہ لوگوں سے ملنے کی عادت نہ تھی اور ادبی محفلوں میں نہ جاتا تھا، اس لیے عرصۂ دراز تک پردہ پڑا رہا اور کسی کو معلوم نہ ہوا کہ ماسٹر ممتاز حسین افسانے لکھنے کے جرم کا مرتکب ہو رہا ہے۔

پہلی مرتبہ جب یہ راز آشکار ہوا تو مدرسے کے اساتذہ ہکا بکا رہ گئے۔ پھر وہ

ازراہِ ہمدردی وفد کی صورت میں میرے پاس آئے۔ کہنے لگے "میاں، جو ہوا سو ہوا۔ ہم اس کا تذکرہ نہیں کریں گے، بشرطیکہ تم آئندہ سے توبہ کر لو، ورنہ اگر ہیڈ ماسٹر صاحب کو پتا چل گیا تو بڑی مشکل پیدا ہو جائے گی۔"

ایک بولا "بھائی صاحب، یہ میدانِ ادب ہے۔ اس میں چھچھوندریں نہ چلاؤ۔"

دوسرا بولا "یہ آج کے افسانے جو ہیں، یہ ادب نہیں، خرافات ہیں۔ بے ادبیاں ہیں۔"

تیسرا بولا "اگر ضرور ادب ہی لکھنا ہے تو اخلاقیات پر لکھو، اسلامیات پر لکھو۔"

چوتھا بولا "اگر بچوں کو پتا چل گیا کہ تم ان خرافات کے مصنف ہو تو ان کے دلوں میں تمھاری کیا عزت رہ جائے گی؟ ذرا سوچو۔ اور اگر بچوں کے والدین کو پتا چل گیا تو وہ اپنے بچوں کو اس مدرسے سے اٹھا لیں گے۔"

پھر ان میں سے وہ ایک، جنھوں نے ممتاز مفتی کی تحریروں کو پڑھا تھا، میرے افسانوں کے "باپ حقہ پی رہا ہے" گنوانے لگے۔ اس کے بعد وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ بات نکل گئی۔

ہیڈ ماسٹر نے کیس بنا کر ایس۔ ایم شریف کو بھیج دیا جو ان دنوں ہمارے انسپکٹر تھے۔ ایس۔ ایم شریف کے میرے والد سے مراسم تھے۔ انھوں نے ابا کو خط لکھا۔ گھر جو پہلے ہی اجنبیت سے بھرا ہوا تھا، اب غم و غصہ سے بھر گیا۔

ادھر شریف نے سرکاری طور پر طلب کر لیا۔ پہلے تو ڈانٹتے رہے کہ اگر طلبا کے اخلاق کے رکھوالے خود ادبی بداخلاقی کا پرچار کرنے لگیں تو تعلیم و تدریس کا کیا بنے گا؟

آخر میں مسکرا کر رازدارانہ انداز میں کہنے لگے "بھئی، اگر لکھنا ہی ہے تو انگریزی میں لکھو۔ لٹریچر لکھو۔ اردو میں ادب کیوں لکھتے ہو؟"

اس روز میری سمجھ میں آیا کہ لٹریچر اور ادب میں کیا فرق ہے۔

آج کا نوجوان ادیب سمجھتا ہے کہ پرانے ادیبوں نے حقائق سے منھ موڑے رکھا اور وہ ادب میں اخلاق، رسوم اور مذہب کی فروعات کے نرم اور خوشبودار جھاگ سے بلبلے

بناتے رہے۔ ملائم مخملیں باتوں سے قاری کو بھرماتے رہے۔ منافقت کے سنہرے جال بچھاتے رہے۔ لیکن کچھ پروا نہیں۔ اب میں آگیا ہوں۔ میں انقلاب کا نعرہ لے کر آیا ہوں۔ میں پرانے دقیانوسی ادب کو رد کر کے انقلابی ادب کی داغ بیل ڈالوں گا۔

۱۹۳۶ء میں میں بھی یہی سمجھتا تھا کہ مجھے خدا نے پرانے بت توڑنے کے لیے پیدا کیا ہے اور مجھ سے پہلے آنے والے ادیب منافقت کا شکار تھے۔ حقائق کو نگاہ بھر کر دیکھنے کی ان میں جرأت نہ تھی۔ میں کہا کرتا تھا "میں آگیا ہوں۔ جگر تھام کے بیٹھو۔" مجھے یقین ہے کہ ۱۹۳۶ء کا ادیب بھی میں میں کرتا ہوا ایوانِ ادب میں داخل ہوا تھا۔

آج پرانے ادیب نئے ادیبوں پر ہنستے ہیں۔ کیا پدی کیا پدی کا شوربا۔ میرا بھی جی چاہتا ہے کہ مستند ادیب کی مسند پر بیٹھ کر سامنے استادہ نئے ادیب پر ہنسوں۔ لیکن جب ہنسنے لگتا ہوں تو مجھے ۱۹۳۶ء کا زمانہ یاد آجاتا ہے جب مسندِ ادب پر بیٹھے ہوئے سکہ بند ادیب مجھ پہ ہنسا کرتے تھے۔ میری ہنسی کافور ہو جاتی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ ادیب کون ہے؟ کیا ہے؟ سبھی اس بات پر متفق ہیں کہ ادیب وہ ہے جس کے پاس کہنے کے لیے کچھ ہے اور وہ اس انداز سے کہنا جانتا ہے کہ بات پہنچ جائے۔ کہنے کے لیے ادیب کے پاس کچھ ہونا ضروری ہے۔ ایک زاویۂ نظر ہو۔ ہٹ کر۔ منفرد۔

اب سوال یہ ہے کہ ادب لکھنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ سیانے کہتے ہیں کہ اس لیے ضرورت ہے کہ حقائق جو بہت قریب ہیں، مانوسیت کی اوٹ میں آجاتے ہیں۔ یقین جانیے مانوسیت ایک بہت بڑا پردہ ہے، بہت بڑا، بہت دبیز۔

مہاراج ایک تقریب میں باہر جانے لگے۔ محل سے باہر نکلے تو دفعتہً انھیں یاد آیا کہ پگڑی پہننا تو وہ بھول ہی گئے۔ انھوں نے اپنے ساتھی اہلکاروں سے فرمایا "بھئی، سر پہ پگڑی رکھنا تو ہم بھول ہی گئے۔" ساتھی اہل کار، جو ادب سے سر جھکائے کھڑے تھے، بھلے

بھاگے محل میں گئے۔ تلاشِ بسیار کے باوجود مہاراج کی پگڑی نہ ملی۔ واپس آئے۔ عرض کی "مہاراج پگڑی اندر تو نہیں"۔ اسی وقت کسی نڈر چوب دار کی نظر مہاراج کے سر پر پڑی۔ اس نے چلّا کر کہا "مہاراج، پگڑی تو آپ کے سر پر ہے"۔

مہاراج نے دونوں ہاتھوں سے پگڑی کو ٹٹولا اور پھر خوش ہو کر فرمایا "اچھا کیا جو تم نے ہمیں یاد دلایا ورنہ ہم تقریب میں ننگے سر ہی جا پہنچتے"۔

میری دانست میں وہ نڈر چوب دار جس میں اتنی جرأت تھی کہ ادب اور احترام کے باوجود گردن اُٹھا کر مہاراج کے سر کی طرف دیکھ سکے، ادیب تھا۔

ادیب کا کام یہ ہے کہ لوگوں کو یاد دلاتا رہے کہ جناب والا، ٹوپی تو آپ کے سر پر ہے۔ اور یوں انھیں ننگے سر گھومنے پھرنے سے بچا لے۔

عالم صرف سوچتا ہے اور اپنی فکر کو پیش کر دیتا ہے۔ عالم کا پیغام ذہنوں تک محدود رہتا ہے۔ ادیب میں ایک ٹرانسفارمر لگا ہوتا ہے۔ وہ سوچتا ہے۔ اپنی سوچ کو جذبات کی بھٹی میں جھونک دیتا ہے۔ پھر وہ شدت کے الاؤ سے بھٹی گرماتا ہے۔ اور گرماتا ہے۔ دل جلا کر گرماتا ہے۔ حتیٰ کہ فکر جذبات کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ پھر وہ اسے ٹرانسمٹ کرتا ہے۔ اس لیے ادیب کا پیغام دلوں کی دھڑکنوں میں شامل ہو جاتا ہے۔

بہر طور، ادیب میں شدت کا ہونا لازم ہے۔ شدت کی کیفیت یُوں سمجھ لیجیے کہ ٹرک کھڑا ہے، لیکن انجن چل رہا ہے۔ یا یُوں کہ گاڑی کو پہلے گیئر میں ڈال کر آپ ۶۰ میل کی رفتار پر جانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

ادیب کو دوسروں کا دُکھ اپنانا اور بِیتنا پڑتا ہے۔ اگر آپ ایک من دُکھ سہیں تو تحریر میں صرف ایک تولہ دُکھ ٹرانسمٹ کر سکتے ہیں۔

نتیجہ یہ ہے کہ ادیب ایک تو شدت کا شکار ہے، دُوسرے دُکھ کا۔ اور تخلیق ایک دُکھ بھرا عمل ہے۔

تخلیق کے کرب سے بھرے ہوئے عمل میں قدرت نے کیف کی ایک شمع روشن کردی ہے۔ کیف کی یہ شمع انعام نہیں بلکہ ایک جال ہے کہ پھنسی ہوئی مچھلیاں نکلنے نہ پائیں۔ لیکن آپ کہیں گے یہ کیا تماشا ہے کہ یک دم شدت سے دکھ پہ آپہنچا؟ یہ بات قابلِ وضاحت ہے کہ شدت بذاتِ خود دکھ ہے، چاہے وہ خوشی کے جذبات کی شدت ہو یا غم کے۔

سوال یہ ہے کہ شدت کیا ہے؟ شدت ایک بلیک ہول ہے جس میں بمشکل بیس آدمیوں کے کھڑے ہونے کی جگہ ہے لیکن جس میں ۱۲۰ آدمی ٹھونس دیے گئے ہیں۔ شدت اس موٹر کار کے مصداق ہے جسے فسٹ گیئر میں ڈال کر ۸۰ میل کی رفتار سے چلایا جارہا ہو۔ سرکس کے اس بوڑھے شیر کے مصداق ہے جسے کوڑے مار مار کر تندی پر اُبھارا جارہا ہو۔

نفسیات کے مطابق خوشی ایک سطحی جذبہ ہے جو زندگی کے لق و دق صحرا میں یہاں وہاں دُور دُور بکھرے ہوئے نخلستانوں کی حیثیت رکھتا ہے، اور باقی چاروں جانب پھیلی ہوئی ریت ہی ریت، دکھ ہی دکھ۔

ادیب وہ احمق ہے جو شدت کی بھٹی تپائے بیٹھا ہے۔ جو شدت کے بلیک ہول کی گھٹن میں زندگی گزار رہا ہے۔ جو اپنے جسم کی مشین کو پہلے گیئر میں ڈال کر اسے ۸۰ میل کی رفتار سے دوڑا رہا ہے۔

یہ سب کس لیے؟ کس خوشی میں؟ کیا شہرت کی ایک تالی کے لیے جو کبھی مسلسل نہیں بجتی؟ کیا تخلیق کے کیف کے لیے جو انعام نہیں بلکہ ایک جال ہے؟

ہم کیوں فریب کھائے جانے پر مصر ہیں؟ ذرا سوچیے تو ہماری کیفیت بالکل ایسے ہے کہ:

نہ پوچھ حال، میں وہ چوبِ خشکِ صحرا ہوں
لگا کے آگ جسے قافلہ روانہ ہوا

ان وجوہات کی بنا پر میں آپ سے اپیل کرتا ہوں کہ دوستو، تخلیق کاری کے

اس جہنم سے اپنے آپ کو بچالو۔ اس ادب بازی سے توبہ کرلو۔ اب بھی وقت ہے۔ ابھی توبہ کے دروازے بند نہیں ہوئے۔

میں خصوصاً نوجوان ادیبوں سے اپیل کرتا ہوں کہ یہ تالی جس کی اُمید پر آپ "میں میں" کر کے بڑے طمطراق سے ایوانِ ادب میں داخل ہو رہے ہیں تاکہ اپنے آپ کو قربانی کا بکرا بنائیں، یہ تالی بہت جنگی پڑتی ہے، بہت مہنگی۔ اوّل تو یہ تالی بجتی نہیں۔ بج جائے تو جلد ہی رُک جاتی ہے مسلسل نہیں بجتی۔ اور پھر آپ میری طرح اس تالی کو سُننے کے لیے ماہیِ بے آب کی طرح تڑپتے ہیں۔

لیکن ٹھہریئے۔ ابھی تو میں نے صرف شدّت کی وضاحت کی ہے۔ ابھی میں نے شدّت کے اثرات کا تذکرہ نہیں کیا۔

موٹی بات کہ دوں۔ اگر آپ شدّت زدہ ہیں یعنی ادیب ہیں تو بیگم سے آپ کی کبھی نہیں بنے گی۔ ہمیشہ اَن بن رہے گی۔ ماں باپ سے نہیں بنے گی۔ ہم کاروں سے نہیں بنے گی۔ افسروں سے نہیں بنے گی۔ کسی سے نہیں بنے گی۔ ظاہر ہے اگر آپ شدّت کے سکوٹر پر سوار ہیں تو پیدل چلنے والوں سے آپ کا کیا واسطہ۔

صرف افراد کی بات نہیں، بذاتِ خود زندگی سے آپ کی ہم آہنگی نہیں ہوگی۔

اگر آپ میں شدّت ہے تو آپ کی حیثیت ایسی ہے جیسے دال میں "کوکرو" ہوتے ہیں۔ وہ دانے جو کبھی نہیں گلتے۔ جن میں گلنے کی صلاحیت ہی نہیں ہوتی۔ یعنی اگر آپ میں شدّت ہے تو آپ میل ایڈجسٹڈ ہیں۔

انگریز بڑا سیانا تھا۔ اس نے ایک خفیہ اصول مرتّب کیا تھا کہ ادبی طبیعت کے لوگوں کو سول یا ملٹری کے بڑے عہدوں پر فائز نہ کیا جائے۔ اس اصول کو عملی شکل دینے کے لیے اس نے پرسنیلٹی ٹیسٹ ایجاد کیے تھے اور شرط لگا دی تھی کہ اُمیدواروں کو یہ ٹیسٹ دیے جائیں۔ ان ٹیسٹوں میں دل کے سات پردوں میں دبی ہوئی شدّت اپنا پتا دے دیتی تھی۔

انگریز نے چناؤ کرنے والے بورڈ کو تاکید کر دی تھی کہ کوئی نالائق اُمیدوار پاس ہو جائے تو مضائقہ نہیں لیکن خبردار! کوئی ایسا اُمیدوار سروسز میں نہ آنے پائے جس کی سرشت میں ادبی شدت یا ادبی رجحان ہو۔

انگریز کا یہ اُصول آج بھی رائج ہے۔ پہلے جان بوجھ کر رائج تھا۔ اب شاید اَن جانے میں رائج ہے۔ لیکن ٹھہریے۔ ہو سکتا ہے حکومت کو اس اُصول کا علم ہو اور حکومت نے اس لیے اسے منسوخ نہ کیا ہو کہ وہ ادیبوں کی خیر خواہ ہے، بدخواہ نہیں۔

اس کے باوجود آج بھی کئی ایک ادیب طبیعت لوگ چوری چھپے اُونچے عہدوں پر بیٹھے ہیں۔ انھوں نے اپنے ادبی رجحانات کو کیما فلاژ کر رکھا ہے۔ ایڈمنسٹریشن اور ادیب طبیعت توازل سے دشمن چلے آتے ہیں۔ یہ اوصاف ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ حرکت اور قیام کبھی ساتھی نہیں بن سکے۔ کہتے ہیں گانے والی کا کام نہ چلے تو پان کی دکان کھول لیتی ہے۔ ادیب کا کام نہ چلے تو وہ نقّاد بن کر بیٹھ جاتا ہے۔

آج ادیب کی کیا کیفیت ہے؟

پہلی بات یہ ہے کہ ہمارا کوئی قاری نہیں۔ قاری کی عدم موجودگی میں اپنے آپ کو تسلّی دینے کے لیے ہم نے جگہ جگہ اربابِ ذوق کے حلقے بنا رکھے ہیں۔ ان محفلوں میں ہم من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو سے اپنی انا کی تسکین کرتے رہتے ہیں۔

اگر ہمارا کوئی قاری ہو بھی تو وہ بدنصیب سراسر مجبور ہے، کیونکہ کاغذ کی قلّت کی وجہ سے کتاب کی قیمت اس قدر بڑھ چکی ہے کہ کتاب خریدنا ایک اوسط درجے کے آدمی کے لیے ممکن نہیں رہا۔ چینی کو سب سیڈائیز کیا جا سکتا ہے۔ بناسپتی پر کنٹرول ریٹ عاید کیا جا سکتا ہے۔ لیکن کتاب جیسی غیر ضروری چیز مہنگی ہوتی ہے تو ہوا کرے۔

دوسری بات یہ ہے کہ ہمارے ادبی جریدے نزع کے عالم میں سِسک رہے ہیں۔ انھیں کاغذ نہیں ملتا۔ کیوں نہیں ملتا؟ تفصیلات کا تو مجھے علم نہیں البتہ سُننے میں آیا ہے کہ

وزارتِ اطلاعات صرف اسے کاغذ تسلیم کرتی ہے جو چلتی ہو۔ اسے نہیں جو نہ چلتی ہو۔ لہٰذا وہ چلتی ہیں کو بٹا ڈالتی ہے۔ آج کل کے دور میں ادب نہیں چلتا، سیاست چلتی ہے۔ لہٰذا کاغذ اخباروں کو ملتا ہے۔

ادبی جریدوں کو کاغذ نہیں ملتا۔ بلیک میں خریدنے کی استطاعت نہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ پرچہ چھ چھ مہینے کے بعد نکلتا ہے۔ مجھ سے پوچھیے تو میں اس صورتِ حالات پر بہت خوش ہوں۔ نوجوانوں میں ادبی رجحانات کی بیخ کنی کے لیے اس سے زیادہ موثر طریق کار کیا ہو سکتا ہے؟

میرے نقطۂ نظر کے مطابق یہ صورتِ حال بہت ہی اُمید افزا ہے۔ ہمیں وزارتِ اطلاعات کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ وہ ادبی رسائل کو کاغذ کا کوٹا دینے میں بخل سے کام لے کر اس میل اینڈ جسٹڈ گروہ کے لیے جسے ادیب کہتے ہیں، صحت مندانہ زندگی بسر کرنے کا راستہ ہموار کر رہی ہے۔

اس سلسلے میں حکومت نے بڑی دُور اندیش پالیسی اختیار کر رکھی ہے۔ امداد دینے کے لیے وزارتِ تعلیم نے جو مد بنا رکھی ہے اس کا نام لرننڈ باڈیز ہے۔ لٹریری باڈیز کی مد کا وجود ہی نہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ ادب اور علم دو مختلف چیزیں ہیں۔ ان میں کوئی ہم آہنگی نہیں۔ بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ وہ ایک دُوسرے کے منافی ہیں۔ اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ دل اور ذہن ہمیشہ ہی برسرِ پیکار رہتے ہیں۔

حکومت ادیبوں کی ہمدرد ہے۔ ان کی اعانت کرنے میں خوشی محسوس کرتی ہے۔ لیکن اعانت کے لیے حکومت نے ایک شرط عاید کر رکھی ہے۔ پوری امداد حاصل کرنے کے لیے ادیب پر لازم ہے کہ وہ مر جائے۔ اگر آپ مرنے کے لیے تیار نہیں تو کم از کم خطرناک طور پر بیمار پڑ جانا ضروری ہے۔ بیمار پڑ جاؤ تو وزارتِ اطلاعات کی سفارش پر ہسپتال اور دوائی کے خرچ کے علاوہ دو وقت کی روٹی بھی ملتی ہے۔

یقین جانیے، مر جانا بہت مشکل کام ہے۔ میں کئی ایک برس سے مسلسل کوشش کر رہا ہوں، لیکن ابھی تک کامیاب نہیں ہُوا۔ میں نے ہارٹ اٹیک بھی آزما دیکھا۔

تیسری بات یہ ہے کہ ادیبوں کو پبلشر نہیں ملتا۔ اگر مل جائے تو پبلشر کی دو شرطیں ہوتی ہیں: پہلی یہ کہ آپ کی تصنیف ناول ہو۔ اس میں نسیمِ سحری چلے، پھول کھلیں، کوئل کو کے اور اس پس منظر پر ہیرو اور ہیروئن رومانی مکالموں کے فوارے چلا دیں۔ مجھے ان کی یہ شرط بھی منظور ہے۔ لیکن دقت یہ ہے کہ ان کی دوسری شرط بڑی ٹیڑھی ہے۔ دوسری شرط یہ ہے کہ اپنا نام بدل کر فیروزہ خاتون رکھ لوں۔

حفیظ ہوشیارپوری یہ تمنا لیے فوت ہو گیا کہ اس کا دیوان چھپ جائے۔ اور بہت اچھا کیا اس نے کہ فوت ہو گیا۔ ورنہ دیوان نہ چھپتا۔

میں نے حال ہی میں اپنی ایک کتاب کے بارے میں ایک پبلشر سے بات کی۔ اس نے بڑے ادب اور احترام سے معذرت کر دی۔ کہنے لگا "جناب والا، ہم تو مصنفوں کی چیزیں چھاپتے ہیں، آپ تو مصنفوں کے مصنف ہیں۔" اس کا یہ جملہ میرے دل میں خوشی کے کے اتنے انبار لگا گیا کہ کتاب چھپوانے کی ضرورت ہی نہیں رہی۔

محمد طفیل نے مجھ سے کہا "میری صرف ایک خواہش ہے کہ کوئی اللہ کا بندہ نقوش کے نظرثانی شدہ نمبر چھاپ دے۔" میں نے پوچھا کہ اگر تمھاری یہ خواہش پوری ہو جائے تو تمھیں کیا حاصل ہوگا؟ بولا "پھر میں سکون کی موت مر سکوں گا۔" میں نے کہا "بھائی، اگر تم بے سکونی کی موت مر جانے کی زحمت کر لو تو ممکن ہے تمھاری یہ خواہش پوری ہو جائے۔ صرف ایک شرط ہے کہ مرنے میں تاخیر نہ کرو۔ اگر تم نے فیصلہ کرنے میں حفیظ جالندھری کی طرح دیر لگا دی تو لوگ نقوش کو بھول جائیں گے۔ پھر موت بھی کام نہ آئے گی۔"

اس مشکل سے نکلنے کے لیے میں نے ایک تجویز سوچی ہے۔ میرا ارادہ ہے کہ ایک اشتہار کے ذریعے اعلان کر دوں کہ جو پبلشر میری کتاب چھاپے اور بیچے گا، اس سے رائلٹی وصول کرنے کے بجائے میں خود اسے اپنی جیب سے نقد رائلٹی ادا کروں گا۔ صرف پبلشر کی بات ہی نہیں، میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ آئیے اپنے آپ کو زندہ اور چالو رکھنے کے لیے ہم

ریڈیو اور ٹی وی کو بھی اپنے پروگرام کے عوض پیسہ ادا کرنے کی پیش کش کر دیں۔

کئی ایک سال پہلے حکومتِ پنجاب نے ادیبوں کے لیے مکانات بنانے کا فیصلہ کیا تھا۔ پھر بات حکومت کی سمجھ میں آ گئی اور اس نے اپنا فیصلہ بدل دیا، کہ مکانات ادیبوں کو نہیں بلکہ فعّال صحافیوں کو دیے جائیں گے۔ مجھے ڈر ہے کہیں پھر سے ادیبوں کو مکانات دینے کی بات نہ چل نکلے۔ کہیں ادیب آباد نہ ہو جائیں۔ کہیں ادیب آرام سے دو وقت کھانے نہ لگیں۔ کہیں ادیب کسی گنتی شمار میں نہ آ جائیں۔ اگر ایسا ہو گیا تو نوجوانوں کے دلوں میں ادیب بننے کی خواہش بیدار ہو جائے گی اور ان کی زندگیاں تباہ ہو جائیں گی۔

آخر میں میں آپ سے پھر اپیل کرتا ہوں کہ دوستو، تخلیق کاری کے اس جہنّم سے اپنے آپ کو بچا لو۔ شدّت کے اس تندور سے اپنے آپ کو نکال لو۔ سیل اڈجسٹمنٹ کے جہنّم سے نکلو۔ ادب کے اس لق و دق ویرانے میں کس اُمید پر بیٹھے ہو، جہاں قاری نہیں، پبلشر نہیں، جریدہ نہیں، ایک تالی کی اُمید پر؟

(حلقۂ اربابِ ذوق اسلام آباد کے سالانہ اجلاس کے لیے لکھا گیا)

کلچر، سیمینار اور ادیب

ہمارے ہاں آج کل کلچر کا تیتر بول رہا ہے۔ لوگ پوچھ رہے ہیں: کیا کہتا ہے؟ صاحب اور بیگم کہتے ہیں "کہہ رہا ہے، ڈرائینگ روم سجا، مغربی گانا گا، انگریزی بول، منی پہن اور کلچرڈ بن جا۔" سیاست دانوں سے پوچھو تو وہ کہتے ہیں "کلچر ایک ہتھیار ہے جسے سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔" نوجوان سے پوچھو تو وہ کہتا ہے "بال بڑھاؤ، رنگ دار کُرتے پہنو اور کوکا کولا پیو۔" کسی یونیورسٹی سے پوچھو تو وہ کہتی ہے "گھبراؤ نہیں۔ ہم نے خالص امریکی خطوط پر ریسرچ کا ادارہ بنا دیا ہے جو بہت جلد پاکستانی کلچر کا سارا بکھیڑا حل کر دے گا۔"

فلم کاروں سے پوچھو تو جواب دیتے ہیں "ہم نے پنجابی فلموں میں پنجاب کے کلچر کی وضاحت کر دی ہے۔ اب یہ گاؤں والوں کا کام ہے کہ وہ اپنی زندگی اس کے مطابق ڈھالیں۔" وزارتِ تعلیم سے پوچھو تو وہ کہے گی "ہم نے تو اس کام کے لیے آرٹ کونسلیں بنا دی ہیں۔ اب کونسلیں جانیں اور ان کا کام۔" کونسلوں سے پوچھو تو وہ کہیں گی "سیدھی بات ہے۔ کلچر کا مطلب ہے قوالیاں کراؤ، فرانسیسی ڈرامے لکھواؤ، باہر سے آنے والے ٹروپ کا زندہ ناچ کراؤ۔ اللہ اللہ خیر سلا۔"

اہلِ زبان سے پوچھو تو وہ کہیں گے "میاں کلچر زبان کا ایک جزو ہے۔ اپنے ع، ق ٹھیک کر لو تو مہذب و متمدن بن جاؤ گے ورنہ ڈھگے کے ڈھگے رہ جاؤ گے۔" ادیبوں سے پوچھو تو ..... لیکن ادیبوں کو پوچھتا ہی کون ہے؟

وزارتِ تعلیم نہیں پوچھتی۔ بے چاری مجبور ہے۔ چونکہ علم دوست ہے لہٰذا صرف

لنڈے بازار کی دکان سجائے بیٹھی ہے۔ وزارتِ اطلاعات نہیں پوچھتی۔ شکر ہے نہیں پوچھتی۔ جو پوچھے تو صرف اس خیال سے پوچھے گی کہ ادیبوں سے کیا کام لیا جا سکتا ہے۔ آرٹ کونسل کیوں پوچھے؟ اسے تو صرف آرٹ اور آرٹسٹ سے تعلق ہے۔ آرٹ کونسل کے نزدیک آرٹ کا مطلب خالص "ماڈ" ہے اور آرٹسٹ وہ ہے جس نے ٹی وی پر رول کر رکھا ہو۔ عالم اور دانشور نہیں پوچھتے کیونکہ ان کے نزدیک علم وہ ہے جس میں سے کتاب کی بو آئے اور جو مسائل کو حل کرنے کی بجائے اُلٹا انھیں مزید اُلجھا دے۔ شاید اسی لیے تلقین شاہ بار بار کہا کرتے ہیں کہ پاکستان اور اسلام کو کبھی کسی ان پڑھ نے نقصان نہیں پہنچایا۔

آج ہمارے سامنے ایک اہم مسئلہ ہے "کلچر اور ادب"۔ امریکا نے اہم مسائل کو حل کرنے کا جدید طریقہ وضع کر دیا ہے۔ کوئی حل طلب مسئلہ ہو اس پر سیمینار کرا دو۔ سیمینار کرنے کے لیے دو باتیں ضروری ہیں۔ ایک تو کمرا ائیر کنڈیشنڈ ہو، دوسرے کلام اور طعام ساتھ ساتھ چلیں۔ اس لحاظ سے حلقۂ اربابِ ذوق کا یہ سیمینار خام ہے۔ کیونکہ اس میں خالی کلام ہی کلام ہے نہ کمرا ائر کنڈیشنڈ ہے، نہ طعام کی خوشبو آ رہی ہے۔

آپس کی بات ہے۔ کہہ دوں تو کیا ہرج ہے۔ نفسیات کے لحاظ سے ادیب بچے ہوتے ہیں۔ کسی کو کچھ کرتے دیکھ کر مچل اُٹھتے ہیں کہ "میں بھی"۔ یہ سیمینار بھی غالباً اسی جذبے کے تحت کرایا گیا ہے۔ اس سے آپ یہ نہ سمجھ بیٹھیں کہ یہ سیمینار دوسروں کو دکھانے، غیروں پر رعب ڈالنے یا بڑے آدمیوں کو متاثر کرنے کے لیے کرایا جا رہا ہے۔ نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ صرف اس لیے کرایا جا رہا ہے کہ اپنے آپ کو حوصلہ دیں کہ ہم بھی منھ میں زبان رکھتے ہیں۔

حال ہی میں رومانیہ کے شہر بخارسٹ میں ایک عالمی سیمینار ہوا تھا۔ اس میں پاکستان کے دو بھانڈ بھی جا پہنچے۔ ایک بھانڈ نے دوسرے سے پوچھا:

"یہ کیسا رولا گولا ہے؟"

"سیمینار ہو رہا ہے" دوسرے نے جواب دیا۔

"وہ کیا ہوتا ہے؟"

"سیانوں کا اکٹھ ہوتا ہے۔"

"اکٹھے ہو کر سیانے کیا کرتے ہیں؟"

"باتیں کرتے ہیں، کھاتے پیتے ہیں۔"

"پھر؟"

"پھر باتیں کرتے ہیں، کھاتے پیتے ہیں۔"

"پھر؟"

"پھر باتیں کرتے ہیں، پھر کھاتے پیتے ہیں۔ پھر باتیں کرتے ہیں، پھر کھاتے پیتے ہیں۔ حتیٰ کہ مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔"

سیمینار کے متعلق ابنِ انشا اپنے ایک کالم میں لکھتے ہیں:

"دورِ حاضر کی جدید ترین ایجاد سیمینار ہے۔ کوئی مسئلہ ہو، کوئی مشکل ہو، سیمینار کرائیے اور بھلے چنگے ہو جائیے۔ سیمینار میں اور بھی کئی ایک خوبیاں ہیں۔ کرسی پر بیٹھے بٹھائے کام ہو جاتا ہے۔ کپڑے بھی میلے نہیں ہوتے۔"

ابنِ انشا نے اپنے کالم میں کھانے پینے کی بات نہیں کی۔ شاید اس لیے کہ طبعاً وہ نمک حرام نہیں ہیں۔ بلکہ حقِ نمک ادا کرنے کے شدت سے قائل ہیں۔ بہر طور کھانا پینا سیمینار کا ضروری جزو ہوتا ہے۔ جو چاہو کھاؤ پیو۔ چاہے چائے پیو۔ چاہے آئس کریم کھاؤ۔ چاہے کوک پر گزارہ کر لو۔ یا وہ پیو جسے پیے بغیر کلچرڈ ہونے کا دعویٰ عبث ہے۔ ہاں تو ابنِ انشا لکھتے ہیں:

"آج کل سیمیناروں کی ریل پیل ہے۔ کہیں قوم کے حالات پر سیمینار کہیں مچھروں کی بہتات پر سیمینار۔

صرف بنارسٹ میں ہی نہیں ہمارے ہاں بھی اصلی اور "وڈّے" سیمینار ہوتے رہتے ہیں۔ آج کے سیمینار کی طرح دیسی اور غیر مہذّب سیمینار نہیں بلکہ کلچرڈ سیمینار۔ ابھی پچھلے مہینے ہی انشاء کان میں کلچر کے موضوع پر سیمینار ہوا تھا۔ اس سیمینار میں "زیبو" نے کہا تھا:

'ہمارے ہاں دستور ہے کہ کلچر پر باتیں ہوتی ہیں، مُنھ زبانی باتیں۔ تخلیق نہیں ہوتی۔ کلچر کے ادارے صرف زندہ ناچ گانے کرا کر سُرخرو ہو جاتے ہیں۔'

انشاء کان کے اس سیمینار کی روئداد پر ابنِ انشا لکھتے ہیں :

"سیمینار میں سوال اُٹھا کہ پاکستانی کلچر کیا ہوتا ہے؟ یہ سوال اُٹھا تو اُٹھتا ہی چلا گیا۔ اسے بٹھانا مشکل ہو گیا۔ جب ملزم پکڑا ہی نہ جائے گا تو اسے سزا دینا کیا معنی؟ اور بڑے شہروں میں سر پبلک آرٹ کونسلوں کی اہمیت تسلیم، جن میں امیر خانوادوں کی صاحبزادیاں دفع الوقتی کے لیے جمع ہوتی ہیں اور نمائش ہوتی ہے۔ اور نمائش دیکھنے والیوں کو دیکھنے کے لیے لوگ کشاں کشاں پہنچتے ہیں۔" دروغ برگردنِ انشا، سیمینار میں حصہ لینے والے محققین کا متفقہ فیصلہ تھا کہ مسئلہ یہ ہے کہ کلچر کی نعمتیں جو آرٹ کونسلوں میں بٹی ہوئی ہیں، انھیں عوام تک کیسے پہنچایا جائے۔

مجھے اس فیصلے سے پورا اتّفاق نہیں۔ یہ درست ہے کہ کلچر کی نعمتیں آرٹ کونسلوں میں بٹی ہوئی ہیں۔ مسئلہ یہ نہیں کہ کس طرح ان نعمتوں کو کلچر کے صحیح وارثوں یعنی اہلِ دیہات تک پہنچایا جائے۔ مسئلہ تو یہ ہے کہ کس طرح آرٹ کونسلوں کی توجّہ نعمتوں سے ہٹا کر کلچر کی طرف مبذول کرائی جائے۔ کس طرح انھیں "ماڈ" سے ہٹا کر شدھ کا احساس دلایا جائے۔

پُرانے زمانے میں کسی ملک کو زیرِ اثر لانے کے لیے فوج کشی کی جاتی تھی۔ اسے فتح کر کے کالونی بنا لیا جاتا تھا۔ اتنی مصیبت کون کرے؟ آجکل ایک شارٹ کٹ دریافت کر لیا گیا ہے۔ فوجی محاذ کی جگہ کلچر محاذ کھول دو۔ گولیاں چلانے کی بجائے کوک کی بوتلیں چلا دو۔ حسن کے سنگار کا راز افشا کر دو۔ ٹینک کی جگہ جینز چلاؤ۔ رمبی کو حرکت میں لاؤ۔ آرٹ کونسل کو

"ماڈ" بنا دو۔ آرٹسٹوں کا رُخ ہالی وڈ کی طرف پھیر دو۔

اقتصادی اور سیاسی برتری حاصل کرنے کے لیے ایلین کلچر نے پاکستان کا محاصرہ کر رکھا ہے۔ حملہ آور خود محاصرے میں شامل نہیں۔ اس کی کیا ضرورت ہے؟ ان کے مقامی ایجنٹ جو ہیں یہ شہر ہے۔ آرٹ کونسلیں ہیں۔ کالا صاحب ہے۔ آسان سا تو کام ہے۔ بس یہی نا کہ دیہاتی کلچر کی تضحیک کرو۔

پھر کالے صاحب کے دو رُوپ ہیں۔ بیوروکریٹ ہے جو علانیہ انگریزیت کو اوڑھنا بچھونا بنائے بیٹھا ہے۔ بیگم ہے جو حُسن کے سنگار کا بھید جاننے کی خاطر میم بنی پھرتی ہے۔

گزشتہ ۲۶ برس سے بڑے سے بڑے دانشور سوچ رہے ہیں کہ ہمارا کلچر کیا ہے؟ بالکل ایسے ہی جیسے فرنگی فلسفی دیہات کی ایک اپلوں بھری کچّی دیوار کے سائے میں بیٹھا سوچ رہا تھا، سوچے جا رہا تھا۔

دیہات کی ایک بی بی نے پُوچھا "بیبا، تو کیا سوچ رہا ہے؟"

فرنگی فلسفی بولا "سوچ رہا ہوں کہ بھینس دیوار پر کیسے چڑھی؟"

بی بی نے حیرت سے فرنگی کی طرف دیکھا۔

فرنگی نے کہا "بھینس نے دیوار پر گوبر کیسے کیا ہے؟"

دیہاتن ہنسی۔ بولی "تو اتنی سی بات پر ہلکان ہو رہا ہے۔" پھر اس نے گوبر کا ایک تازہ اُپلا بنایا اور زن سے پھینک کر دیوار پر لگا دیا۔

دانشوروں کی اس سوچ بچار کی نوعیت "بغل میں کٹورا شہر میں ڈھنڈورا" کے مصداق ہے۔ جی نہیں مانتا کہ دانشور کٹورے کے وجود سے بے خبر ہیں یا اس کی نشان دہی کرنا نہیں چاہتے۔ وہ دیہات کو اہمیت دینا نہیں چاہتے۔ کیونکہ اگر دیہات کو اہمیت دے دی گئی تو ان کے ہاتھ میں کیا رہ جائے گا؟

کلچر کو تلاش کرنے کی یہ دوڑ اُردو کو قومی زبان بنانے کی ۲۶ سالہ جدوجہد کے

مترادف ہے۔ ۲۶ برس سے کمیٹیاں بیٹھی سوچ رہی ہیں کہ کس طرح اُردو کو قومی زبان بنایا جائے؟ تجربہ شاہد ہے کہ جس مسئلے کو حل کرنے کے لیے کمیٹیاں بٹھا دی جائیں، وہ کبھی حل نہیں ہوتا، کیونکہ کمیٹیوں کو خطرہ لاحق ہو جاتا ہے کہ مسئلہ حل ہو گیا تو کمیٹی کے وجود کا جواز نہیں رہے گا۔

شہر کے لوگ کلچر کا مسئلہ حل نہیں کریں گے۔ سیدھی بات ہے کہ مسئلہ حل ہو گیا تو شہر کی اہمیت ختم ہو کر رہ جائے گی۔ شہر کے لوگ بیس فی صد ہونے کے باوجود ۸۰ فی صد دیہاتی عوام کے نمایندے بنے بیٹھے ہیں۔ شہر کے ساتھ کلچر اور آرٹ کے وہ ادارے بھی ختم ہو جائیں گے جو کلچر کی نمایندگی کر رہے ہیں۔ مزید برآں اہلِ زبان کی عظمت بھی خاک میں مل جائے گی۔ کالے صاحب کے بعد اہلِ زبان کلچر کے اس کٹورے کو دریافت کرنے سے خوف زدہ ہیں۔ اہلِ زبان کے ہاتھ میں صرف ایک ہتھیار ہے اور وہ ہے زبان جسے وہ تلوار کی طرح چلاتے پر مجبور ہیں۔ کچھ محققین کا کہنا ہے کہ اُردو کو فرنگی نے اس لیے رائج کیا تاکہ عربی اور فارسی کے اثرات کو رد کیا جائے۔

بہرطور، یہ حقیقت مسلّم ہے کہ اُردو ایک درباری زبان ہے جس میں درباداری کا رنگ ہے۔ چونکہ درباردار ہے اس لیے بات بڑھا چڑھا کر کرتی ہے۔ نوابوں اور جاگیرداروں کی ترجمان ہے۔ بورژدا ہے۔ چٹ کپڑی ہے، کلاہ اور طرہ سجائے بغیر دم نکلتا ہے۔ جذبات کا شیرہ اتنا گاڑھا ہے کہ حقیقت نگاری سے جی چُراتی ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کی جڑیں لوک ریت میں پیوست نہیں۔ کیسے پیوست ہوں؟ نوابوں کی لونڈی کو لوک سے کیا واسطہ؟ جبھی تو اُردو میں نہ کوئی لوک گیت ہے، نہ لوک کہانی۔ اسی وجہ سے اہلِ زبان خائف ہیں کہ اگر کلچر کا مرکز گاؤں قرار دے دیا گیا تو زبان کے ہتھیار کی دھار کند ہو جائے گی اور وہ نہتے ہو کر رہ جائیں گے۔ لہٰذا امان اسی میں ہے کہ کٹورا بغل میں رہے اور تلاش جاری رہے۔

اب سُننے میں آ رہا ہے کہ حکومت کی خواہش کے مطابق، کلچر کی ایک الگ وزارت بن رہی ہے۔ گھبرائیے نہیں۔ اس وزارت میں ادب کا کوئی شعبہ نہیں ہو گا۔ اس میں کلچر ہو گا،

آرٹ ہوگا، سائنس ہوگی اور کھیل ہوں گے۔ ادب نہیں ہوگا۔ آرٹ کونسل نے گزشتہ دو سال میں ثابت کر دیا ہے کہ ادب آرٹ نہیں۔ لہٰذا ادب یا ادیب سے رابطہ رکھنا کونسل کے شایانِ شان نہیں۔

آپ کہیں گے یہ ادب کی بڑی بدنصیبی ہے کہ اسے وزارتِ کلچر میں کوئی مقام نہ ملے۔ نہ نہ نہ نہ۔ ایسی بات نہیں۔ نظرِ غائر سے دیکھیے تو آپ پر بھید کھل جائے گا کہ اُلٹا یہ ادب کی خوش قسمتی ہے۔ کیونکہ وزارتِ کلچر شہری کلچر کو تقویت دے گی، مغربی آرٹ کو فروغ دے گی اور سچے دیہاتی کلچر کے لیے مزید تحقیر پیدا کرے گی۔ اگرچہ اس کا نام وزارتِ کلچر ہوگا لیکن کام ان عناصر کو تقویت دینا ہوگا جو ہمارے حقیقی کلچر کی بیخ کنی کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مقامِ شکر ہے کہ ادیب اس فریب میں شریکِ کار نہ ہوگا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہمارا وہ کون محسن ہے جو در پردہ ادب اور ادیب کی اعانت کر رہا ہے؟ ہمیں فریب کاری سے بچانے کے لیے کوشاں ہے؟

ظاہر ہے کہ وہ کسی وزارت کا اہل کار ہوگا۔ اہل کاروں میں بہت سے اعلیٰ پائے کے ادیب موجود ہیں۔ ان میں بڑی صلاحیتیں موجود ہیں۔ لیکن وہ کھُل کر سامنے نہیں آتے۔ بیچارے مجبور ہیں۔ اس لیے کہ حکومت ادیبوں کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتی۔ ہماری حکومت کی ہی بات نہیں، ہر حکومت ادیبوں سے بدظن ہوتی ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ حکومت اور ادیبوں کی ہمیشہ سے اَن بن رہی ہے۔ کیا پتا کسی وقت ترنگ میں آ کر ادیب کیا کہہ دے۔ اسی خطرے سے خود کو محفوظ رکھنے کے لیے تو مغلوں نے دربار میں رتن رکھنے کا رواج ڈالا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ ادیب دربار دار بن جائیں۔

سچ پوچھیے تو سارا قصور میرا اپنا ہے۔ کیونکہ میں اہل کار ادیب کے سامنے جھکنے میں فخر محسوس کرتا ہوں۔ مجھے اس بات پر ناز ہے کہ مولانا کوثر نیازی نے مجھ سے مسکرا مسکرا کر باتیں کی ہیں۔ حنیف رامے نے ایک بار مجھے فون کیا تھا۔ مسعود مفتی نے چائے پر بلایا تھا۔ اور مجھے

فخر ہے کہ ممتاز مسعود نے میری خاطر ایک اصُول توڑا تھا، ایک ادیب سے دفتر میں ملاقات کرنا منظور کیا تھا، دفتر میں ادب پر گفتگو کرنی گوارا کی تھی۔ اور مجھے فخر ہے کہ قدرت اللہ شہاب دوسرے اہل کاروں کے سامنے مجھے کرسی پر بیٹھے رہنے کی اجازت دیتے تھے۔

ہاں، تو میں کہہ رہا تھا کہ ادیبوں کی یہ خوش قسمتی ہے کہ وزارتِ کلچر میں ادب کا کوئی شُعبہ قائم نہیں کیا گیا۔ ورنہ وزارت اس شعبے کو سیکشن افسر کے حوالے کر دیتی اور سیکشن افسر اسے آرٹ کونسلوں کے حوالے کر دیتا۔ اور کونسلیں ادیبوں سے قوالیاں کرواتیں اور کلچر کی خدمت کے لیے ہمیں زندہ ناچ گانا بنا دیتیں۔

(یہ مضمون آرٹ کونسل کے سیمینار میں پڑھا گیا)

اِشتہار، پی آر اور اَدب

اِشتہار دورِ حاضر کا سب سے بڑا ہتھیار ہے۔ اِشتہار نے دراصل میس میڈیا سے جنم لیا۔ میس میڈیا بہت بڑی طاقت ہے، جسے برسرِ اقتدار لوگوں نے ایجاد اور رائج کیا ہے۔

میس میڈیا کا کام عوام کی سوچ کو مخصوص رُخ عطا کرنا ہے، ایسا رُخ جو برسرِ اقتدار لوگوں کے مفادات کے مطابق ہو اور انھیں بڑھاوا دے۔ یہ رُخ ایسے انداز سے عطا کیا جاتا ہے کہ عوام کو شک نہیں پڑتا کہ عطا کردہ ہے۔ اُلٹا وہ سمجھتے ہیں کہ ان کا اپنا ہے جو انھوں نے بڑی سوچ بچار کے بعد اپنایا ہے۔

مثال کے طور پر میں خود کو ایک سکہ بند دانشور سمجھتا ہوں۔ میرا ایمان ہے کہ میں ایک آبجکٹو مفکر ہوں۔ اخبارات میں مَیں صرف "نیوز" پڑھتا ہوں "ویوز" نہیں پڑھتا، اور حالات کے متعلق اپنی رائے خود قائم کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ پھر بھی میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ میرے نقطۂ نظر میں کون کون سا زاویہ عطا کردہ ہے اور کون کون سا میرا اپنا ہے۔ بڑی بڑی اور بہت سی طاقتیں مجھے اپنا زاویۂ نظر عطا کرنے کے لیے مصروفِ کار ہیں۔ گھاس کے ڈھیر سے سچ کی سُوئی کون تلاش کرے!

رُخ عطا کرنے کے کام کی اہمیت اور عظمت شاید اس مثال سے واضح ہو سکے جو میں آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

پُرانی بات ہے۔ چڑیا گھر لندن کے منتظمین نے فیصلہ کیا کہ چڑیا گھر میں ایک برفانی ریچھ رکھا جائے۔ اسے رکھنے کے لیے ایک فراخ کمرا تعمیر کیا گیا۔ ایسی مشینیں لگائی گئیں جو

کمرے میں وہی ٹمپریچر قائم رکھتی تھیں جس میں برفانی ریچھ رہنے کا عادی ہوتا ہے۔ کمرے کا فرش غیر ہموار بنایا گیا تاکہ ٹہلتے وقت وہ بیگانگی محسوس نہ کرے۔

انتظامات مکمل کرنے کے بعد ایک برفانی ریچھ مہیا کیا گیا۔ لیکن ریچھ اس کمرے میں چند ایک روز ٹھیک ٹھاک رہا۔ پھر بیمار پڑ گیا اور مر گیا۔ پھر دوسرا ریچھ منگوایا گیا۔ وہ بھی چند دنوں کے بعد مر گیا۔

منتظمین حیران تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ جب ٹمپریچر موزوں ہے، کمرا بھی بہت فراخ اور فرش بھی ناہموار ہے، پھر ریچھ زندہ کیوں نہیں رہتا؟ انھوں نے سپیشلسٹوں سے مشورے کیے۔ ان کی بھی یہ مسئلہ سمجھ میں نہ آیا۔ آخر کسی نے کہا "بھئی"، اشتہار دو کہ جو شخص اس مسئلے کو حل کرے گا، اُسے انعام دیا جائے گا۔ اتّفاق سے وہ اشتہار کسی پبلسٹی ایکسپرٹ کی نگاہ پر چڑھ گیا۔ اس نے جا کر موقع دیکھا۔ پھر منتظمین سے ملا۔ کہنے لگا: سیدھی بات ہے۔ ریچھ اس کمرے میں ایٹ ہوم محسوس نہیں کرتا۔ اسے یہ احساس دلانے کی ضرورت ہے کہ وہ برفانی پہاڑوں میں مقیم ہے۔ لہٰذا کسی پینٹر کو بلائیے۔ اس سے کہیے کہ کمرے کی دیواروں پر برفانی پہاڑوں کی تصویریں پینٹ کر دے۔ اس کے بعد تیسرا ریچھ سالہا سال اسی کمرے میں بخیر و عافیت اور خوش و خرّم رہا۔

دُنیا میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جن کی زندگی کی چار دیواری پر کسی نا کسی اِزم کے میڈیا نے ایسی تصویریں پینٹ کر رکھی ہیں جن کے سہارے وہ خوش و خرم زندگی بسر کر رہے ہیں۔

میڈیا کی طاقت کو محسوس کرنے کے بعد تاجروں نے اس راز کو پا لیا کہ اپنی مصنوعات کو بیچنے کے لیے وہ میڈیا کے اصولوں سے فائدہ حاصل کر سکتے ہیں۔ لہٰذا انھوں نے اشتہار ایجاد کیا۔

اشتہار آج کے دور میں بے پناہ طاقت حاصل کر چکا ہے۔ مثلاً چائے کی پتّی کے سوداگروں نے سوچا کہ اگرچہ چائے ایک گرم مشروب ہے اور اسے گرم ملکوں میں رائج کرنا

دشوار ہے، لیکن گرم ممالک میں رائج کیے بغیر چارہ نہیں۔ لہٰذا عوام کی سوچ کو ایسا رُخ دیا جائے کہ ان کے لیے چائے قابلِ قبول ہو جائے۔ یہ اُس زمانے کی بات ہے جب برِصغیر میں طبِ یونانی کا دور دورہ تھا۔ عوام کسی چیز کو استعمال کرنے سے پہلے سوچتے تھے کہ چیز کی تاثیر کیا ہے۔ گرم ہے، ٹھنڈی ہے یا معتدل۔ ان دنوں لوگ لسّی پینے کے عادی تھے اور حتی الوسع گرم خشک اشیا سے اجتناب کرتے تھے۔

ان باتوں کو مدِ نظر رکھ کر چائے کمپنیوں نے جو پہلا اشتہار جاری کیا وہ یہ تھا:

گرمیوں میں گرم چائے ٹھنڈک پہنچاتی ہے۔

بظاہر یہ ایک عام سا جملہ ہے، لیکن میں اسے ایک عظیم جملہ سمجھتا ہوں۔ اس جملے نے خامی کو ایک ایسا رُخ بخش دیا کہ وہ خوبی بن گئی۔ اس جملے کو بار بار دُہرایا گیا۔ اتنی بار دہرایا گیا کہ اب بھی جب کبھی شدت کی گرمی پڑتی ہے تو میرا جی چاہتا ہے کہ ایک پیالہ چائے کا پی کر گرمی کے ڈنک سے نجات حاصل کر لوں۔

اشتہار اخبارات، ریڈیو اور ٹی وی تک محدود نہیں ہوتا۔ کئی ایک اشتہارات فضا میں چھوڑ دیے جاتے ہیں، جس طرح ویگنوں کے اگزاسٹ دُھواں فضا میں چھوڑتے ہیں۔ کئی ایک اشتہارات زیرلبی کے سپرد کر دیے جاتے ہیں۔

مثال کے طور پر تقسیم سے پہلے جب جاپان نے اپنے کل پُرزے نکالے تو انھوں نے یہ وتیرہ اختیار کیا کہ ولایت کی ہر نئی ایجاد کی نقل کر کے اسے آدھی قیمت پر منڈی میں پہنچانے لگے۔ اس پر ولایت کے لوگ گھبرا گئے۔ گھبراہٹ کی بات تو تھی، کیوں کہ منڈی ہاتھ سے نکلی جا رہی تھی۔ اس لیے انھوں نے جاپان کی مصنوعات کی تذلیل کے لیے ایک زیرلبی چلا دی کہ "جاپانی ہے"۔ مطلب تھا کہ ناقابلِ اعتبار ہے، سرسری ہے، دیرپا نہیں۔

یہ زیرلبی اشتہار سرگوشیوں میں چلا اور پھر اس قدر عام ہو گیا کہ لوگ علانیہ کہنے لگے "ہٹاؤ یار، جاپانی ہے۔" پہلے چیزیں جاپانی ہوئیں، پھر خیالات جاپانی ہوئے۔ پھر

افراد کے متعلق کہا جانے لگا کہ جاپانی ہے۔ یعنی جاپانی کا مفہوم مصنوعی سمجھا جانے لگا۔

اگر جاپانی قوم اس قدر ضدی، ہٹ دھرم اور محنتی نہ ہوتی تو اس زہریلی اشتہار سے بچ نہ سکتی تھی۔ تحقیر کی اس دھار سے جانبر نہ ہو سکتی تھی۔ لیکن جاپانیوں کا جواب نہیں۔ اتنے بڑے وار کو ناکارہ کر دیا۔ اور دیکھیے آج صنعتی میدان میں جاپانی کس مقام پر فائز ہیں۔ انگریز نے ہندیوں کی تحقیر کے لیے بابُو کا لفظ فضا میں چلایا۔ بابو دراصل "بیبون" کا مخفف ہے۔ بیبون کا مطلب بندر ہے۔ اور ملاحظہ ہو کہ ہم آج بھی بابُو کہلوانے پر فخر محسوس کرتے ہیں۔

میس میڈیا کے اس اشتہاری جوہر کی حیرت انگیز تاثیر کو دیکھ کر پڑھے لکھے سمجھدار لوگوں نے اسے برتنا شروع کر دیا۔ مثلاً دفتر والوں نے اس بات کو شدت سے محسوس کیا کہ کام کرنا اور بات ہے، کام کرتے ہوئے نظر آنا اور بات۔ یعنی کام کرنا اہم نہیں، کام کرتے ہوئے نظر آنا اہم ہے۔ کامی ہونا اہم نہیں، کامی ہونے کا تاثر دینا اہم ہے۔ لہٰذا انھوں نے دفتر کے کاریڈور میں یوں چلنا پھرنا شروع کر دیا جیسے شدت سے مصروف ہوں۔ اور چھٹی کے بعد اپنی میز پر فائلیں یوں پھیلانا شروع کر دیں کہ بڑے صاحب گزرتے ہوئے دیکھیں تو سمجھیں کہ کام میں اس قدر شدت سے مصروف ہے کہ پتا ہی نہیں چلا کہ دفتر بند ہو چکا ہے۔

یہ بھی اشتہار کا ایک انداز ہے۔

یوں لوگوں کو اپنی ذات کے متعلق اشتہار دینے کی عادت پڑی۔ اس روش نے دُوسرے لوگوں کو بھی متاثر کیا۔ مثلاً ادیب، شاعر اور فن کار۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ادیب اس روش سے کچھ زیادہ ہی متاثر ہُوئے، کیونکہ ادیب عام لوگوں کی نسبت زیادہ حساس ہوتے ہیں۔

پُرانے زمانے میں لکھنے والے بہت خوش قسمت ہوا کرتے تھے۔ مثلاً ۱۹۳۶ء میں جب میں نے لکھنا شروع کیا تھا تو پنجاب کا ادبی میدان خالی پڑا تھا۔ چار ایک لکھنے والے تھے۔ کمپی ٹیشن کی کوئی صورت نہ تھی۔ میری پہلی کہانی ادبی دُنیا میں چھپی۔ منصور احمد

نے وہ کہانی ایک تعریفی نوٹ کے ساتھ سالنامے میں چھاپی۔ پہلی ہی کوشش پر میں جانا پہچانا ادیب بن گیا۔ نہ ہینگ لگی نہ پھٹکری۔ حالانکہ میں اُردو زبان سے قطعی ناواقف تھا، اور ادیب بننے کی نہ تو آرزو تھی نہ اُمید۔ کیونکہ پہلی کہانی بھی میں نے از خود نہیں لکھی تھی۔ مجھے لکھنے کی دعوت دی گئی تھی۔

اُس دور کے لکھنے والے بڑے خوش قسمت تھے۔ آجکل کے لکھنے والے بڑے بدقسمت ہیں۔ کمپیٹیشن زوروں پر ہے۔ بھیڑ بہت زیادہ ہے۔ مونڈھے مارے بغیر راستہ بنانا دُشوار ہے۔ لہٰذا مونڈھا مارنا پڑتا ہے۔

آگے نکلنے کا جذبہ قدرتی بات ہے۔ اس مقصد کو پانے کے لیے کئی ایک طریقے رائج ہیں۔

سب سے بڑی مشکل تو پُرانے لکھنے والے ہیں جو اگلی صفوں میں دھرنا مارے بیٹھے ہیں۔ جب تک انھیں ہٹایا نہ جائے، بات کیسے بنے۔ انفرادی طور پر ایک ایک پُرانے کو ہٹانا تو خاصا مشکل اور لمبا کام ہے۔ اس لیے سمجھ دار لوگ حکمتِ عملی کو کام میں لاتے ہیں۔ لہٰذا ایک زیرلبی چلا دی کہ پُرانا ادیب بوسیدہ ہے، بے کار ہے۔ دورِ جدید کے نئے خیالات، نئی حسیات اور نئے اشارات کا احاطہ نہیں کرسکتا۔ لہٰذا مُہمل ہے۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ واقعاتی کہانی رد کردی گئی اور علامتی اور تجریدی کہانی نے اہمیت حاصل کر لی۔ چلو پُرانے کلھاٹیوں سے تو نجات ملی۔

نئی کہانی میں بہت سی خوبیاں ہوتی ہیں۔ سب سے پہلی یہ کہ وہ نئی ہوتی ہے۔ دُوسری یہ کہ جو نئی ہوگی، اس میں تازگی ہوگی۔ تیسری خوبی یہ ہے کہ چاہے مفہوم ہو یا نہ ہو، کشش بہت ہوتی ہے۔ مفہوم نہ ہو تو کشش اور بھی بڑھ جاتی ہے اور وہ قاری کو تحقیق پر اُبھارتی ہے، ذہنوں میں پُراسرار ماحول پیدا کرتی ہے۔ سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ابہام کو ہتھیار کے طور پر برتتی ہے۔ بات کہہ بھی دیتی ہے، نہیں بھی کہتی۔ مصنف کو ذمّے داری کے

جھنجھٹ سے بچائے رکھتی ہے۔ بہر حال، نیا پن بہت بڑا اشتہار بن جاتا ہے۔ ویسے بھی ہمارے نئے لکھنے والے زیادہ ذہین ہیں۔ زیادہ معلومات رکھتے ہیں۔ زود حس ہیں۔ اِشتہار کی عظمت سے واقف ہیں۔

چلیے، نئے افسانے کے زور پر پُرانے لکھنے والے تو راستے سے ہٹ گئے۔ لیکن دقت یہ ہے کہ نئے لکھنے والے دھڑا دھڑ میدان میں آرہے ہیں۔ اب اس مشکل سے کیسے نپٹا جائے؟ نئے لکھنے والوں نے اس مشکل کا علاج یہ سوچا ہے کہ گروپنگ کرلو، اور من تُرا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو کے اشتہار کو کام میں لاؤ۔

نتیجہ یہ ہے کہ ہر محلّے میں ایک ادبی انجمن قائم ہوگئی ہے، جس کا کام ساتھیوں کو اُچھالنا اور مخالفین کو گرانا ہے۔ جگہ جگہ ادبی انجمنیں قائم ہو جانے کی وجہ سے ادیبوں کی ایک خصوصی جماعت پیدا ہوگئی ہے، جو کچھ تخلیق نہیں کرتی، صرف منھ زبانی تنقید کے بل بوتے پر نام پیدا کرتی ہے۔ یہ لوگ ادبی اجلاس میں عالمانہ اور دانشورانہ ڈھنگ میں باتیں کرنے کی صلاحیت پیدا کر لیتے ہیں۔ سیدھی بات ہے، اگر آپ مُنھ زبانی گفتگو سے شہرت حاصل کر سکتے ہیں تو پھر تخلیق کے جھنجھٹ میں کیوں پڑیں۔ خوامخواہ دردِ زہ مول لینا دانشمندی نہیں۔ پُرانے زمانے میں ادب میں گروپنگ کی بُنیاد ترقّی پسندوں نے ڈالی۔ یہ ایک منظّم تحریک تھی جس کی پُشت پناہی ایک بگ پاور کر رہی تھی۔ انھوں نے اپنے مسلک کو دُنیا بھر میں پھیلانے کے لیے ادب کو ایک ذریعہ بنایا تھا اور اس تحریک کا ایسا نام رکھا تھا جو بذاتِ خود ایک اشتہار تھا۔ میری دانست میں اس سے بڑا اشتہار آج تک تشکیل نہیں دیا جا سکا۔ کون ہے جو خود کو ترقّی پسند کہنا یا کہلوانا نہیں چاہے گا؟

لیکن پرانے زمانے کی یہ گروپنگ ایک زاویۂ نظر، ایک مسلک پر قائم ہوتی تھی۔ آج کل کی گروپنگ زاویۂ نظر یا مسلک کی محتاج نہیں۔

ویسے گروپنگ بڑی لاجواب چیز ہے۔ ایک بار اس کی لت پڑ جائے تو پھر جاتی نہیں۔

مثال کے طور پر ترقی پسندی کے زمانے میں کچھ ایسے ادیب بھی تھے جو اس تحریک سے الگ رہے۔ ترقی پسندوں کو گوارہ نہ تھا کہ کوئی الگ رہے۔ جو الگ رہتے تھے انھیں ترقی پسند چلنے کا حق دینے کے قائل نہ تھے۔ لہٰذا اس دور میں غیر ترقی پسندوں کی بڑی پٹائی ہوئی۔ اس پر کچھ لوگ حفظِ ماتقدم کے خیال سے مل بیٹھے۔ یوں ایک گروپ قائم ہو گیا۔

چاہیے تو یہ تھا کہ ترقی پسندی کے انحطاط کے بعد یہ گروپ ختم ہو جاتا کیونکہ خطرہ ٹل چکا تھا، تحفظ کی ضرورت نہ رہی تھی، لیکن گروپ کے سربراہوں کو لیڈرشپ کی چاٹ لگ گئی تھی۔ لہٰذا یہ گروپ آج بھی قائم و دائم ہے۔

کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو متمول ہونے کی حیثیت سے ادب کو ذاتی اشتہار کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ ان لوگوں نے ادبی انجمنیں بنا رکھی ہیں۔ بڑے بڑے ہوٹلوں میں جلسے کیے جاتے ہیں۔ چائے پیسٹری کے دور چلتے ہیں۔ بڑے بڑے وزیروں اور اہلکاروں کو مدعو کیا جاتا ہے۔ ادیبوں کو دعوت دی جاتی ہے کہ جلسے میں اپنے اپنے مضامین پڑھیں۔ اس پر ادیب فخر سے پھولے نہیں سماتے۔ اس طریقِ کار کو پی آر کہتے ہیں۔ بہر طور دورِ جدید میں یہ رجحان چل نکلا ہے کہ تخلیق کی سردردی کے بغیر ادبی حلقوں میں شہرت اور اہمیت حاصل کی جائے۔ کچھ لوگ اس رجحان پر معترض ہیں۔ لیکن میری دانست میں یہ اعتراض جائز نہیں۔ اس لیے کہ اشتہار دورِ حاضر کا امتیازی نشان ہے، اور نئے ادیبوں کو حق حاصل ہے کہ وہ دورِ جدید کے نئے رجحانات کو اپنائیں اور ان سے مستفید ہوں۔

سائنس اور ادب

سائنس کے تین پہلو ہیں :

(۱) سائنس علم ہے۔ اس کے حوالے سے ہم اس کی قدر کرتے ہیں۔

(۲) سائنس ٹیکنالوجی ہے۔ یعنی ایسا علم جسے کام میں لایا جا سکتا ہے۔ اس کے کاجی پہلو کی حیثیت اس قدر اہم اور فعال ہو چکی ہے کہ علم کی حیثیت ثانوی ہو کر رہ گئی ہے۔ یعنی سائنس نے مشین ایجاد کی اور صاحب حیثیت لوگ اسے برت رہے ہیں، اور سائنس ایسی ایجادات کرنے پر مجبور کر دی گئی ہے جو صاحب حیثیت لوگ اپنے مفاد کے لیے کام میں لانا چاہتے ہیں۔ اس حیثیت سے سائنس ایک جن ہے جو اللہ دینوں کے ہتھے چڑھی ہوئی ہے۔ اس لحاظ سے سائنس ایک بہت بڑا خطرہ ہے۔

(۳) سائنس ایک رویہ ہے، ایک ذہنی رُخ ہے، ایک ایٹی ٹیوڈ ہے جو آج کے پڑھے لکھے لوگوں اور دانشوروں، یعنی آپ اور میں، ہم سب کے ذہنوں پر چھایا ہوا ہے۔ یہ رویہ جسے ہم بڑے فخر سے سینے پر تمغے کی طرح سجائے پھرتے ہیں غلط ہے، جھوٹ ہے، گمراہ کن ہے، جہالت پر مبنی ہے۔

صاحبو! یہ میں نہیں کہہ رہا۔ میری کوئی حیثیت نہیں کہ اتنی بڑی بات زبان پر لاؤں۔ یہ بات جدید ترین سائنس دان خود کہہ رہے ہیں۔

ویسے تو کتابی لوگ رسمی طور پر یہ کہنے کے عادی ہیں کہ ہر علم کے، جسے کام میں لایا جا سکتا ہے، دو پہلو ہوتے ہیں۔ ایک خیر کا، دوسرا شر کا۔ لیکن یہ بات کہنے کی بات

یہ مضمون قلم قبیلہ کے سیمینار میں پڑھا گیا۔

ہے ۔ ہم ایسی ٹھنڈی میٹھی باتیں کر کے خود کو خوش رکھنے کے عادی ہیں ۔ بہر طور، اس حقیقت کو جھٹلایا نہیں جا سکتا کہ ہمیشہ ہر دور میں صاحب توفیق لوگ علم کو برتتے رہے ہیں ۔ آج کے دور میں یہ لوگ کھل کر سامنے آ گئے ہیں ۔ ایک بااقتدار طبقہ، دوسرا سرمایہ دار طبقہ ۔

بااقتدار طبقے نے سائنسی علوم کو اسلحہ سازی کے لیے برتا ۔ برت رہے ہیں سرمایہ داروں نے منافع خوری کے لیے برتا ۔ برت رہے ہیں ۔ اگر چلتے چلتے اتفاق سے خلقِ خدا کی خدمت بھی ہو گئی تو یہ ایک ضمنی بات ہے ۔

سائنسی علوم کے برتے جانے کا پہلو اس حد تک اہم ہو گیا ہے کہ اسے علم کہنا میری دانست میں علم کے لفظ کی توہین ہے ۔ سائنس بیچاری اب چاکر بن گئی ہے اور سائنس دان مظلوم ۔ یا وہ بکنے لگے ہیں یا انھیں اغوا کر لیا جاتا ہے ۔ طوقِ غلامی ڈال دیا جاتا ہے تاکہ اقتدار پسندوں اور سرمایہ داروں کی ہوس کی تسکین کریں ۔

صاحبو ! اگرچہ لطیفہ ہے لیکن حق ہے ۔

ایک صاحب نے پوچھا : ایٹمی ٹیکنالوجی میں روس نے زیادہ ترقی کی ہے یا امریکا نے ؟ دوسرے جواب دیا : میرے خیال میں جو جرمن انجینئر روس کے تحت کام کر رہے ہیں وہ اتنے قابل نہیں جتنے وہ جرمن انجینئر جو امریکا کے تحت کام کر رہے ہیں ۔

جنابِ والا ! یہ آج کے بڑے، جو بڑے کہلاتے ہیں، طاقت کے زور پر بڑے ہیں ۔ بے شک بھینس ان کی ہے لیکن انھیں بڑا بننا نہیں آیا ۔ ہمارے لیے بڑے کا مفہوم کچھ اور ہے ۔ میں ایک بڑے کو جانتا ہوں ۔ اسے بڑا مانتا ہوں ۔ اس کا عہدہ اتنا اونچا تھا کہ آج تک کسی دوسرے کو نصیب نہیں ہوا ۔ اس کے باوجود وہ خود کو کسی سے برتر نہیں سمجھتا تھا ۔ کسی کو خود سے کم تر نہیں سمجھتا تھا ۔ بڑا ہو کر بڑا نہیں بنتا تھا ۔ میں صرف اس شخص کو بڑا مانتا ہوں جو اس بڑے کے نقشِ قدم پر چلے ۔

اب لیجیے سائنسی رویّے کی بات ۔ میرے موضوع کا سائنس یا ٹیکنالوجی سے اتنا

تعلق نہیں جتنا سائنسی رویّے سے ہے، اور جس نے آپ کا میرا ہم سب دانشوروں کا ستیاناس کر رکھا ہے۔ اس سائنسی رویّے سے مجھے سب سے پہلے برٹرینڈ رسل نے روشناس کیا۔ کہنے لگا: دوستو، شک کرو۔ ہر بات پر شک کرنا سیکھو۔ شک کے بغیر تم سچائی کو نہیں پا سکتے۔ شک کی تلقین کر کے اُس نے مجھے مذہب سے کاٹ دیا۔ روایات سے کاٹ دیا۔ لوک دانش سے کاٹ دیا۔ یوں مجھ پر سائنٹیفک اٹیٹوڈ کا پالش چڑھ گیا۔ اس وقت یہ خیال نہ آیا کہ مجھے سائنسی رویّے پر بھی شک کرنا چاہیے۔ آج بھی ہمارے دانشور اسی سائنسی اور عقلی رویّے کو سینے سے لگائے بیٹھے ہیں۔ یہ رویّہ اُنیسویں صدی کی سائنس کی پیداوار ہے۔

بیسویں صدی میں سائنس کی کایا پلٹ ہو گئی۔ پُرانی کینچلی اُتر گئی۔ جس طرح سُورج غروب ہونے کے بعد بھی ۱۲ منٹ تک ہم اس کی روشنی دیکھتے رہتے ہیں، اسی طرح ہم اُنیسویں صدی کی سائنس کی روشنی میں جی رہے ہیں۔ خود کو دانش ور سمجھ کر مونچھوں کو تاؤ دے رہے ہیں۔ بیسویں صدی میں تین بڑے اہم انکشافات ہوئے۔ ہم نے ان انکشافات کو سُنا، جانا، مگر مانا نہیں۔ مان لیتے تو ہمیں اپنی "بیلیف" کی پرانی حویلی ڈھا کر نئی تعمیر کرنی پڑتی۔ اس لیے ہم نے اپنی آسائش کے لیے نیلسن کی طرح اندھی آنکھ پر دُوربین لگائی اور کہا کہ سامنے کوئی نئی بات موجود نہیں۔ مگن بیٹھے رہو۔ جب حشر کا دن آئے گا، اُس روز دیکھا جائے گا۔ پہلا انکشاف یہ ہُوا کہ مادّہ اور رُوح دو الگ الگ چیزیں نہیں بلکہ ایک ہی ٹہنی کے دو پتّے ہیں۔ ہم نے دونوں کو الگ الگ دڑبوں میں بند کر رکھا تھا۔ سائنس کو پتہ چلا کہ مادّہ صرف مادّہ ہی نہیں بلکہ بیک وقت مادّہ بھی ہے، انرجی بھی۔ بیک وقت جامد بھی ہے، متحرّک بھی۔ اور وہ طرح طرح کے روپ بدل سکتا ہے۔ اس بات نے فزکس کی بنیاد ہی ہلا دی۔ ساتھ بے چاری منطق بھی ہٹ گئی کہ کوئی چیز ایک وقت میں یا تو الف ہو سکتی ہے یا ب۔ بیک وقت الف یا ب نہیں ہو سکتی۔ یہ مفروضہ غلط نکلا۔ یعنی دلیل

کی کمر ٹوٹ گئی۔ پھر فزکس پر یہ انکشاف ہوا کہ نچلی منزلوں کے اصول سائنس کی اوپر کی منزلوں پر پہنچ کر ٹوٹ جاتے ہیں۔ کبھی تو روشنی سیدھی لکیر پر چلتی ہے اور کبھی سانپ کی طرح بل کھانے لگتی ہے۔ پہلے ہی ارسطو نے پتا نہیں کس خوش فہمی کے زیرِ اثر اعلان کر دیا تھا کہ انسان ریشنل انیمل ہے۔ کچے سیب کو زعم ہو گیا کہ میں پکا ہوا ہوں، لہٰذا اسی خوشی میں وہ ڈال سے ٹوٹ کر زمین پر گر گیا۔

اس بھلے آدمی کا مطلب یہ تھا کہ انسان میں ریشنل ہونے کی صلاحیت موجود ہے۔ چاہے تو اس صلاحیت کو برت سکتا ہے۔ اسے معلوم نہ تھا کہ انسان اس صلاحیت کو برتنا نہیں چاہتا۔

صاحبو! ہم ریشنل نہیں۔ ریشنلائز کرنے کے شوق میں مقصد کی گاڑی کو چلانے کے لیے عقل کا گھوڑا آگے نہیں بلکہ گاڑی کے پیچھے جوتتے ہیں۔ دینے ہوں تو دو اور دو تین گنتے ہیں۔ لینے ہوں تو پانچ۔

انسان کی سب سے امتیازی خصوصیت عقل نہیں، جذبہ ہے۔ کتابی لوگ کہیں گے جذبات اچھے بھی ہوتے ہیں، بُرے بھی ہوتے ہیں۔ بے شک بُرے بھی ہوتے ہیں لیکن اچھے جذبات کی فراوانی ہے۔ بُرے آٹے میں نمک کی مصداق ہیں۔ بے شک ذائقہ نمک کا حاوی رہتا ہے لیکن آٹے کی فراوانی سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ میرا ایمان ہے انسان کے خمیر میں جب شر خیر پر حاوی ہو جائے گا تو زندگی کا دھارا سوکھ جائے گا۔

ہاں تو، میں مادے کا ذکر کر رہا تھا۔ بیسویں صدی میں مادے کے متعلق نئی باتوں کا پتا چلا۔ پہلے ہم سمجھتے تھے مادہ جتنا بھی ہے، اتنا ہی رہے گا۔ نہ وہ آتا ہے نہ جاتا ہے۔ پتا چلا کہ یہ غلط ہے۔ مادہ آتا ہے۔ پتا نہیں کہاں سے آتا ہے۔ انوکھے طریقوں سے آتا ہے۔ حتیٰ کہ مادے کی بارش بھی ہوتی ہے۔ مختصر یہ کہ فزکس میں یہ کہنا ناممکن ہو گیا کہ فلاں عمل ممکن ہے، فلاں ناممکن۔ یا فلاں اصول اٹل ہے۔ یعنی بے چاری

فزکس کا چھلکا اُڑ گیا۔

دوسرا انکشاف وقت کے متعلق تھا۔

ہم سمجھتے تھے کہ وقت آتا ہے، جاتا ہے۔ پتا چلا کہ نہ آتا ہے نہ جاتا ہے۔ وقت ایک اٹل اور دوامی چیز ہے۔ ماضی، حال، مستقبل اس کے تین رُوپ ہیں جو ہمارے شعور نے ایجاد کر رکھے ہیں۔ آئن سٹائن کے چیلے اب حال کے سوا کسی رُوپ کو تسلیم نہیں کرتے۔ یہی بات صوفی کہا کرتے تھے اور ہم ان پر ہنسا کرتے تھے۔

اگر وقت ایک زندہ اور پائندہ چیز ہے تو "پری کاگنیشن" یعنی کشف ایک سائنسی حقیقت ہے۔ اب لوح و قلم سے انکار کون کرے۔ پھر شعور کی عظمت مسلّم ہو گئی۔ تمام "آکلٹ" سائنسوں کو جن پر فزکس ہنسا کرتی تھی، عزت کا مقام حاصل ہو گیا۔ سپر نیچرل کا لفظ بے معنی ہو کر رہ گیا۔ کیوں کہ ہمیں یہ احساس ہو گیا کہ ہمارا نیچرل کا کانسپٹ غلط ہے، محدود ہے۔ اس کے علاوہ انسان کے شعور کی اہمیت سامنے آ گئی۔ اندر کا انسان اتنا ہی اہم ہو گیا جتنا باہر کا انسان سمجھا جاتا تھا۔ اس ضمن میں آپ کو ایک دلچسپ واقعہ سناتا ہوں۔ یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب سائنس اُنیسویں صدی کا چشمہ لگائے بیٹھی تھی۔ آکلٹ سائنسز کو نہیں مانتی تھی۔ اُن دنوں ای ایس پی نے ٹیلی پیتھی کا شور مچا رکھا تھا۔ فزکس اس پر ناک بھوں چڑھا رہی تھی۔ کوئی سائنس دان ایسا نہ تھا جو ٹیلی پیتھی کو آزمانے کے لیے تیار ہو۔

دفعتاً روسی فوج کو سوجھی کہ ٹیلی پیتھی کو کام میں لایا جا سکتا ہے۔ جب فوجی کمیونیکیشن کے دوسرے ذرائع فیل ہو جائیں تو کیوں نہ اسے آزمایا جائے۔ آزمانے کے لیے وسیع قسم کے تجربات کیے گئے۔ کچھ کچھ ٹھیک پایا تو بولے: ہاں، کام لیا جا سکتا ہے۔ ٹیلی پیتھی کو بحیثیت علم نہیں مانا۔ بحیثیت کام کی چیز مان لیا۔ آج کا رُوسی تحقیقی سنٹر جو پارا سائیکولوجی پر تجربات کر رہا ہے، اسے علم کی حیثیت نہیں دے رہا بلکہ ہتھیار کی حیثیت

دے رہا ہے۔ لہٰذا تحقیق کے نتائج کو خفیہ رکھا جاتا ہے۔ صرف پارا سائیکالوجی کی بات نہیں، سائنس کی جدید ترین دریافتوں کو بھی خفیہ رکھا جا رہا ہے۔ اس کی دو وجوہات ہیں:

۱۔ ہتھیار کا راز دشمن تک نہ پہنچے۔

۲۔ نئی دریافتیں عوام کے دلوں پر اثر انداز نہ ہونے پائیں۔ اگر عوام کو پتا چل گیا تو رویے بدل جائیں گے۔ ذہنوں کی کایا پلٹ ہو جائے گی۔ مذہب مفروضہ کی حیثیت سے نکل کر حقیقت بن جائے گا۔ روحانی دُنیا کی اہمیت بڑھ جائے گی۔ خارجی دُنیا کی حیثیت کم ہو جائے گی۔ عقل و دلیل دُم دبا کر بیٹھ جائیں گے، اور اللہ میاں برسرِ عام کرسی پر براجمان ہو جائیں گے۔

بیسویں صدی میں جو تیسرا انکشاف ہُوا وہ اہم ترین تھا کہ ہم انسانی ذہن کے صرف دسویں حصّے سے کام لے رہے ہیں۔ دس میں سے نو صلاحیتیں خوابیدہ پڑی ہیں۔ اس بات کا پتا لگانا از بس ضروری ہو گیا کہ انسان میں کیسی کیسی قوتیں پنہاں ہیں۔ سائنسدانوں کا رُخ خارجی حقائق سے ہٹ کر داخلی کیفیتوں پر مرکوز ہو گیا۔ انھوں نے اعلان کیا کہ دروازے کھلنے والے ہیں۔ پردے اُٹھنے والے ہیں۔ سائنس کا زاویۂ نظر بدل گیا ہے۔ نئے علوم سامنے آئیں گے۔ نئی طاقتوں کا ظہور ہو گا۔

دِقّت یہ ہے کہ سائنس والوں کا بس نہیں چلتا۔ انھیں علم کی تلاش سے روکا جا رہا ہے۔ صاحبِ اقتداران کی آزادانہ تحقیق میں مزاحم ہیں۔ یہ باحیثیت لوگ اور اقتدار پسند ملکوں کے سربراہ نہیں ہیں۔ یہ لوگ سربراہوں کی کرسیوں کی اوٹ میں بیٹھے ہیں۔ کُھل کر سامنے نہیں آتے۔ مثلاً مشہورِ زمانہ ہے کہ انگلستان پر بینکروں کی حکومت ہے۔ امریکا پر یہودی کارخانہ دار قابض ہیں۔ فرانس پر فری میسنز کی اجارہ داری ہے۔ اس لیے ہم، آپ اور میں اندھیرے میں ہیں۔ اور جہاں تک ان کا بس چلتا ہے اندھیرے میں رہیں گے۔ ہمارا ذہنی رویّہ وہی اُنیسویں صدی والا رہے گا اور خود کو دانشور سمجھ کر مونچھ مروڑتے رہیں گے۔ تو صاحبو!

یہ ہے آج کی سائنسی دُنیا کی صورتِ حال۔ میں نے اسے خاصی وضاحت سے اس لیے بیان کیا ہے کہ اس کی روشنی میں ہم ادب کی ضرورت کا جائزہ لے سکیں۔ سائنسی صورتِ حال کے متعلق مندرجہ ذیل نکات قابلِ توجہ ہیں :

۱۔ آج کے پڑھے لکھے لوگوں اور ادیبوں کو جدید سائنس کے رُجحانات کا شعور نہیں۔

۲۔ ہمارا ذہنی رویّہ قدیم سائنس کی بنیادوں پر قائم ہے جو بیشتر غلط ثابت ہو چکی ہیں۔

۳۔ صاحبِ اقتدار لوگ جو میں میڈیا کو کنٹرول کر رہے ہیں، نہیں چاہتے کہ عوام کو جدید سائنس کے رجحانات کا علم ہو۔

۴۔ سائنس دان خود زبان بند ہیں۔

اب لیجیے ادب کی بات۔

میں ادب کے مفہوم کی وضاحت نہیں کروں گا۔ کیونکہ نہ تو میں محقّق ہوں نہ نقاد۔ الحمدللہ کہ نقّاد نہیں ہوں۔ الحمدللہ کہ عالم نہیں ہوں۔ نکتہ دان نہیں ہوں۔ نکتہ چین نہیں ہوں۔ قلم قبیلے کا ایک عام تخلیق کار ہوں۔

سائنس کے متعلق جو گزارشات میں نے پیش کیں وہ میری نہیں بلکہ مستند سائنسدانوں کے بیانات سے اخذ کی گئی ہیں۔ ادب کے متعلق جو گزارشات پیش کروں گا وہ میرے ذاتی تاثرات ہیں۔ آپ انھیں مانیں یا نہ مانیں۔ آپ کی مرضی۔ اب سوال یہ ہے کہ سائنس اور ادب میں کیا فرق ہے ؟

۱۔ سائنس عقل کی بات کرتی ہے۔ ادب جذبات کی بات کرتا ہے۔

۲۔ سائنس اصولوں کی بات کرتی ہے۔ ادب انسانوں کی بات کرتا ہے۔

۳۔ سائنس کا کام قوتوں کو زیر کرنا ہے۔ ادب کا کام انسان کو انسان کے قریب تر لانا ہے۔

۴۔ سائنس کی اپیل ذہن پر ہے ، ادب کی دل پر۔

۵۔ سائنس باہر کے انسان سے تعلق رکھتی ہے۔ ادب اندر کے انسان سے تعلق رکھتا ہے۔

آپ کو علم ہے کہ ہر فرد ایک جزیرہ ہے۔ دُوسرے فرد سے دُور۔ درمیان میں سمندر حائل ہے۔ ہر فرد کے اپنے مسائل ہیں، اپنی مشکلات ہیں، اپنی مجبوریاں ہیں، جسے دوسرا فرد نہیں جانتا، نہیں سمجھتا۔ افراد میں صرف ایک چیز سانجھی ہے۔ وہ یہ کہ ہم سب حواسِ خمسہ میں مقید ہیں۔ دِقّت یہ ہے کہ یہ حواسِ خمسہ بھی ایک جیسے نہیں۔ کچھ لوگ زیادہ دیکھتے ہیں، کچھ زیادہ سُنتے ہیں۔ مثلاً میں اپنے بیٹے عکسی کی نسبت کم سُنتا ہوں۔ اپنے دوست اشفاق احمد کی نسبت کم دیکھتا ہوں۔ قدرت اللّٰہ شہاب کی نسبت کم دیکھتا اور کم سُنتا ہوں۔ اپنی سہیلی بانو قدسیہ کی نسبت کم محسوس کرتا ہوں۔

میری دانست میں ادب کا مقصد یہ ہے کہ ان جزیروں کو ایک دوسرے کے قریب لایا جائے۔ فرد کے جذبات اور احساسات کا دوسروں کو شعور دلایا جائے۔ دلوں میں ہمدردیاں پیدا کی جائیں۔ یہ نہیں کہ دوسروں کے خلاف غم و غصّہ بھڑکایا جائے۔ لوگوں کو کمٹمنٹ پر مجبور کیا جائے۔

میری دانست میں ادیب کی کمٹمنٹ بنی نوعِ انسان سے ہے۔ جس طرح حضورِ اعلیٰؐ کی کمٹمنٹ بنی نوعِ انسان پر رحمت تھی۔ جس طرح اللّٰہ تعالیٰ ربّ المسلمین نہیں، ربّ العالمین ہے۔

بیرونی طاقتوں کی ہمیشہ سے یہ کوشش رہی ہے کہ جس طرح وہ سائنس کو کام میں لا رہے ہیں، اسی طرح ادب اور ادیبوں کو کام میں لائیں لیکن یوں کہ احساس نہ ہو کہ انھیں کام میں لایا جا رہا ہے بلکہ وہ اس خوش فہمی میں مبتلا رہیں کہ ادب کی خدمت کر رہے ہیں۔ اس مقصد کو پُورا کرنے کے لیے وہ اپنے مطلب کے خیالات کا گٹھ ہمارے ہاں بھیجتے رہتے

ہیں تاکہ ادبی مکھیاں اس پر بھنبھنائیں اور "اوپینین میکرز" کی حیثیت سے یہ گڑ جگہ جگہ پھیلائیں تاکہ بیرونی طاقتوں کے مفادات کا پرچار ہوتا رہے۔

تقسیم سے پہلے بدیشی اقتدار پسندوں نے ایک بہت بڑی ادبی تحریک چلائی تھی، جو بہت کامیاب ہوئی اور جس میں ہمارے کئی ایک نامور ادیب شامل ہوئے۔ کچھ انجانے میں کانٹے پر لگ گئے۔ کچھ فیشن کی مقبولیت کے لیے شامل ہو گئے۔ کچھ چودھری بننے کے چاؤ میں۔ تحریک کا نام ترقی پسند ادب تھا۔ اس ادبی تحریک کا کنٹرول کمیونسٹ پارٹی کے ہاتھ میں تھا۔ ادیبوں سے کام لیا جاتا تھا لیکن خصوصی مقاصد سے بے بہرا رکھا جاتا تھا۔

پاکستان بننے پر ہند کی کمیونسٹ پارٹی نے فیصلہ کیا کہ پاکستان اور ہند کے ترقی پسند ادیبوں کا مرکز ہند ہی میں رہے گا جہاں سے وہ دونوں کو کنٹرول کریں گے۔ یہ بات پاکستانی ادیبوں کے لیے ناقابلِ قبول تھی۔ اگرچہ چودھراہٹ کا شوق تھا لیکن دل میں پاکستان کا جذبہ بھی تھا۔ لہٰذا پھوٹ پڑ گئی اور یہاں یہ تحریک ختم ہو گئی۔ لیکن آج کل ہمارے ادیب ان جانے میں پھر سے ترقی پسندی کو ہوا دے رہے ہیں۔ انٹلکچول ازم کی وبا فرانس سے آئی اور آج کل بھی زوروں پر ہے۔ مجھے واضح طور پر علم نہیں کہ ان کے کیا مقاصد ہیں۔ لیکن نتائج سے ظاہر ہے کہ:

۱۔ ادب کی توجہ جذبات سے ہٹا کر ذہن کی طرف مرکوز کر دی جائے۔

۲۔ ادب کو دانشور بنا کر عوام سے کاٹ دیا جائے۔

۳۔ ادیب کو اسلام سے کاٹ دیا جائے۔ اس کے ذہن میں مذہب اور روایت کے لیے تحقیر پیدا کی جائے۔

پتا نہیں اہلِ مغرب اسلام سے اس قدر خوف زدہ کیوں ہیں۔ یورپ میں کئی ایک ایسی انجمنیں کام کر رہی ہیں جن کا واحد مقصد اسلام دشمنی ہے۔ ۱۹۶۰ء میں جب میں صدر گھر میں ملازم تھا تو مجھے پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ یورپ میں ایسی ۱۲۶ انجمنیں باقاعدہ کام کر رہی ہیں۔

یہ تو خیر جملہ معترضہ تھا۔ آج بھی ہمارے کچھ نوجوان ادیبوں میں انٹلکچول بننے کا شوق عام ہے۔ وہ خود کو خواص سمجھتے ہیں۔ نزدیک کی کوڑی لانا اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ اُونچی اونچی باتیں کرنے کے مشتاق ہیں جو عوام کی سمجھ میں نہ آئیں، اور وہ اس بات پر فخر محسوس کرتے ہیں۔

صاحبو! سچی بات یہ ہے کہ ہم تو کچھ بھی نہیں۔ ادیب دراصل وہ علاقائی صوفیائے کرام تھے جن کی تصنیفات صدیاں گزرنے کے بعد آج بھی عوام کے دلوں پر نقش ہیں۔ منھ زبانی حفظ ہیں۔ میں نے بھی زندگی میں کتابیں لکھیں جن میں دانشورانہ باتیں کیں، نہ عوام نے منھ لگایا نہ نقادوں نے گھاس ڈالی۔ پھر اتفاق سے ایک عوامی کتاب "لبیک" لکھی۔ میں حیران رہ گیا۔ مجھے عام لوگوں کے تقریباً دس ہزار خطوط موصول ہوئے۔ ہر کسی نے کہا: مفتی، تُو نے میرے دل کی بات کہ دی۔ میں نے پہلی بار محسوس کیا کہ میں نے ایک کتاب لکھی ہے۔ خوشی سے دل باغ باغ ہو گیا۔ پھر دفعتاً مجھ پر سات آٹھ بم گرے۔ ساری خوشی ہرن ہو گئی۔ یہ علماء کے خط تھے۔ وہ وہ ڈانٹ پڑی کہ خون خشک ہو گیا۔ ابے او بے ادب، گستاخ، ناہنجار لیکن چھوڑیے، پھر سے تلخ یاد تازہ کرنے کا فائدہ؟ بڑی مشکل سے انھیں بھلایا ہے۔

آئیے، اب ذرا ادب اور ادیب کا جائزہ لیں:

۱۔ اس وقت ادب اور ادیب دونوں کا عوام سے رابطہ نہیں ہے۔

۲۔ ادیب کی ذہنیت پر شہر سوار ہے۔ یعنی ادیب "سٹی اور بینڈ" ہے۔ وہ دیہات کو گنتی شمار میں نہیں لاتا۔ اس کے نزدیک عوام سے مفہوم شہری عوام ہیں۔ شہر ایک قیامت ہے جو ہم پر انڈسٹریل ریوولیوشن نے ڈھائی۔ شہر پاکستان کا نمایندہ نہیں ہے۔ شہر میں ایک بیگانہ کھچڑی کلچر پایا جاتا ہے۔ خیال کے مغربی فیشن اس کھچڑی کلچر کو سینچتے ہیں۔ شاید اسی وجہ سے اسے کوکا کولا کلچر بھی کہا جاتا ہے۔ شہر کے لوگ مغربی فیشن اور انڈسٹریل ریوولیوشن کی پیداوار ہیں۔ اس لیے مصنوعی ہیں۔ ان کا اپنے کلچر اور روایات سے تعلق نہیں۔
تاجر کمپیٹیشن اور مفاد پرستی کی دُھن میں سرگرداں ہیں۔ عہدے دار سٹیٹس زدہ ہیں۔

مزدور اس سوشلزم کے نعرے لگانے میں مصروف ہیں جس کے بارے میں انھیں کچھ علم نہیں۔ عالم، جو مغرب سے تحصیلِ علم کرکے آئے ہیں، بدیشی خطوط پر سوچتے ہیں۔ طلبا ان جانے میں ہڑبونگ مچاتے ہیں۔ سیاستیے ذاتی اقتدار کی ہوس کے خواب دیکھ رہے ہیں۔

بے شک شہر ایک دیدہ زیب جنّت ہے۔ "کسے را با کسے کارے نہ باشد" قسم کی جنّت، جہاں ہر کوئی اپنی دھن میں لگا ہے۔ آج کے ادیب کے لیے شہر ہی دُنیا ہے۔ شہر ہی زندگی ہے۔

۳۔ حکومت ادیب اور ادب سے یکسر بے تعلق ہے۔ کوئی ادیب فوت ہو جائے تو اظہارِ افسوس کا بیان چھپ جاتا ہے۔ کبھی کبھار کوئی وزیر یا اہل کار اعلان کرتا ہے کہ اب ادیبوں کا فرض ہے کہ قوم کو راستہ دکھائیں۔ انھیں کبھی یہ خیال نہیں آیا کہ خود ادیبوں کے راستے بند پڑے ہیں۔

۴۔ چند ایک سرکاری ادارے جو ادب اور ادیبوں کے لیے بنائے گئے ہیں، سال میں ایک زناٹے کا جلسہ کرتے ہیں اور باقی سال بیٹھے اونگھتے رہتے ہیں۔ بیچارے کیوں نہ اُونگھیں۔ ادیب کی فلاح سے متعلق ان کی تجاویز متعلقہ محکمے میں یوں بے تعلقی کا شکار ہو جاتی ہیں جیسے بینک میں فقیر گھس آئے۔ کبھی کبھار یہ ادارے سیمینار قسم کا اکٹھ کرا دیتے ہیں جس میں باتیں ہوتی ہیں، نیک خواہشات بھری باتیں، علمی باتیں، کتابی باتیں، مُنھ زبانی باتیں۔

ادب کی سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ کتابیں نہیں چھپتیں۔ ایک طرف تخلیق کی دُنیا میں طوفان آیا ہوا ہے۔ نوجوان جذبۂ تخلیق سے یوں بھرے بیٹھے ہیں، جیسے ماٹا رس سے بھرا ہوتا ہے۔ دوسری طرف پروجیکشن کے ذرائع مسدود ہیں۔ مزید مسدود ہوتے جا رہے ہیں۔ نوجوان ادیب بغل میں مسودے دبائے پھرتے ہیں۔ پبلشر انھیں گھاس نہیں ڈالتے۔ بیشتر ادیب شوقِ اشاعت سے مجبور ہو کر قرض لے کر اپنی کتاب خود چھاپنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ اگر بفرضِ محال پبلشر کتاب چھاپ دے تو سالہا سال ایک ہزار کا ایڈیشن

چلتا ہے۔

ادبی جریدے روز بروز بند ہوتے جارہے ہیں۔ میڈیا انھیں اس قابل نہیں سمجھتی کہ اشتہاروں سے نوازے۔ وہی معدودے چند لوگ انھیں پڑھتے ہیں جنھیں پرچہ اعزازی طور پر بھیجا جاتا ہے۔ پاکستان میں ایک اندازے سے پانچ ہزار لائبریریاں ہیں۔ اس کے علاوہ سکول اور کالج ہیں جہاں ادبی پرچوں اور کتابوں کی کھپت ہو سکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ سرکار کو ادب پر اعتماد نہیں۔ وہ اختلافِ رائے کو برداشت نہیں کر سکتی، ورنہ یقیناً ایک سرکاری پبلشنگ ادارہ قائم ہو چکا ہوتا۔ ویسے بھی ادبی تحریر بے اثر ہے۔ آج کے دور میں جس میں پگڑی اُچھالنے کی طاقت نہیں، وہ تحریر بے اثر ہے۔ ادب کی کیفیت صوبہ بلوچستان کے مترادف ہے۔ اتنا بڑا صوبہ جس میں دو ایک سڑکیں، باقی بے سڑک، بے رابطہ۔ اتنا بڑا ادب جس میں دو ایک پگڈنڈیاں، باقی لق و دق میدان۔

جنابِ والا! میں اکیلا ہی نہیں، قلم قبیلہ میں میرے اور بھی بھائی ہیں جو سچی بات کہتے ہیں، سادہ بات کہتے ہیں۔ جو امپورٹڈ ادبی فیشنوں کو منھ نہیں لگاتے۔ اپنی مٹی کی خوشبو کا احساس رکھتے ہیں۔ علاقائی رنگ میں لکھنے والے اس ضمن میں پیش پیش ہیں۔ ویسے بھی بدقسمتی سے اُردو زبان درباری زبان ہے، اور درباداری ہمارا قومی وصف ہے۔ اُردو زبان میں سچی اور سادہ بات لکھنا بے حد مشکل ہے۔ میرا ایمان ہے کہ یہ کھچڑی کلچر، مغرب زدگی، ظاہر پسندی اور چمک دمک کا دور آخری دموں پر ہے۔ اس دور نے باہر کے آدمی کو دیوتا بنایا۔ اس کی پوجا کی۔ اسے منایا۔ باہر کے آدمی کو آسائشیں بہم پہنچائیں۔ اس کی دیکھ بھال کی۔ اسے نوازا۔ اس حد تک نوازا کہ راون بن گیا۔ راکشش بن گیا۔ تاریخ شاہد ہے کہ باہر کے آدمی کا دور زیادہ دن قائم نہیں رہ سکتا۔ یہ دور میرے ہوش میں آیا تھا اور اب میرے سامنے ہی اس کے اختتام کے عوامل واضح طور پر ظاہر ہو رہے ہیں۔

جب چیونٹیوں کو پر لگ جائیں تو جان لو کہ جلد ہی جلے ہوئے پروں کا ڈھیر لگنے والا ہے۔
یہ قدرت کا اصول ہے۔ یقین کیجیے کہ باہر کے انسان کا راون گر رہا ہے۔ اندر کا رام اُبھر
رہا ہے۔ سائنس دم توڑ رہی ہے۔ مذہب اندر کے انسان کا سواگت کرنے کے لیے آگے
بڑھ رہا ہے۔ ادب کی بے قدری کا دور ختم ہونے کو ہے۔

آپ کا نام

ناموں کی اہمیت کا احساس مجھے فقیر چند نے دلایا۔ تقسیم سے پہلے کی بات ہے، فقیر چند میرا ہم جماعت تھا، دوست تھا۔ سنٹرل ٹریننگ کالج میں ہم اکٹھے پڑھتے تھے۔ فقیر چند کی منگنی ہونے والی تھی۔ پھر سُنا کہ وہ ٹوٹ گئی ہے۔ میں نے فقیر چند سے پوچھا "یار، تیری منگنی ٹوٹ گئی ہے کیا؟"

بولا "ٹوٹی نہیں۔ میں نے توڑ دی۔"

"کیوں؟ کیا لڑکی اچھی نہ تھی؟"

بولا "اچھی خاصی تعلیم یافتہ تھی۔"

"پھر تُو نے منگنی توڑ کیوں دی؟" میں نے پوچھا۔

کہنے لگا "میں کسی ایسی لڑکی سے شادی نہیں کر سکتا جس کا نام بسنت کور ہو۔"

اس کی بات سُن کر میں ہکا بکا رہ گیا "یار، تُو تو پڑھا لکھا آدمی ہے۔ پھر ناموں کو اہمیت دیتا ہے!"

کہنے لگا "ہاں، ہوں۔ اور نام کو اہمیت دیتا ہوں ـــ سو وہاٹ؟"

میں نے کہا "بھئی، نام سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

بولا "پڑتا ہے۔ بہت پڑتا ہے۔"

"جو ایسی ہی بات ہے تو اس کا نام بدل کر کوشلیا رکھ لو۔"

کہنے لگا "یار، تم بھی احمق ہو۔ جو لڑکی بسنتو بسنتو کہلا کر جوان ہوئی ہو، اب اس کا

نام بدلنے کا فائدہ؟ چھوڑو، یار، بس کہ جو دیا کہ میں بسنتو سے شادی نہیں کر سکتا۔"

میں نے کہا "یار، عقل کی بات کر۔"

بولا "بھائی، پسند ناپسند عقل کی بات نہیں ہوتی۔ تجھے اتنا بھی نہیں معلوم؟" پھر ہنس کر کہنے لگا "دیکھ، پھلوں میں مجھے خربوزہ پسند ہے حالانکہ خربوزے میں پھل کی بات نہیں۔ نہ مفرح ہے، نہ خوشبودار ہے، نہ ذائقے دار ہے۔ اس کے باوجود مجھے پسند ہے۔ کر لے میرا کیا کرتا ہے۔"

اس زمانے میں مجھ میں سب سے بڑی خامی یہ تھی کہ میں عقل کا پرستار تھا۔ ہر بات عقل کی کسوٹی پر رکھ کر جانچتا تھا۔ فلسفے کا طالب علم تھا۔ رسل، ہکسلے، فرائیڈ، برگساں اور نیٹشے کا فین تھا۔

اس روز میرے دل میں شبہ سا بیٹھ گیا کہ کیا نام اتنا ہی اہم ہے کہ ایک نوجوان نام کی بنا پر بیاہ کرنے سے انکار کر دے؟ یا کسی لڑکی سے اس کے نام کی وجہ سے محبت کرنے لگے؟ اب مجھے شعور ہے کہ نام بہت اہم ہوتے ہیں اور وہ افراد پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

حال ہی میں پاکستان ٹیلی وژن نے اپنے جانے پہچانے پروگرام ففٹی ففٹی میں نام کی تاثیر پر بہت عمدہ تبصرہ کیا۔ ایک صاحب سڑک پر سکوٹر پہ جا رہے تھے۔ غلط طریقے سے موڑ کاٹا تو ٹریفک سپاہی نے روک لیا۔ جیب سے چالان کی کاپی نکالی۔ پوچھا "کیا نام ہے تمہارا؟" سکوٹر سوار نے جواب دیا "مستنصر تارڑ۔" نام سن کر سپاہی گھبرا گیا۔ پھر سے پوچھا۔ سکوٹر سوار نے اپنا نام دہرایا۔ سپاہی منہ میں پنسل ڈال کر کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر بولا "جا جا۔ آئندہ اس طرح موڑ نہ کاٹنا۔ سمجھا؟"

ناموں کی بات ہو رہی تھی۔ محفل میں ایک ڈپٹی کمشنر بیٹھے تھے۔ بولے "ہماری کچہری میں ایک مجسٹریٹ ہیں، کوڑا خان۔ پڑھے لکھے ہیں۔ مزاج کے کڑوے نہیں۔ ہمدرد ہیں۔ معقول ہیں۔ لیکن جس کا مقدمہ ان کی کچہری میں لگتا ہوں، وہ کچہری بدلنے کی درخواست دے دیتا ہے۔ بڑی مشکل میں پڑے ہیں ہم۔"

نام کے تین پہلو ہوتے ہیں : صوتی اثر، مفہوم اور تاثیر۔ کچھ نام صوتی اثر کے لحاظ سے ہلکے پھلکے ہوتے ہیں۔ کچھ بھاری بوجھل ہوتے ہیں۔ کچھ زیادہ ہی گاڑھے ہوتے ہیں۔ اور کچھ حلق میں یوں پھنس جاتے ہیں جیسے مچھلی کا کانٹا۔ ان کا بولنا حلق پر ظلم کرنے کے مترادف ہوتا ہے۔ مثلاً غضنفر ایسا نام ہے جسے آپ بار بار بولیں تو یقیناً آپ کو ٹانسلز کا عارضہ لاحق ہو جائے۔

اوورسیز پاکستانیز۔ فاؤنڈیشن میں میرے ایک دوست تھے۔ ان کا نام غضنفر تھا میرے لیے بڑی مشکل پیدا ہو گئی۔ میرا گلا تو پہلے سے ہی مضطرب ہے۔ میں نے سوچا، اب کیا ہوگا؟ روز گھر جا کر نمک کے غرارے کرنے پڑیں گے۔ وہ تو اللہ نے کرم کر دیا کہ ان کے نام کا دوسرا حصہ مہدی نکلا، ورنہ مجھ پر ای این ٹی کے پھیرے لگانے لازم ہو جاتے۔

کراچی میں میرے ایک ہم کار تھے، کہکشاں حقانی۔ میں ان کے ساتھ چھ مہینے رہا۔ آج تک گلے کا کوا سوجا ہوا ہے۔

ہمارے ایک جانے پہچانے ادیب ہیں۔ بہت اچھا لکھتے ہیں۔ مزاج کے باغ و بہار ہیں۔ انھیں صرف اس لیے دوست نہیں بنا سکا کہ ان کا نام خشک ہے۔

ناموں کے معاملے میں ایک اور دقت ہے۔ ماں باپ بچّے کا مقدس نام رکھ دیتے ہیں۔ مثلاً محمد علی، اللہ بخش، محمد حسین۔ محمد علی کو نہ آپ محمد کہہ کر بلا سکتے ہیں نہ علی کہہ کر۔ پھر یہ بھی ہے کہ پیار سے نام بگاڑ بھی نہیں سکتے۔ میرا تجربہ ہے کہ اظہارِ محبت کے لیے نام بگاڑنا بے حد ضروری ہوتا ہے۔ مثلاً میرے بیٹے کا نام عکسی ہے۔ اگر میں اسے عکسی کہہ کر بلاؤں تو اجنبیت سی محسوس کرتا ہوں۔ اس لیے میں اُسے اچھی کہہ کر بلاتا ہوں۔

پتا نہیں ایسے کیوں ہوتا ہے۔ لیکن ایسا ہوتا ہے کہ جس کے لیے آپ کے دل میں محبت ہے آپ اس کے نام کو بگاڑنے پر خود کو مجبور پاتے ہیں۔ رضیہ کو رضو کہتے ہیں۔ اقبال کو بال، مقبول کو بولی۔

مقدس نام موزوں نہیں رہتے۔ کم از کم نام کا ایک حصہ ضرور غیر مقدس ہونا چاہیے کہ آپ اسے بُرا بھلا کہہ سکیں، غصے میں گالی دے سکیں۔ دُر پھٹے مُنہ کہہ سکیں۔

فرض کیجیے آپ کا نام غلام محمد ہے۔ چلیے ایک حصہ تو مقدس نہیں۔ لاڈ پیار، چہل، غصے کا اظہار اس حصے کی مدد سے کیا جا سکتا ہے۔ لیکن غلام محمد میں ایک دقت پیدا ہو گئی۔ لوگ آپ کو غلام غلام کہہ کر پکاریں گے۔ آپ ہی سوچیے کہ اگر ایک فرد سالہا سال غلام کی آواز پر جی ہاں کہتا رہے گا تو اس کی نفسیات کا تو فالودہ بن جائے گا۔ بے چارہ بالکل ہی غلام بن کر رہ جائے گا۔ ایسا نام رکھنے پر تو بے رحمی والوں کو ایکشن لینا چاہیے۔

پھر ایک اور دقت پیدا ہو جاتی ہے۔ چلیے ماں باپ تو مقدس نام رکھ کر اپنے فرض سے سبکدوش ہو گئے۔ غلام محمد جوان ہُوا، تحصیلِ علم سے فارغ ہُوا، بڑے عہدے پر فائز ہُوا تو بے چارے کو نام کی دِقت پڑ گئی۔

آج کل کے مغرب زدہ دور میں کچھ لوگ پسند نہیں کرتے کہ ان کے نام سے مذہب کی بُو آئے۔ وہ سیکلر بننا پسند کرتے ہیں۔ نام سے مذہب کی بُو آئے تو سٹیٹس میں فرق آتا ہے۔ اس مشکل کو حل کرنے کے لیے وہ اپنے نام کے ساتھ ایک اور لفظ بڑھا دیتے ہیں، بطرز تخلص۔ مثلاً غلام محمد نے سرشار کا لفظ بڑھا لیا۔ پھر مذہبی نام کو کیما فلاج کر لیا۔ یوں وہ اپنا نام جی ایم سرشار لکھنے لگے۔ نذر محمد خود کو ن م راشد لکھنے لگتا ہے۔ محمد حسین ایم ایچ جھٹہ میں پناہ لیتا ہے۔

معنوی پہلو سے نام کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ مثلاً میرا ایک دوست ہے، نور دین۔ اس کی شخصیت دیکھیے تو نام کی ضد ہے۔ نہ اس میں نور ہے، نہ دین ہے۔ نام لینے والا خواہ مخواہ شرمندہ ہوتا ہے۔ جیسے برملا جھوٹ بول رہا ہو۔ پھر میری ایک عزیزہ ہیں۔ ان کا نام حسینہ ہے۔ دیکھنے میں انھیں حُسن سے دُور کا تعلق بھی نہیں۔ جب انھیں حسینہ کہہ کر بلایا جاتا ہے تو ان کی بدصورتی اور بھی نمایاں ہو جاتی ہے۔ ایک خاتون پر اس سے بڑھ کر اور کیا ظلم ہو سکتا ہے۔

میرے ایک دوست ہیں، جمال خان۔ ان کے خدوخال بڑے نستعلیق ہیں۔ رنگ گورا

ہے۔ چہرہ اس قدر کلچرڈ ہے کہ جمال پر بالکل فٹ بیٹھتا ہے۔ لیکن خان سارا طلسم توڑ دیتا ہے۔ سیدھی بات ہے کہ خان کے ساتھ بہت سے نام لگتے ہیں۔ مثلاً ہیبت خان، دلاور خان، بہادر خان، اکھڑ خان، عظمت خان، جلال خان۔ جمال نہیں لگتا۔ کہاں جمال کہاں خان۔ میں نے اپنے دوست جمال خان کو کئی بار سمجھایا ہے کہ بھائی میرے یہ گنگا جمنی نام نہیں چلتا۔ ایک حصّہ میٹھا دوسرا نمکین۔ بات نہیں بنتی۔ لیکن اس نے کبھی میری بات کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھا۔ چلو، ہم نے تو اپنا فرض ادا کر دیا۔

نام کے دو حصّوں میں بے ربطی نہیں ہونی چاہیے۔ پھر یہ بھی ضروری ہے کہ نام اور شخصیت ہم آہنگ ہوں۔ اہلِ مغرب نے نام کی اہمیت کو بالکل نہیں سمجھا۔ انھوں نے ناموں کا ستیاناس کر کے رکھ دیا ہے۔ کوئی خود کو فاکس کہلاتا ہے، کوئی وُلف، کوئی گرانڈ واٹر کا نام رکھے بیٹھا ہے، کوئی باٹل نک۔ حیرت ہے کہ اتنے مہذب لیکن اتنے بے حس۔ بات سمجھ میں نہیں آتی۔ حیرت اس بات پر ہے کہ ایسے بے معنی نام انھیں سُوجھتے کس طرح ہیں؟ نہ معنے نہ سُر نہ تال۔ روسی ناموں سے اللہ پناہ میں رکھے۔ میں رُوسی لکھنے والوں کا مدّاح ہوں۔ دستووسکی کا فین ہوں۔ دستووسکی کا مطالعہ کیا تو سب سے بڑی مشکل ناموں نے پیدا کی۔ آدھی آدھی سطر کا ایک ایک نام۔ اور ہر نام میں تقریباً ساری اے بی سی ڈی سمائی ہوئی۔ میں نے تو پُورا نام کبھی نہیں پڑھا۔ دیکھ لیتا۔ پہچان لیتا۔ پہلا حصّہ پی سے شروع ہوتا ہے، دُوسرا اوی سے۔

تقسیم سے پہلے یہاں ایک انگریز کمشنر تھے، مسٹر مُون۔ میں نے مون صاحب کو بہت سمجھایا۔ میں نے کہا "آپ دولتِ انگلشیہ کے نمائندہ افسر ہیں۔ آپ کی مملکت بڑی عظیم ہے جس پر سُورج غروب نہیں ہوتا۔ اتنی عظیم مملکت کے نمائندے کو زیب نہیں دیتا کہ خود کو مُون کہلوائے۔ اوّل تو چاند میں نسائیت کا عنصر ہے، دوسرے چاند گھٹتا بڑھتا، ادلتا بدلتا رہتا ہے۔ تیسرے روشنی کے لیے دوسرے کا محتاج ہے۔ جنابِ والا، بہتر ہوگا کہ آپ مون کی جگہ اپنا نام سَن رکھ لیں۔ مسٹر مون نے میری بات کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا۔ سمجھ لیتے تو آج سلطنتِ انگلشیہ پر سُورج

غروب نہ ہو پاتا۔ بہر صورت، ہم نے اپنا فرض ادا کر دیا۔

صرف مُون کی ہی بات نہیں، ہم آپ کو بھی سمجھا رہے ہیں۔ آپ سمجھیں نہ سمجھیں۔ آپ کی مرضی۔

میرے کئی ایک دوست ہیں جن کے ناموں پر مجھے اعتراض ہے۔ مثلاً آفتاب ہے۔ میں نے کئی مرتبہ اسے سمجھایا ہے کہ یار، یہ نام بہت گرم ہے۔ دیکھو تو، یہاں پہلے ہی اتنی گرمی ہے۔ صرف سورج کی ہی نہیں، اس کے علاوہ نئی نسل کی بھی تو ہے۔ موڈ یوں ادلتے بدلتے ہیں جیسے بادل شکلیں بدلتا ہے۔ غصّے ناک پر دھرے ہیں۔ موٹر سائیکل گھاؤں گھاؤں کر رہے ہیں۔

میں نے کہا "بھائی آفتاب، یہ نام شاید ٹھنڈے ملکوں میں چل جائے۔ یہاں نہیں چلے گا۔ ہماری پرابلم تو ٹھنڈے رہنا ہے۔ تو کوئی ٹھنڈا میٹھا نام رکھ لے۔ آفتاب کی نسبت تو کوکا کولا ہی اچھا ہے۔" لیکن اس نے میری بات نہیں مانی۔

پھر میرے کرم فرما جلال ہیں۔ اب میں ان کو کیسے سمجھاؤں کہ جناب جلال کوئی قابلِ حصول کیفیت نہیں۔ اُلٹا مجذوبیت پیدا کرتی ہے۔ اس میں سے ایگریشن کی بُو آتی ہے۔

پھر ایک محترمہ ہیں، لطیفہ۔ اب میں انھیں کس طرح بتاؤں کہ لطیفے کو کوئی سنجیدگی سے نہیں لے گا۔ لوگ صرف تفریح سمجھیں گے، اور یہ کتنی بُری بات ہے۔

صاحبو! اب میں کس کس کا نام گنواؤں۔

پھر ہمارے ادیبوں نے ناموں کا ستیاناس کر کے رکھ دیا ہے۔ پہلے تو ناموں کے ساتھ تخلص جوڑے۔ کوئی محروم ہے۔ کوئی آہ ہے۔ کوئی حزن ہے۔ کوئی ملال ہے۔ زیادہ تر غمزدہ قسم کے۔ پھر یوں کیا کہ نام کے ساتھ جنم بھومی کا نام ٹانک دیا۔ مثلاً مجید لاہوری، ضیا جالندھری، بابر بٹالوی۔ ایک صاحب مونچھ گاؤں کے رہنے والے تھے۔ انھوں نے اپنے نام کے ساتھ مونچھوی بڑھا دیا۔ اس پر ہم خوف زدہ ہو گئے کہ کہیں ریاست پونچھ کے کوئی ادیب پونچھوی

لکھنا شروع نہ کر دیں۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ ہمارے بیسیوں ادیب آج بھی اپنے نام کے ساتھ دہلوی، اجمیری، الہ آبادی، اکبر آبادی لکھ رہے ہیں، حالانکہ انھیں اب ان شہروں سے کوئی تعلق نہیں۔

اب ذرا اداروں کے نام لیجیے۔ الحمدللہ کہ پاکستان اب اسلامی جمہوریہ ہے۔ لیکن اسلامی جمہوریہ کے تحت کئی ایک نام بدل جانے چاہئیں تھے، جو آج بھی جوں کے توں قائم ہیں۔ مثلاً سرکار کو ہم اب بھی گورنمنٹ آف پاکستان کہتے ہیں۔ یعنی حکومت کا لفظ آج تک قائم ہے۔ اگر آپ اسے حکومت کہیں گے تو ظاہر ہے کہ اس کے کارندے حکمرانی کریں گے۔ مونچھ پر تاؤ دیے رکھیں گے۔ کالر سٹف رہیں گے۔ گردن اکڑی رہے گی۔ ساتھ بیٹھ کر بھی اونچے رہیں گے۔

فرض کیجیے آپ حکومت کے لفظ کو بدل کر خدمت کا لفظ رائج کر دیتے ہیں۔ یعنی خدمتِ پاکستان، تو لازم ہو گا کہ کارندوں کی نفسیات پر کچھ نہ کچھ اثر پڑے۔ خادم بنیں نہ بنیں، حاکم نہیں رہیں گے۔ بادشاہ کو تو ہم نے صدر کا لقب دے دیا۔ خوب کیا۔ لیکن وزیر اور وزارت جوں کے توں رہے۔ جو وزیر ہیں وہ تو وزارت کریں گے، اور وزارت من مانی کرے گی۔ کیوں نہ کرے؟ کیوں نہ مونچھ مروڑ کر بیٹھے؟ کیوں نہ عوام سے ممتاز رہے؟ نام کے اثر سے خود کو محفوظ کرنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ عہدہ اس سے بھی زیادہ اثر انگیز ہوتا ہے۔ جبھی تو کچھ ممالک نے وزارت کو نظامت میں بدل دیا ہے۔

پھر چھوٹے عہدوں کی بات لیجیے۔ آپ مجھے ڈائرکٹر بنا دیں تو مجھے احساس ہونے لگے گا کہ میرا کام ڈائرکٹ کرنا ہے۔ ہدایات دینا ہے۔ حکم چلانا ہے۔ مشورہ لینا نہیں۔ فیصلے کرنا ہے۔ اسی طرح کنٹرولر ہے۔ کنٹرولر تو کنٹرول کرے گا۔ وہ کسی کی کیوں سنے؟

مشکل یہ ہے کہ ابھی تک ہم میں یہ احساس پیدا نہیں ہوا کہ نام بہت اہم ہوتا ہے۔ وہ فرد کو اپنے رنگ میں رنگ دیتا ہے۔ ہم اس کے اثر سے بچ نہیں سکتے۔

میں نے زندگی میں ایک نام دیکھا ہے جو ہر لحاظ سے مکمل، جامع اور پرفیکٹ ہے۔ صوتی، معنوی، نفسیاتی ہر لحاظ سے اعلیٰ و ارفع ہے۔ اس میں سُر ہے، لے ہے، نغمگی ہے، معنوی لحاظ سے مثبت اثرات سے بھرپور ہے، ماڈرن ناموں کی طرح مختصر ہے، جامع ہے، پیارا ہے، مفہوم کے اعتبار سے قابلِ احترام ہے، قابلِ ستائش ہے۔ اور وہ ہے محمدؐ ـــــ سبحان اللہ! کیا نام ہے!

غصیل دور

آج کا دور بڑا غصیل دور ہے۔ ہر کوئی غصہ ناک پر دھرے پھرتا ہے۔ ہر کوئی منتظر رہتا ہے کہ کوئی بات ہو، بہانہ ہاتھ آئے تو وہ غصے کی تلوار نکال کر اسے لہرائے۔

اوروں کی بات چھوڑیے۔ میری اپنی حالت یہ ہے کہ بات بات پر تاؤ کھا جاتا ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں ایک کمزور اور نروس آدمی ہوں۔ کمزور اور نروس آدمی کو غصہ یوں جھنجھوڑتا رہتا ہے جیسے بچے بیری کے درخت کو جھنجھوڑتے ہیں۔ مضبوط یا طاقتور انسان پر غصے کا بس نہیں چلتا۔ تو ظاہر ہے کہ آج کا غصیل دور کمزور اور نروس لوگوں کا دور ہے۔

آج کل لوگ اپنی نسوں سے یوں کھیلتے رہتے ہیں جیسے وہ کھلونے ہوں۔ ذرا سی بات ہوئی تو تاؤ میں آگئے اور لگے اپنی نسوں کو بجانے۔ حتیٰ کہ وہ یوں چھڑ جاتی ہیں جیسے سارنگی کے تار ہوں۔ پھر ان کی بھن بھن کی دھنکی بجتی ہے اور یہ بھن بھن سارے جسم میں یوں گونجتی ہے جیسے اندر مکھیوں کا چھتا چھڑ گیا ہو۔ پھر خون اُبلنے لگتا ہے اور عقل و ہوش دھندلا جاتے ہیں۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ غصہ بُری چیز ہے۔ غصہ تو اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت ہے جو انسان کو اس لیے عطا ہوئی ہے کہ خطرے کے وقت اپنا بچاؤ کر سکے۔ یوں سمجھ لیجیے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں غصے کی تلوار بخش رکھی ہے کہ جب کبھی خطرہ سامنے آئے تو یہ تلوار نکال کر اپنی حفاظت کر سکیں۔ مشکل یہ ہے کہ ہم نے اس تلوار کو کھلونا سمجھ لیا ہے اور ہر وقت اس سے کھیلتے رہتے ہیں۔

عالموں کا کہنا ہے کہ بے شک غصہ ایک ڈیفنس میکنزم یعنی حفاظتی چیز ہے۔ ہوتا کیا ہے؟ فرض کیجیے اچانک دو آدمی آپ پر حملہ کر دیتے ہیں۔ فرض کیجیے آپ میں صرف آدھ کلو طاقت

موجود ہے۔ دو آدمیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے آدھ کلو طاقت ناکافی ہے۔ انسانی جسم ایک لاجواب مشین ہے۔ آپ کے جسم نے صورتِ حال کو دیکھا۔ فٹ سے ایک تھیلی کے منہ کو کھولا اور اس میں سے چند قطرے خون میں ٹپکا دیے۔ اس محلول کو ڈاکٹر لوگ ایڈریلین کہتے ہیں۔

جونہی ایڈریلین آپ کے خون میں داخل ہوتی ہے وہ کھولنے لگتا ہے۔ نسوں میں اک طوفان آجاتا ہے۔ بلبلے اٹھنے لگتے ہیں جیسے سوڈے میں چٹکی بھر نمک ڈالنے سے بلبلے نکلنے لگتے ہیں۔ پھر خون تیزی سے جسم میں چلتا ہے۔ آنکھیں سرخ ہو جاتی ہیں۔ کنپٹیاں تھرکنے لگتی ہیں۔ یعنی آپ کی آدھ کلو طاقت بڑھ کر ایک کلو ہو جاتی ہے تاکہ آپ حملہ آوروں کا مقابلہ کر سکیں۔ اس سارے عمل کو غصہ کہتے ہیں۔

آج کے غصیل دور کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ خطرے کا مقام ہو یا نہ ہو، مقابلے کی صورت ہو یا نہ ہو، اپنی حفاظت کی ضرورت ہو یا نہ ہو، لوگ خواہ مخواہ غصے میں آجاتے ہیں۔ بلکہ یوں کہیے کہ غصے کے عالم میں رہنا پسند کرتے ہیں۔ یہ کفرانِ نعمت ہے۔ اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کو ناجائز طور پر استعمال کرنا بہت بڑی ناشکری ہے۔

پرانے زمانے میں جب انسان جنگلی دور میں تھا تو غصہ ایک اندھا جذبہ ہوا کرتا تھا۔ ہوتا یوں تھا کہ اگر آپ پر کسی نے پتھر پھینکا اور پھر بھاگ گیا، اس پر آپ کو غصہ آجاتا۔

آپ اپنا تیر کمان اٹھا لیتے اور گھر سے باہر نکل جاتے۔ باہر کوئی بھی چلتا پھرتا نظر آتا، چاہے وہ انسان ہوتا یا پرندہ یا پڑوسی کی بھینس، آپ اس پر تیر چلا دیتے۔ اور پھر اپنا غصہ ٹھنڈا کرنے کے بعد جھونپڑے میں داخل ہو کر آرام سے اپنے کام کاج میں مصروف ہو جاتے۔ اس زمانے میں بدلے یا انتقام کا سوال نہ تھا۔ صرف دل ٹھنڈا کرنے کی بات تھی۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ انسان مہذب ہوتا گیا اور اس کی سمجھ میں آگیا کہ غصہ نکالنے کے لیے ضروری ہے کہ غصہ دلانے والے کو سزا دی جائے۔ آج کی صورتِ حال کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ ہم پھر سے جنگلی دور میں جا داخل ہوئے ہیں۔ جب بھی ہم غصے میں آتے ہیں تو جوش میں باہر نکل جاتے ہیں۔ سڑک پر چلتی بسوں کو روک کر انھیں آگ لگا دیتے ہیں۔ چلتی گاڑیوں پر پتھر پھینکتے ہیں۔ چار ایک نعرے لگاتے ہیں۔ منہ سے جھاگ نکالتے ہیں اور یوں

دل ٹھنڈا کرنے کے بعد اپنے کارنامے پر نازاں خوشی خوشی گھر لوٹ آتے ہیں۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ دورِ جدید کے لوگ ہر وقت غصّے میں کیسے رہتے ہیں! بھئی غصّہ تو ایک آنی جانی چیز ہے۔ لیکن اسے قائم کر لینا، یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔ سیانوں کا کہنا ہے کہ غصّہ پہاڑ کی برفیلی چوٹی کی طرح ہے۔ آپ چوٹی پر جا سکتے ہیں۔ وہاں قیام نہیں کر سکتے۔

میرا ذاتی تجربہ ہے کہ میں اکثر غصّے میں آجاتا ہوں۔ لیکن جونہی غصّے میں آتا ہوں، جی چاہتا ہے کہ باہر نکل جاؤں۔ پتا نہیں کیوں۔ لیکن غصّہ آجائے تو وہ مجھے کاٹنے لگتا ہے۔ وہ مجھے اپنے چنگل میں پکڑ لیتا ہے اور پھر یوں توڑتا مروڑتا نچوڑتا ہے جیسے کوئی کپڑا دھوبی کے ہاتھ چڑھ گیا ہو۔ اس مار پیٹ سے تنگ آکر میرا جی چاہتا ہے کہ میری جان چھوٹ جائے۔ پھر جب غصّہ اتر جاتا ہے تو میں سُکھ کا سانس لیتا ہوں۔ اب اس وقت میں سوچتا ہوں کہ یہ غصّہ کیسی بیہودہ چیز ہے جو دُوسرے کو نقصان پہنچانے کی نسبت مجھے زیادہ نقصان پہنچاتا ہے۔ مجھے توڑتا ہے، مروڑتا ہے، میرے جسم کو بلونی کی طرح بلو کر رکھ دیتا ہے، میرے ذہن کی پھپھوندی اُڑا دیتا ہے۔ سیانے سچ کہتے ہیں واقعی غصّہ ایک ایسی چھُری ہے جو انسان اپنے ہی سینے میں بھونک لیتا ہے۔

پُرانے زمانے میں لوگ غصّے کو اچھّا نہیں جانتے تھے۔ غصّے میں آتو جاتے مگر یہ تسلیم نہ کرتے تھے کہ وہ غصّے میں ہیں۔ اور پھر جب غصّہ اُتر جاتا تو اپنی اس کمزوری پر شرمسار ہوتے اور دل ہی دل میں اپنی حماقت پر پشیمانی محسوس کرتے۔

ان دنوں کوئی بھی غصّے یا تشدّد پر فخر نہیں کرتا تھا۔ اس کے برعکس آج کل لوگ غُصّے اور تشدّد کے گُن گاتے ہیں۔ انھیں یوں اپنے سینے پر سجائے پھرتے ہیں جیسے وہ تمغے ہوں۔

لوگ علانیہ تشدّد کا پرچار کرتے پھرتے ہیں، اور جو شخص ان کی ہاں میں ہاں نہ ملائے اسے حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

پتا نہیں سوچ کا یہ انداز ہمارے ہاں کہاں سے آگیا ہے! ضرور دساور سے آیا ہوگا کیونکہ یہ انداز مشرقی نہیں۔ اس میں ہماری روایات کا رنگ نہیں۔ بلاشک و شبہ یہ کوئی بیرونی

چیز ہے جسے چوری چھپے ہمارے ملک میں سمگل کر کے بھیجا گیا ہے تاکہ ہماری مٹی میں نمو پائے، پھلے پھولے اور خاردار جھاڑی کی طرح پھیل جائے اور تخریب کے کانٹے بکھیر دے۔

بڑی طاقتیں یہ پسند نہیں کرتیں کہ چھوٹی مملکتیں امن چین سے جئیں۔ اس لیے وہ ایسی سوچوں کے جراثیم بھیجتی رہتی ہیں جو ذہنوں کو مشتعل کریں، جذبات میں جوش پیدا کریں، غصہ ابھاریں، تشدد پسندی کو شہ دیں۔

آپا

اپنے ایک افسانے کا تجزیہ

آپا میری جانی پہچانی کردار کہانی ہے۔ کچھ لوگ تو اسے میری پہچان سمجھتے ہیں۔ اس کے باوجود میرے نزدیک وہ ایک "فل گیپ" کہانی تھی۔ اب بھی ہے۔ اس کی دو وجوہ تھیں:

پہلی وجہ یہ تھی کہ یہ کہانی کسی کی فرمائش پوری کرنے کے لیے لکھی گئی تھی۔ فرمائش کرنے والے لوگ میرے محسن تھے۔ مجھے اُن کے احسان کا بدلہ چکانا تھا۔ ایک اخلاقی فرض پورا کرنا تھا۔ آپ جانتے ہیں کہ اخلاقی فرض پورا کرنے کی خواہش چاہے کتنی ہی شدید کیوں نہ ہو، پھر بھی اس سے عہدہ برآ ہونا جان چھڑانے کے مترادف ہوتا ہے۔ مطلب یہ کہ آپا میں نے اپنی خواہش کے یا آمد کے تحت نہیں لکھی تھی۔ اگر فرمائش نہ ہوتی تو شاید میں آپا پر کبھی افسانہ نہ لکھتا۔

دوسری وجہ بھی سُن لیجیے۔ میں ان لکھنے والوں میں سے ہوں جنھیں شہرت پہلے ہی پیشگی طور پر مل گئی، اور بعد میں افسانہ نویسی سیکھنا پڑی۔ عام طور سے ہوتا یوں ہے کہ لوگ پہلے لکھتے ہیں، بار بار لکھتے ہیں، پھر چھپتے ہیں، بار بار چھپتے ہیں۔ پھر کہیں شہرت حاصل ہوتی ہے۔ اور یہ بھی لازم نہیں کہ ضرور شہرت حاصل ہو جائے۔

میں نے پہلی چیز بھی فرمائش پر لکھی تھی۔ خواہش یا آمد کا عنصر نہ تھا۔ ویسے ہی لکھ دی۔ جان چھڑانے کے لیے۔ وہ چیز چھپ گئی۔ خالی چھپی ہی نہیں بلکہ بڑے دھوم دھڑکے سے چھپی۔ یوں بیٹھے بٹھلائے اَن جانے میں شہرت حاصل ہو جانے کے بعد یہ مشکل آپڑی کہ مجھے سنجیدگی سے

سوچنا پڑا کہ کیا لکھوں ؟ کیسے لکھوں ؟ سوچ سوچ کر میں نے یہ طے کیا کہ افسانے کا موضوع انوکھا ہو۔ گہرا ہو۔ کوئی عظیم حقیقت۔ عام نہیں، عظیم۔ دل کی تہوں میں چھپی ہوئی کوئی بات۔ جتنی دُور کی کوڑی لاؤں، اتنا ہی اچھا۔

اس زمانے میں آپا ایک عام کردار تھا۔ ہر گھر میں چولہے کے قریب چوکی یا پیڑھی پر ایک نہ ایک آپا بیٹھی ہوتی تھی جو نگاہیں جھکائے رکھتی۔ پلّو کی اوٹ میں سکاتی اور دھیمی آواز میں بات کرتی۔ اس زمانے میں بھی آپا کی تعریف کرتے تھے۔ لیکن کوئی بھی اسے دل سے نہیں چاہتا تھا۔ البتہ ان دنوں ساجو باجی عام نہ تھی۔ بڑے بوڑھے اس کو دیکھ کر کانوں پر ہاتھ رکھتے۔ بڑی بوڑھیاں منہ میں انگلیاں ڈال لیتیں۔ نوجوان ساجو باجی کو دیکھتے تو آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتیں۔ باچھیں کھل جاتیں۔

آج کل تو سڑکوں پر، بازاروں میں، دکانوں پر، بسوں میں، ریستوں پر، گلیوں میں، ہر جگہ ساجو باجیوں کی بھیڑ لگی ہے۔ آج کل تو آپائیں معدوم ہوتی جا رہی ہیں۔ لیکن اس زمانے میں آپا ایک عام چیز تھی، بے حد عام۔ ایک ایسے افسانہ نویس کے لیے جسے پیشگی شہرت مل چکی تھی، آپا سے عام موضوع پر قلم اٹھانا بھلا کوئی بات تھی۔ ان دو وجوہ کی بنا پر میرے نزدیک آپا کی حیثیت ایک "فِل گیپ" افسانے سے زیادہ نہ تھی۔

اب فرمائش کی تفصیلات بھی سن لیجیے۔ یعنی آپا لکھنے کی فرمائش کرنے والے لوگ کون تھے۔ کن حالات میں فرمائش کی گئی۔ اور میں اس فرمائش کو پورا کرنے پر کیوں مجبور تھا۔

یہ ۱۹۴۰ء کی بات ہے۔ ان دنوں میں ایک ہائی سکول میں ٹیچر تھا۔ تنخواہ نہایت قلیل تھی۔ کھانے والے تعداد میں زیادہ تھے۔ اگرچہ میں نے یہ اصول بنا رکھا تھا کہ ٹیوشن نہیں کروں گا لیکن حالات نے مجبور کر دیا۔ میں نے اپنے ایک ہمدرد اور صاحب رسوخ دوست سے کہا کہ اگر ہو سکے تو کوئی ٹیوشن دلا دے۔ ایک روز میرے دوست میرے ہاں آئے۔ بولے "ٹیوشن کرو گے ؟ ارادہ بدل تو نہیں گیا ؟" میں نے کہا "ضرور کروں گا۔ ارادہ اور بھی

پکا ہو گیا ہے"۔ وہ مجھے شہر کے ایک رئیس کے گھر لے گئے۔ تعارف کرایا۔ معزز رئیس نے میرا جائزہ لیا۔ پھر کہنے لگے "آؤ، میں تمہیں تمہارے شاگردوں سے ملا دوں"۔ معزز رئیس میرا تعارف کرا کر چلے گئے تو میں نے آزادانہ آنکھ اُٹھا کر دیکھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ وہ دونوں میرے رُوبرو بیٹھی ہیں: آپا اور ساجو باجی۔ آپا بڑی تھی، سانولی تھی، نظریں جھکائے ہوئے تھی۔ کبھی کبھار کنکھیوں سے دیکھتی اور پلو کی اوٹ میں مسکاتی۔ ساجو چھوٹی تھی، گوری تھی، چلبلی تھی۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتی، مسکرائے جاتی اور لگاتار باتیں کیے جاتی۔

کچھ دیر تک وہ دونوں میرا جائزہ لیتی رہیں۔ آپا جھکی جھکی آنکھوں سے، ساجو علانیہ طور پر۔ ساجو نے منہ بنایا۔ بات بدلنے کے لیے میں نے پوچھا "کیا پڑھو گی؟" ساجو چپکے سے اُٹھی اور حساب اور الجبرے کی کتابیں اُٹھا کر میرے سامنے رکھ دیں۔ حساب اور الجبرا میں نے صرف میٹرک تک پڑھے تھے۔ میٹرک کے امتحان میں حساب اور الجبرے کے پرچے میں میں نے ۱۰۰ میں سے صرف ۱۶ نمبر حاصل کیے تھے۔ حساب الجبرا اپنے بس کی بات نہ تھی۔ دراصل میرا خیال تھا کہ ٹیوشن انگریزی کی ہو گی اور انگریزی میں میں اپنے آپ کو تیس مار خاں سمجھتا تھا۔ حساب کو دیکھ اپنی اُمیدوں پر پانی پھر گیا۔ ماتھے پر پسینا آ گیا۔ ساجو بات کو بھانپ گئی، اور اس کا اظہار کیے بغیر نہ رہ سکی۔ جھٹ اپنا رومال نکالا اور میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ میں نے کہا "اس رومال سے کیا بنے گا۔ گھر سے کوئی تھان اُٹھا لاؤ"۔ بس اس جملے نے مجھے قائم کر دیا۔ ابتدائی جائزے کے تاثرات گویا معدوم ہو گئے۔

میں نے کہا "ہٹاؤ، اس مضمون کو۔ ہم بنیوں کا مضمون نہیں پڑھاتے۔ انگریزی پڑھو۔ مضمون بتاؤ، تو انا"۔ ساجو بولی "انگریزی کیوں پڑھیں؟ اس میں تو ہم آپ لائق فائق ہیں"۔ اس پر میں نے فیصلہ کر لیا کہ کل سے پڑھانے نہیں آؤں گا۔ لہٰذا اِدھر اُدھر کی گپ میں وقت گزار دیا۔

اس کے بعد میں اُنھیں پڑھانے نہ گیا۔ تیسرے روز وہ رئیس بزرگ سکول میں

آ گئے ۔ بولے "میاں، تُم نے کمال کر دیا۔ ایک روز آئے ! اس کے بعد رسید ہی نہ دی"! میں نے صاف کہ دیا کہ جناب عالی، حساب پڑھانا اپنے بس کا روگ ہی نہیں ۔ بولے "میاں، کسر نفسی کی حد ہوتی ہے۔ لڑکیاں تو کہتی ہیں کہ حساب میں تم سے زیادہ لائق اتالیق کبھی دیکھا ہی نہیں"۔ میں نے لاکھ سمجھایا مگر وہ نہ مانے اور مجھے زبردستی اپنے ساتھ گھر لے گئے ۔

میں پہنچا تو وہ دونوں مُسکرا رہی تھیں۔ ساجرہ کی مسکراہٹ میں سکندرِ اعظم کی جھلک تھی ۔ میں نے بے تکلفی سے کہا "کیوں مجھے حساب کے جھنجھٹ میں ڈال رہی ہو تم؟ ایک سوال حل کرنے میں اپنا چھٹانک بھر خُون خشک ہوتا ہے "۔

اس پر ساجرہ نے اُٹھ کر میرے سامنے دو حل کیے ہُوئے پرچے رکھ دیے۔ یہ نوماہی امتحان کے حساب کے پرچے تھے ۔ آپا نے سو میں سے سو نمبر لیے تھے اور ساجرہ نے سو میں سے ۸۷ ۔ میں حیران رہ گیا۔ ساجرہ بولی "آپ تو خواہ مخواہ گھبرا گئے "۔ میں نے کہا "تو پھر ٹیوشن کا کیا مطلب ؟" ساجرہ بولی "پڑھ پڑھ کر تھک جاؤ تو کوفت بھی تو مٹانی ہوتی ہے "۔

پُورے دو ماہ ہم تینوں کوفت مٹاتے رہے ۔ کتابیں سامنے پھیلا کر گپیں مارتے رہے ۔ ظاہر ہے کہ اُنھوں نے بھانپ لیا تھا کہ میں حاجت مند ہوں ، اور وہ حاجت روائی کر رہی تھیں ۔ جب ساجرہ مجھے ماہوار معاوضہ دیتے ہوئے مُسکراتی تو میں کہتا "اچھا تو یہ ہماری حرام کی کمائی ہے "۔ اس پر وہ جھٹ بولتی "حلال کی کمائی سے کبھی کوئی موٹا ہُوا ہے کیا ؟"

دو مہینے کے بعد میرا تبادلہ ہو گیا۔ رُخصت ہوتے وقت میں نے ازراہِ مذاق کہا "کاش کہ میں کوئی خدمت کر سکتا!" اس پر آپا نے ساجرہ کو اشارہ کیا۔ ساجرہ بولی "کر سکتے ہیں آپ "۔ میں نے پوچھا "وہ کیسے ؟" بولی "آپ ہم پر ایک کہانی لکھ سکتے ہیں "۔ ان دو ماہ کے دوران انھیں علم ہو چکا تھا کہ میں افسانے لکھتا ہُوں ۔ رُخصت ہوتے وقت آپا نے دبی زبان سے کہا "کہانی ضرور لکھیے گا "۔ آپا کی وہ سرگوشی ابھی تک فضا میں تیر رہی ہے ۔

آپا چھپی تو گویا سُلگتی پر تیل پڑ گیا۔ پیشگی شہرت مُصدّقہ ہو گئی ۔ اس کے باوجود میں نے

اس حقیقت کو نہ سمجھا کہ عام حقیقتیں کس قدر غیر مانوس ہوتی ہیں۔ اور حقیقت کو چھپانے کے لیے عامیت کا پردہ دبیز ترین پردہ ہے۔ لیکن بدقسمتی سے میں نے اس حقیقت کو صرف جانا، مانا نہیں۔ آج تک نہیں مانا۔ آج تک یہ حقیقت میرے دل کی گہرائیوں میں نہیں بیٹھ سکی۔ اور آج تک میں افسانے کے لیے انوکھے موضوع ڈھونڈتا ہوں۔

آپا چھپی تو مشہور نقاد اور افسانہ نویس حسن عسکری نے مجھے پہلی مرتبہ خط لکھا۔ لکھا تھا "آپا بہت پسند آئی۔ لیکن ازراہِ کرم کسی ساجو باجی کا پتا لکھ بھیجیے۔" میرے اس افسانے پر اس سے بہتر تنقید نہیں ہو سکتی تھی۔ حسن عسکری کے اس ایک جملے میں معانی کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ آج بھی جبکہ ساجو باجیاں گھر گھر موجود ہیں اور ساجو باجی کا پتا پوچھنے کی چنداں ضرورت نہیں، آج بھی حسن عسکری کا وہ جملہ اسی طرح بامعنی ہے۔

انگریزی میں ایک کہاوت عام ہے: "جنٹلمن پریفر بلانڈز بٹ دے میری برونیٹس۔" مطلب یہ کہ شرفا نیلی آنکھوں والی خواتین کو پسند کرتے ہیں مگر شادی کالی آنکھوں والی سے کرتے ہیں۔

میرا افسانہ آپا اس کہاوت کی ضد تھا۔ میں نے اس افسانے میں یہ کہا کہ شرفا آپا کے مداح ہوتے ہیں لیکن ساجو سے بیاہ کرنے کی تمنا رکھتے ہیں۔ لیکن اب مجھے شک ہونے لگا ہے کہ جس تیز رفتاری سے ساجو باجیاں عام ہوتی جا رہی ہیں، اسے دیکھ کر خیال پیدا ہوتا ہے کہ شاید جلد ہی میرے اس افسانے کو پڑھ کر لوگ یہ محسوس کرنے لگیں یا کوئی نقاد مجھے خط میں لکھے کہ ساجو باجی بہت پسند آئی، کسی آپا کا پتا بتائیے۔

حالات کا رُخ دیکھ کر خیال پیدا ہوتا ہے کہ شاید مستقبل قریب میں آپا ایک خیالی کردار کی حیثیت اختیار کر لے، اور آپا کی محبت کی تفصیلات الف لیلہ کی باتیں معلوم ہونے لگیں، اور حسن عسکری کا وہ جملہ اپنی آفاقیت کھو دے۔ لیکن تاریخ شاہد ہے کہ کئی ایک بار ساجو باجیاں زمین کے کئی خطوں پر کھمبیوں کی طرح اگیں۔ ٹڈی دل کی طرح حملہ آور ہوئیں، لیکن ہمیشہ یہ سکندرِ اعظم

آندھی کی طرح آیا اور بگولے کی طرح چلا گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ قدرت کے کسی ان جانے اصول کے مطابق صدیوں کے بعد ساجو باجیوں کا دور آتا ہے، اور صرف اتنی دیر رہتا ہے جتنی دیر ستارہ ٹوٹتا ہے۔ آتا ہے اور چلا جاتا ہے۔ اور پھر صدیوں آپائیں راج کرتی ہیں۔ یعنی لوگ انھیں بے حد پسند کرتے ہیں۔ لیکن ساجو باجی کا پتا پوچھتے پھرتے ہیں۔

ساجو باجی ازلی محبوب ہے، اور قدرت ساجو باجی کو شاید اس لیے عام نہیں ہونے دیتی کہ مبادا وہ اپنی محبوبیت کھو دے اور عورت کی کشش عام ہو کر ختم ہو جائے۔ نہیں، حسن عسکری کا وہ جملہ اپنی آفاقیت نہیں کھو سکتا۔

میں نے محبت کے موضوع پر کئی افسانے لکھے ہیں۔ میں نے بار بار یہ کہنے کی کوشش کی ہے کہ محبت کئی ایک روپ دھارتی ہے۔ اور یہی نہیں، کئی بار بات اُلٹ بھی ہو جاتی ہے۔ دوسرے جذبے محبت کا سوانگ بھر لیتے ہیں۔ بالکل ایسے ہی جیسے ایک مرتبہ ایک بھڑ بھن بھن کرتی ہوئی پروانوں کی محفل میں آ دھمکی۔ بھن بھن کر کے بولی "میں بھی پروانہ ہوں ـــــ" اسی طرح کبھی نفرت کا جذبہ بھن بھن کر کے کہتا ہے "میں محبت ہوں"۔ کبھی انتقام کا جذبہ اپنی تسکین کے لیے محبت کا روپ دھار لیتا ہے۔ کبھی حالات ایسی شکل اختیار کر لیتے ہیں کہ محبت کا سوانگ بھرے بغیر چارہ نہیں رہتا۔ کبھی ضرورت محبت ایجاد کر لیتی ہے۔ کبھی پڑوس کی شرارت محبت کی شکل میں پھوٹ نکلتی ہے۔

ہاں، میں نے محبت پر کئی افسانے لکھے۔ دُور دُور کی کوڑی لانے کی کوشش کی۔ ان جانی باتیں کہنے کی کوشش کی۔ مجھے یہ خیال نہ آیا کہ عام محبت کی بات کروں۔ میں کوئی چھوٹا موٹا لکھاری تھوڑے ہی تھا کہ عام محبت پر افسانہ لکھتا، اور کسی عام کردار کو پیش کرتا۔ آپا تو ایک عام کردار تھا۔ اور اس افسانے میں محبت کی عام تفصیلات درج ہیں۔ یقیناً اگر فرمائش نہ ہوتی تو میں کبھی یہ افسانہ نہ لکھتا۔ لیکن قاری نے آپا پڑھ کر تالیاں بجائیں اور میرے محبت کے دُوسرے افسانوں کو نظر انداز کر دیا۔ یہ دیکھ کر میرے دل میں اُلٹی ضد

پیدا ہوئی۔ اگر عام پڑھنے والے ایسے عام افسانے پسند کرتے ہیں تو کیا کریں۔ میں کیا عام آدمیوں کے لیے لکھتا ہوں ؟

اور پھر آپا۔ آپا کا افسانہ تو خلوص سے خالی ہے۔ یکسر خالی ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ میں جو آپا کا مصنّف ہوں، خالق ہوں، میں نے لوگوں کی نگاہیں آپا کی طرف منعطف کیں۔ یہ دیکھیے۔ یہ آب دار موتی دیکھیے۔ اس کی آب و تاب دیکھیے۔ اس کی عظمت کا اندازہ کیجیے۔ لیکن لوگوں کی توجّہ آپا کی طرف منعطف کر کے میں خود ساجو باجی کا پتا پُوچھتا پھرا۔ کسی ساجو باجی کا پتا بتائیے۔ لِلّٰہ کسی ساجو کا پتا بتائیے۔ اور پڑھنے والوں نے افسانہ پڑھ کر کہا "آپا خوب ہے۔ بے حد خوب ہے۔ لیکن کسی ساجو باجی کا پتا بتائیے۔"

شاہراہِ ریشم

رپورتاژ

پھڑیار

"ارے!" لیڈر نے چیخ ماری "وہ دیکھو، وہ!"

سب کی نگاہیں آگے کی طرف اُٹھ گئیں۔ سامنے نہ شاہ تھی، نہ راہ تھی، نہ ریشم تھا۔ جہاں تک نگاہ کام کرتی تھی، سڑک پر چھوٹے بڑے پتھروں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے، جن سے چینی یوں چمٹے ہوئے تھے جیسے گڑ کی بھیلیوں سے چیونٹے۔ چینی ہی چینی۔ چیونٹے ہی چیونٹے۔

ڈرائیور نے فوراً وہیل گیئر لگا لیا۔

جیپ پتھروں کے ڈھیر پر رینگنے لگی۔ سواریاں اُچھلنے لگیں۔ بھٹیاری کی کڑاہی میں دانے بھُننے لگے۔ جیپ کے پیچھے ڈیڑھ دو سو ٹرک ہنہناتے، شور مچاتے، ڈولتے ہوئے، پتھروں پر لڑھکنے لگے۔

دائیں بائیں، دونوں جانب، سنگلاخ چٹانوں کی اُونچی اُونچی دیواریں کھڑی تھیں۔ نہ درخت، نہ جھاڑی، نہ ٹہنی، نہ پتا۔ سر پر سورج بے رحمی سے چمک رہا تھا۔ سڑک پر سائے کا نام و نشان نہ تھا۔ جہاں تک نگاہ کام کرتی تھی، نہ کوئی گاؤں نظر آ رہا تھا، نہ گھر۔

جیپ رینگتی رہی۔ لڑھکتی رہی۔

ہر چند میل کے بعد چینی کیمپ آ جاتا۔ دس بارہ دم بُخت قسم کے خیمے، جن کے قریب فرنٹیئر فورس کا سیکیورٹی حوالدار بندوق اُٹھائے، گردن گرائے، مونچھ لٹکائے کھڑا تھا۔

دور دور یہ سنسان، ویران، چٹیل چٹانوں سے گرمی کے بھبکے اُٹھ رہے تھے۔ پٹرول کی بُو ساری وادی میں پھیلی ہوئی تھی۔ نیچے دُور، نہ جانے کہاں دریا بہہ رہا تھا۔ مکھیوں کا چھتا بھن بھنا

رہا تھا۔

صدیاں بیت گئیں۔ جیپ کا چھکڑا رینگتا رہا۔ ٹرکوں کا قافلہ لڑھکتا رہا۔ سورج گردش کی قید سے آزاد ہو چکا تھا۔ اس نے ہمارے سروں پر جھنڈا گاڑ لیا۔

دفعتہً ایک دھچکا لگا اور جیپ رُک گئی!

سامنے پتھروں کے ڈھیر پر چینیوں کی ایک قطار کھڑی تھی۔ ہاتھ اُٹھا رکھے تھے سب یک زبان ہو کر چلا رہے تھے "چون۔ چون۔ چن چن۔ چیں چیں۔ بلاشٹن بلاشٹن۔"

"یہ کیا تماشا ہے؟" لیڈر غرّایا۔

"چینی تماشا" وٹ بولا۔

"بلاشٹن کا مطلب؟" انجینئر نے پوچھا۔

"ٹن کا مطلب تو واضح ہے۔ بلاشٹن کا پتا نہیں۔"

"یہ کیا وٹ جھاڑنے کا موقع ہے؟" لیڈر نے منہ سے جھاگ نکالتے ہوئے کہا۔

"وٹ اور ودھ میں کچھ زیادہ فرق نہیں" داستان گو بولا۔ شاعر نے قہقہہ مارا۔

اتنے میں چینی کیمپ سے ملحق خیمے سے حوالدار بندوق اُٹھائے آ گیا۔

"کیا بات ہے، حوالدار؟" ڈرائیور نے پوچھا۔

"صاحب، آگے بلاسٹنگ ہو رہا ہے۔ ٹریفک بند ہے۔ بلاسٹنگ ہو گا تو اُدھر سے پتھر گرے گا۔ سواری لوگ نیچے اُتر آئیں۔ ٹرکوں تلے "کور" لے لیں۔ جلدی جلدی، صاحب، جلدی۔"

"کب تک ٹریفک بند رہے گا، خان؟" ڈرائیور نے پوچھا۔

"دو دن" حوالدار نے مونچھ پہ تاؤ دیا۔

"دو دن؟" سب نے حیرت سے دُہرایا۔

"ہم کب تک ٹرکوں تلے کور لیے پڑے رہیں گے؟" لیڈر غصے سے غرّایا۔

"جب تک ہمارا مُربّا نہ بن جائے" وِٹ ہنسا۔

ڈٹا... ڈا... ڈوم.... ایک دھماکا ہوا۔ پہاڑوں نے دُہرا کر اُسے خوفناک بنا دیا۔ ڈر کر سب نے جیپ سے چھلانگیں لگا دیں، اور کود لینے کے لیے ڈرکوں کی طرف بھاگے۔

ہم کُل سات تھے : لیڈر، انجینئر، داستان گو شاعر، وِٹ، ڈرامشور اور میں۔

ہماری مُشکل یہ ہے کہ ساتوں بہت سیانے ہیں، ضرورت سے زیادہ سیانے۔ ہمارا ہر رُکن مذہب، سیاست، ادب، دفتریات، سائنس، فلسفہ غرض ہر موضوع پر حرفِ آخر ہے۔ اس لیے دُوسروں کو سمجھانا اور راہِ راست پر لانا اپنا فرضِ اوّلین سمجھتا ہے۔ اور چونکہ حرفِ آخر ہے، اس لیے دُوسروں کی بات سُننا یا اسے سمجھنا اس کی شان کے منافی ہے۔

دُنیاداری میں ہم سب ایسپ کے سیانے کوّے کی طرح پانی کی سطح اپنی چونچ تک اُبھارنے کے لیے مرتبان میں پتھر پھینکتے رہتے ہیں۔

ہم ساتوں رنگ رنگ کے منکے ہیں۔ کوئی چوکور، کوئی گول، کوئی مخروطی۔ جو بدقسمتی سے ایک لڑی میں پروئے گئے ہیں۔ اس لڑی کا نام ہے "چھڈ یار"۔

چھڈیار ایک چوکڑی ہے جو اتفاقاً وجود میں آئی۔ اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ ایک روز اَن جانے میں ہم سب پر ایک دیانت بھرا لمحہ نازل ہو گیا۔ اس کے تحت ہم سب نے محسوس کیا کہ سیانف اور معتبری کا بوجھ جُملہ بوجھوں سے زیادہ بوجھل ہے۔ اس لیے لازم ہے کہ ہم ہر سال آٹھ دس دن کے لیے تمام بوجھوں اور بندھنوں پر "چھڈیار" کہہ کر باہر نکل جایا کریں، اور چھڈیار منائیں۔ چھڈیار کے بنیادی قوانین بظاہر بڑے آسان ہیں۔ پر ہیں بے حد مشکل :

۱۔ کہ ہر سال دس بارہ دنوں کے لیے چھڈیار منانا لازم ہو گا۔

۲۔ کہ باہر جاتے وقت اپنے اپنے سیانے معزز عہدے دار کو گھر چھوڑ کر جانا ضروری ہے۔

۳۔ کہ باہر جانے سے پہلے ہر کوئی اپنے اندر کے دم بخت مظلوم بچے کو باہر نکالے گا۔
اس کا منھ دھوئے گا، چومے گا، پچکارے گا، پھر کندھے پر بٹھا کر ساتھ لے جائے گا۔
۴۔ کہ اس آؤٹنگ کے دوران کوئی رکن عقل کی بات کرنے کی کوشش نہیں کرے گا،
اور نہ دوسروں کو عقل سکھانے کی عیاشی کا سزاوار ہوگا۔ البتہ بحث کرنے پر کوئی
پابندی نہیں، کیونکہ بحث ایک معصوم اور بے ضرر وقت کٹی ہے۔ بحث سے کبھی کوئی
قائل نہیں ہوا۔ بحث نے کبھی کسی کا کچھ نہیں بگاڑا۔

چھڈ یار کے سات بنیادی رکن ہیں۔ سب سے پہلے لیڈر ہے، جس کی جملہ خوبیوں کی وجہ سے اُسے متفقہ طور پر لاالف لیڈر منتخب کیا گیا۔ پہلی خوبی یہ ہے کہ وہ سیانف اور معتبری کے بوجھ سے ہمیشہ کے لیے ازلی طور پر آزاد ہے۔ اس کے اندر کا بچہ ہر وقت اس کے کندھے پر سوار رہتا ہے۔ پہاڑوں پر پہنچ کر اس کے اندر کا شرپا بیدار ہو جاتا ہے۔ پھر اس کا جی چاہتا ہے کہ کسی ہلیری کو کندھوں پر اٹھا کر چوٹی پر گاڑ سکے، جس طرح ہمارے تمام شرپے کیا کرتے ہیں۔ لیڈر کا صرف ایک مطالبہ ہے کہ اسے چودھری کہہ کر بلایا جائے۔ مطالبہ صرف کہہ کر بلانے کا ہے، سمجھنے کا نہیں۔ پکارنے کے بعد چاہے آپ اُسے اپنے کام میں لگائے رکھیں۔ وہ سودا لائے گا، آپ کے لیے کھانا پکائے گا، برتن دھوئے گا، چائے پکائے گا، اور ضرورت پڑے تو آپ کے پاؤں دبائے گا۔ لیکن خبردار! اسے مسلسل چودھری جی کہنا ضروری ہوگا ورنہ نتائج کی ذمّے داری خود آپ پر ہوگی۔ اس لحاظ سے لیڈر کی حیثیت خالص مرد جیسی ہے۔

ہمارا دوسرا رکن شاعر ہے۔ شاعر کا زاویۂ نگاہ سائنسی ہے۔ نثر نگار کی طرح سوچتا ہے۔ غیر شاعرانہ طبیعت کا مالک ہے، لیکن شعر کہتا ہے۔ اچھے اور پُر معنی شعر۔ شاعر کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اُس نے دفتر کو مندر کا رُتبہ دے رکھا ہے۔ شاعر کے اندر کا بچہ طویل دفتری تپسیا کے باوجود ابھی تک زندہ ہے۔ اُس کی ذمّے داری شاعر پر نہیں، بچے پر ہے۔ وہ اس قدر جاندار تھا کہ کوشش کے باوجود نہیں مر سکا۔

ہمارا تیسرا رکن وٹ ہے ۔۔۔ اللہ نہ کرے کہ آپ کو اس کے ماتحت کام کرنا پڑے۔ اگر وہ آپ کا ماتحت بن جائے تو یہ آپ کی خوش قسمتی ہو گی۔ حاکم کی حیثیت سے وہ مسلسل تیوری ہے۔ خاوند کی حیثیت سے چُون و چرا ہے۔ لیکن ساتھی کی حیثیت سے باغ و بہار شخصیت ہے۔ مسلسل مفرح مسکراہٹ، خدمت گار۔ مٹھاس کا ایسا مرتبان جس سے پھوار اُڑتی رہتی ہے۔ مزاح اور حاضر جوابی کی بنا پر اُسے اعلیٰ درجے کا مزاح نگار ہونا چاہیے تھا۔ کیوں مُنھ زبانی رہ گیا، یہ بھید آج تک نہیں کھُلا۔ بہرطور اُس کی اس خصوصیت کی وجہ سے ہم نے اُس کا نام وٹ رکھ دیا ہے۔

ہمارا چوتھا رکن داستان گو ہے ۔۔۔ داستان گو بڑا گُنی آدمی ہے۔ بڑا معروف، جانا پہچانا۔ مگر طبیعت کا بڑا ہمن ہے۔ ذات پات کا بڑا قائل اُونچا بیٹھ کر بات کرتا ہے۔ لیکن بات کا دھنی ہے ۔۔ باتوں کا ایسا جال پھیلاتا ہے کہ سُننے والوں میں خود اسیر ہونے کی خواہش چٹکیاں لینے لگتی ہے۔ ذات کا پٹھان ہے۔ اندر سے خالص اور اُوپر سے "کاٹھا"۔

ہمارا پانچواں رُکن انجینئر ہے ۔۔۔ انجینئر تضادات کی کھچڑی ہے۔ ایک پلّو میں ایمان بندھا ہے، دُوسرے میں کُفر۔ ایک جیب میں فنون کا شوق، دوسری میں مشینوں کی پرستاری۔ اعمال کٹر مسلمان کے۔ خیالات کٹر مادہ پرست کے۔ کندھے پہ تصوّف کا چولا۔ ماتھے پر جدّت کا ٹیکا۔

ہمارا چھٹا رکن فوک لوریا ہے، جو اعزازی طور پر ڈرائیور کا کام کرتا ہے۔ اسے مناظر سے دلچسپی نہیں، لوگوں سے ہے۔ لوگوں سے بھی نہیں، ان کی رہت بہت سے ہے۔ وہ ایک ایسا بادام ہے جس میں دو مغز ہیں۔ ایک صوفی فلاسفر ہے۔ دُوسرا شُدھ انگریز۔ جب وہ ایوولیوشن (ارتقا) کی بات چھیڑ دے تو پھر آپ کا اللہ حافظ ہے۔ اور وہ ہمیشہ تاک میں بیٹھا رہتا ہے کہ کب موقع ملے اور ایوولیوشن کی بات چھیڑے۔

آخر میں مَیں ہوں ۔۔۔ میں جو "میں میں" کے سوا کچھ بھی نہیں۔

مئی ، ۱۹۷۷ء میں چھڈ یار کا اتفاقیہ اکٹھ ہوا۔ ان دنوں سیاسی صورتِ حال سخت پریشان کن تھی۔ ہم سب سیاست میں کورے ہیں۔ سیاست کو بالکل نہیں سمجھتے۔ لیکن سمجھتے ہیں کہ خوب سمجھتے ہیں۔ لہٰذا سیاست پر بات کرنا ہمارے لیے بہت بڑی عیاشی ہے۔

ہمارا دوسرا وصف یہ ہے کہ ہم میں سے کسی کو کسی اِزم سے وابستگی نہیں۔ ہم سب کو ایک فکر دامن گیر رہتا ہے کہ امن و امان قائم رہے۔ اگر ہمیں یہ یقین دلایا جائے کہ امنِ عامّہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا تو سیاسی لڑائیاں، جھگڑے، فساد ہوتے ہیں تو بسم اللہ ہوں، ہم صورتِ حال پر کتابی بحثیں کر کے دل خوش کر لیتے ہیں۔

ان دنوں ملک کی سیاسی صورتِ حال بڑی پریشان کن تھی۔ سیاسی لیڈروں کے درمیان مذاکرات ہو رہے تھے۔ آپ جانتے ہیں کہ مذاکرات میں باتیں ہوتی ہیں "سب اچھا، سب اچھا" کی رپورٹیں ہوتی ہیں۔ نہ نتیجہ ہوتا ہے نہ فیصلہ۔

لوگ گھبرا کر سڑکوں پر نکل آئے تھے، کیونکہ کسی ستم ظریف نے قوم کو یاد دلایا تھا کہ ہمارا ایک نصب العین تھا۔ ایک منزل تھی۔ ایک سمت تھی۔ ایک رُخ تھا۔

اس روز سیاسی صورتِ حال پر ہماری بہت بحث ہوئی۔ اتنی بحث ہوئی کہ ایک نے اُکتا کر کہا "چھڈ یار۔"

دوسرا بولا "ہاں، چھڈ یار۔"

چھڈ یار کی یہ اتفاقیہ تحریک زور پکڑتی گئی حتیٰ کہ سب چلّانے لگے "چھڈ یار، چھڈ یار۔"

ایک بولا "خبردار! یہ فرار ہے۔"

دوسرا ہنسا "فرار سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں۔ آنکھیں بند کر لو اور خود کو محفوظ کر لو۔"

تیسرے نے کہا "خوش فہمی ایک دھوکا ہے۔"

چوتھے نے کہا "خوشی کیا ہے؟ خوش فہمی۔"

پانچویں نے کہا "چھڈ یار۔"

"چھڈ یار، چھڈ یار" چاروں طرف سے آوازیں آنے لگیں۔
یوں اتفاق رائے سے چھڈ یار کا فیصلہ ہو گیا۔

اب سوال یہ تھا کہ جائیں تو جائیں کہاں؟ یہ سوال بہت ٹیڑھا سوال ہے۔ جب بھی یہ سوال اُٹھتا ہے تو چھڈ یار کے ارکان مچھلی منڈی کھول کر بیٹھ جاتے ہیں۔ تُو تُو مَیں مَیں ہوتی ہے۔ ہمکا تمکا ہوتا ہے۔ جوتم پیزار ہوتی ہے منھ زبانی۔ در اصل اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم سب دانشور ہیں۔ وہ بھی اعلیٰ درجے کے۔ اس لیے آج تک ہم کسی بات پر متفق نہیں ہو سکے۔

ہمارا لیڈر پہاڑوں کے حق میں ہے۔ وہ پہاڑوں میں پیدا ہوا۔ وہیں پل کر جوان ہوا۔ اس میں سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ وہ پہاڑ پر یوں چڑھ جاتا ہے جیسے بکری۔ اس کی سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ اپنی اس عظیم صلاحیت کی نمائش کرے۔ نمائش تبھی ہو سکتی ہے جب ناظرین موجود ہوں۔ چھڈ یار اسے صرف اس لیے محبوب ہے کہ اس کے لیے ناظرین مہیا کرتا ہے۔ لیکن اس کے لیے پہاڑ پر جانا از بس ضروری ہے۔ اس لیے وہ پہاڑوں پر جانے کے حق میں ہے۔ کہتا ہے، ایک نک سے پہاڑ نکال دو تو وہ کوفت بن جاتی ہے۔ لہٰذا میدانی علاقے میں چلنا بے معنی ہے۔

لوک رسیا سیاحت کا دیوانہ ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ پہاڑ پتھر ہیں۔ پتھروں سے کیا دل چسپی۔ اصل چیز تو لوگ ہیں۔ لوگوں کو دیکھو۔ ان سے باتیں کرو۔ انھیں سمجھو۔ انجینئر بہت گھوما پھرا آدمی ہے۔ اس نے پاکستان کے دُور دراز علاقوں کو دیکھا ہے۔ وہ سب تفصیلات جانتا ہے۔ لہٰذا ہر بات کے بیچ بول اُٹھتا ہے: اِدھر جاؤ گے تو یہ ہو گا۔ اُدھر جاؤ گے تو وہ ہو گا۔

لیڈر کو اس بات پر غصہ آتا ہے کہ وہ کیوں جانتا ہے۔ بات بھی ٹھیک ہے۔ جاننے کا حق صرف لیڈر کو حاصل ہے۔ اگر وہ نہیں جانتا تو بھی جانتا ہے۔ کیونکہ لیڈر ہے۔
لوک رسیا کہتا ہے "چلو، صحرا میں چلو۔ صحرا کی کیا بات ہے۔ وہاں ایک عجیب عالم

ہوتا ہے۔ صبح ہوتی ہے، شام ہوتی ہے۔ کیا صبح ہوتی ہے! کیا شام ہوتی ہے! سبحان اللہ!"

"خاک ہوتی ہے" لیڈر غراتا ہے "دھول اُڑتی ہے۔"

شاعر کے پاس ایک ایٹم قسم کا قہقہہ ہے۔ ایٹم بم مدت اور ہوا کے تھپیڑے مارتا ہے۔ شاعر کا قہقہہ آواز اور تمسخر کے تھپیڑے سے مارتا ہے۔ شاعر جسے قتل کرنا چاہے، اس پر قہقہے کا بم چلا دیتا ہے۔ پھر مصیبت یہ ہے کہ طبعاً وہ طرف دار نہیں۔ لہٰذا کبھی اس کو مارا کبھی اُس کو۔ کوئی یہاں گرا، کوئی وہاں گرا۔ اس کی خوشی صرف اس بات پر ہے کہ محفل میں لاشے نظر آئیں۔

داستان گو تماشہ بینی کا رسیا ہے۔ لوگ جھگڑیں تو اُسے خوشی ہوتی ہے۔ اس لیے وہ جھگڑا نمٹانے کے بجائے اسے ہوا دیتا ہے۔

وہ جھگڑے میں پھول پتیاں سجاتا رہتا ہے اور یوں ریلیف مہیا کرتا ہے۔ مقصد یہ نہیں کہ قہقہہ لگے اور جھگڑا ختم ہو، بلکہ یہ کہ پارٹیاں تازہ دم ہو کر جھگڑیں۔

رہا میں، تو آپ سے کیا پردہ۔ مجھے ان لوگوں پر بہت غصہ آتا ہے جو دوسروں کے جھگڑوں میں ملوث ہونے سے ہچکچاتے ہیں۔

خیر صاحب، اس بات پر ہمارا بہت جھگڑا ہوا کہ جائیں تو جائیں کہاں؟

ایک نے کہا "نیلم وادی میں جائیں۔"

دوسرے نے کہا "اتنا وقت نہیں۔"

تیسرے نے کہا "بابوسر چلیں"۔

چوتھا بولا "راستہ کھلا نہیں۔"

پانچواں بولا "چولستان سہی۔"

چھٹا بولا "وہاں لیڈر نہیں جائے گا۔ کیونکہ لیڈر صرف وہاں جانا پسند کرتا ہے جہاں ساگ ہو۔"

یہ ساگ کیا چیز ہے؟ اس کی مجھے آج تک سمجھ نہیں آئی۔ چھڑیار میں ساگ بہت

اہم ہے۔ بات بات پر ساگ کی بات کرنا بے حد ضروری ہے۔ بات کریں، ضرور کریں، بار بار کریں۔ لیکن اس کی وضاحت کرنے کی اجازت نہیں۔ ہر رُکن کو اختیار حاصل ہے کہ ساگ کو جو چاہے سمجھے۔

ایک رُکن بولا "اب کی بار کافرستان چلو۔"

دوسرا بولا "وہاں جانے کا تب مزا ہے جب جشن کے دن ہوں۔"

تیسرا بولا "یہ سب باتیں چھڈیار کی سپرٹ کے منافی ہیں۔ مقصد چھڈیار ہے۔ کوئی مقام نہیں، منزل نہیں، جگہ نہیں، قیام نہیں۔ کسی ایسی سمت چل دو جہاں چھڈیار کی جنّت ہو۔ کوئی خبر نہ ملے۔ نہ ملک کی نہ سیاست کی، نہ ہیراپھیری کی، نہ گھر کی، نہ دفتر کی۔"

"شاہراہِ ریشم" ایک چلّایا۔

پچھلے سال ہمارے دو ارکان کو شاہراہِ ریشم پر جانے کا اتّفاق ہُوا تھا۔ پنڈی سے تھاکوٹ تک، ۱۳۱ میل لمبی سڑک پر، ریشم ہی ریشم بچھا ہوا تھا۔ ہزارہ کے پہاڑوں کے بیچوں بیچ ریشم کا اتنا چوڑا تھان بچھا دیکھ کر حیرت سے آنکھیں اُبل آئیں، اور اُبل کر سڑک پر مرگوز ہوگئیں۔ پھر نہ پہاڑ رہے، نہ سبزہ زار رہے، نہ وادیاں، نہ چوٹیاں، نہ ساگ، نہ پات۔ ساری کائنات ریشمی سڑک کی اوٹ میں آگئی۔ سب کچھ معدوم ہو گیا۔ صرف سڑک ہی سڑک رہ گئی۔

"میں نہیں مانتا" لوک چلّایا "کہ ایسی سڑک بھی ہو سکتی ہے جو سر اُٹھا کر دیکھنے نہ دے۔"

"ہو سکتی ہے۔ ہے۔ ہے۔"

"کیا پاکستان میں ہے، وہ سڑک؟"

"ہاں پاکستان میں۔"

شاعر کا قہقہہ گونجا "چھڈیار۔"

پھر وہی ہُوا جو اِن حالات میں ہوتا ہے۔ یعنی شرط بد گئی۔ آپ جانتے ہیں کہ شرط تو صرف بدا کرتی ہے۔ پوری کرنے کا سوال کبھی پیدا ہی نہیں ہُوا۔ البتّہ شرط بدنے کا ایک

فائدہ ضرور ہُوا کہ شاہراہِ ریشم پر جانے کا فیصلہ پختہ ہو گیا۔

فیصلے کے بعد دُوسرا مرحلہ تیاری کا ہوتا ہے۔ تیاری کے دو پہلو ہوتے ہیں: ایک سامان تیار کرنا، دُوسرا خود کو تیار کرنا۔ اگر آپ پک نک پر جائیں تو سامان تیار کرنا بے حد اہم ہوتا ہے، اور خود کو تیار کرنا قطعی اہم نہیں ہوتا۔ چھڈ یار کے تحت سامان تیار کرنا قطعی اہم نہیں ہوتا۔ خود کو تیار کرنا بے حد اہم اور دشوار ہوتا ہے۔ چونکہ چھڈ یار کے منشور کی دوسری شق کے مطابق ہر رُکن پر لازم ہوتا ہے کہ وہ اپنے بوجھ اور اپنی اپنی گٹھڑیاں گھر چھوڑ کر جائے۔ اگر آپ اپنے عہدے کی گٹھڑی، معتبری کی گٹھڑیاں، اپنی مَیں کی گٹھڑی گھر چھوڑ دیں تو پھر سفر میں ہلکے پھلکے رہتے ہیں۔ جو ملا، کھا لیا۔ جہاں رات پڑ گئی، پڑ کر سو گئے۔ مُنہ دھویا نہ دھویا۔ بال بنائے نہ بنائے۔ کپڑے بدلے نہ بدلے۔ بلکہ بہتر ہے کہ نہ بدلے۔ ڈھول میں بیٹھ گئے۔ سڑک پر لیٹ کر سو گئے۔ جب مَیں نہ رہے تو سامان اہم نہیں رہتا۔ لیکن مَیں کو خود سے اُتار پھینکنا مشکل ہے۔

چھڈ یار کا مطالبہ ہے کہ بے سروسامانی میں سفر کرو۔ سامان سر پر اُٹھا کر بسوں کے پیچھے بھاگو۔ سواریوں میں ٹھس ٹھسا کر بیٹھو۔ ریسٹ ہاؤس ریزرو نہ کراؤ۔ بلکہ جا کر چوکیدار کی منتیں کرو۔ اُسے بخشیش کا لالچ دو۔ وہ نہ کر دے تو از سر نو تازہ دم ہو کر منتیں کرو۔ پھر بھی نہ مانے تو ٹلو نہیں، وہیں بیٹھے رہو اور یتیموں کی طرح اس کی طرف دیکھتے رہو۔ سفر کے دوران بازاروں اور سڑکوں پر چلتے ہُوئے عوامی چیزیں کھاؤ۔ مثلاً چنے چباؤ، گنڈیاں چوسو، گنے کا ٹکڑا مل جائے تو سبحان اللہ۔ پکوڑے کھاؤ تاکہ دیکھنے والے تمھیں خواص نہ سمجھیں، اور تمھارے اندر کا عہدیدار یا دانش ور سر نہ اُٹھائے۔ مگر اب کی بار شاہراہِ ریشم جاتے وقت ہم سے ایک بھُول ہو گئی۔

لیڈر نے کہا "بھئی، بسوں کا کیا ہو گا؟"

شاعر بولا "وہی جو ہوتا ہے۔ یعنی بسیں چلیں گی۔ بسوں کی یہی بُری عادت ہے کہ چلتی رہتی ہیں۔"

"مگر پہنچتی نہیں" وٹ نے لقمہ دیا۔

انجینئر نے کہا "یہاں سے ایبٹ آباد، ایبٹ آباد سے مانسہرہ تو عام ملیں گی۔ مانسہرہ سے بھشام کی بھی مل ہی جائیں گی۔ لیکن بھشام سے چلاس تک کا پتا نہیں۔ چلاس سے گلگت تک ضرور ملے گی۔ گلگت سے ہنزہ بھی ملے گی۔ ہنزہ سے خنجراب کا پتا نہیں۔"

"پتا نہیں، پتا نہیں" لیڈر نے قہقہہ لگایا "کچھ پتا بھی ہے تجھے؟"

"ٹھیک تو ہے" وٹ بولا "جب سڑک پر ریشم بچھا ہے تو بس نہ ملنے کا مطلب؟"

"بھئی، بس ریشم نہیں دیکھتی۔ سواری ڈھونڈتی ہے۔ سواری ہو گی تو چلے گی" انجینئر بولا۔

"بھئی، سواریاں ہم جو ہیں" وٹ نے کہا۔

"بالکل ہیں" شاعر نے قہقہہ لگایا۔

"بھئی، بس کے لیے وہ سواری نہیں ہوتی جو اندر بیٹھی ہو۔ وہ ہوتی ہے جو باہر لٹکے" داستان گو نے کہا۔

"یہ بھی ٹھیک ہے" وٹ بولا "ہم تو اندر بیٹھیں گے۔ باہر کون لٹکے گا؟"

"باہر لیڈر کو لٹکا دیں گے" شاعر نے قہقہہ لگایا۔

"پھر تو ٹھیک ہے" انجینئر نے کہا۔

"ساتھ ساگ پات بھی دیکھتا جائے گا" داستان گو بولا۔

"میں بتاؤں" لوک نے کہا "مانگے کی جیپ میں کیوں نہ چلیں"

"وہ کہاں سے آئے گی؟" لیڈر نے پوچھا۔

"یہ بات مجھ پر چھوڑ دو" لوک نے جواب دیا۔

"ارے!" سب خوشی سے چلا اٹھے۔

"لیکن پہاڑوں پر ڈرائیونگ کون کرے گا؟" انجینئر نے طنزاً ہاتھ چلایا۔

"میں کروں گا" لوک بولا۔

اس چھت پھاڑ قسم کی آفر پر سب بوکھلا گئے۔ یہ ہماری سب سے پہلی اور فاحش غلطی تھی۔ ایک ایسی حماقت جس کا خمیازہ سب کو بھگتنا پڑا۔ بظاہر تو یہ خالص خوش قسمتی تھی۔ کون نہیں چاہتا کہ سفر پر اپنی گاڑی ہو، اپنا ڈرائیور ہو۔ جہاں چاہا رُک گئے۔ جہاں تک چاہا، رُکے رہے۔ جب چاہا، چل پڑے۔ اس خوش بختی کا سب سے بڑا اثر تو یہ ہوا کہ ہم سب ٹانگ پہ ٹانگ چڑھا کر، گردن اکڑا کر، مونچھ مروڑ کر جیپ میں بیٹھ گئے۔ معزز عہدے دار، جسے ہم سب بصد مشکل شانوں سے اُتار کر گھر چھوڑ آئے تھے، ہمیں اپنی جیپ میں سوار ہوتے دیکھ کر لپک کر پھر سے کندھوں پر آ چڑھا۔ جیپ میں سوار ہونے سے پہلے لیڈر غرّایا "بلاڈر! پہلے جائزہ لو کوئی چیز رہ تو نہیں گئی۔"

لوک آگے بڑھا اور بولا "لیڈر، سر! آپ کو علم ہونا چاہیے کہ جیپ سفر کے لیے کیل کانٹے سے لیس ہے۔ ہمارے پاس کیا نہیں۔ سب کچھ ہے۔ ہمارے پاس دو خیمے ہیں۔"

"خیمے!" سب چلائے۔

"ہاں، خیمے" لوک کے اندر کا انگریز باہر نکل آیا "یہ خیمے آپ ہر جگہ لگا سکتے ہیں۔ پہاڑ پر، دریا کے کنارے، ریت پر، جنگل میں، کہیں بھی۔" اس نے سیلز مین کی طرح دو لپٹی ہوئی چھتریاں باہر نکالیں اور فخر سے بولا "دیکھیے حضرات، یہ کتنی کم جگہ گھیرتے ہیں۔"

"یار، یہ چھتریاں تو رنگ دار بھی ہیں" ڈٹ بولا۔

"چھتریاں نہیں، خیمے" لوک نے کہا "خیمے سمجھتے ہو؟"

"یہ رنگ دار خیمے تو ہنی مون خیمے لگتے ہیں" انجینئر بولا۔

"تو پھر اپنی اپنی بیویاں ساتھ لے چلیں" شاعر نے قہقہہ مارا۔

"لاحول ولا۔ چھڈ یار میں بیویاں ساتھ لے جاؤں" لوک ہنسا۔

"اور کیا کیا اکوپمنٹ ہیں، اس جیپ میں؟" ڈٹ نے لوک سے پوچھا۔

"ہر قسم کی اکوپمنٹ۔ اوزار، ٹیپ ریکارڈر، مائیکروفون، کیمرا، دُوربین اور پٹرول کے بھرے ہُوئے کین۔"

"یار، ہم کیا پروفیشنل ٹور پر جارہے ہیں؟" انجینئر چلّایا۔

"بھئی، کوئی کھانے کی چیز بھی ہے؟" وٹ نے پوچھا "کہ اکوپمنٹ پر ہی گزارہ ہوگا؟"

"اس کی کیا ضرورت ہے؟ شاہراہِ ریشم پر تو ہوٹل ہی ہوٹل ہوں گے۔"

"پھر بھی ایمرجنسی کے لیے ہم نے دو درجن تا فتانے لے لیے ہیں۔"

"وہ کیا ہوتے ہیں؟"

"میدے میں انڈا گھی ڈالو اور تندور میں روٹیاں لگالو۔"

"دیکھو، بوائیز" لیڈر چلّایا "میں لیڈر ہوں۔ میں تمھاری ہر ضرورت کا ذمّے دار ہوں۔ راستے میں عیش کراؤں گا۔ پراٹھے اور بُھنا گوشت کھلاؤں گا۔ چائے کانی جب طلب کرو۔"

"اور ساگ پات؟"

"بکو نہیں" لیڈر غصّے میں آگیا "لوک رسیا، تم ڈائیور رہو۔ آن یور سیٹ۔ بوائیز! گٹ اِن اینڈ دی گو۔"

سب سے پہلا مرحلہ ائیرپورٹ پر جاکر داستان گو کو ریسیو کرنا تھا، اور وہاں سے آن دی روڈ۔

ائیرپورٹ پر داستان گو ایک بڑی سی بوری اُٹھائے ہُوئے برآمد ہُوا۔

"ارے!" سب چلّائے "اتنی بڑی بوری!"

"خان، کیا راستے میں اخروٹوں کا کاروبار کروگے، جو بوری بھر کر لے آئے ہو؟"

"احمقو!" داستان گو بولا "یہ بوری نہیں، ہیورسیک ہے۔"

"ہیورسیک!" سب چلّائے۔

"تمھیں پک نک پر جانے کا سلیقہ ہو تو معلوم ہو کہ ہیورسیک کے بغیر پک نک پر

جانا ممکن نہیں۔"

"ارے ادھر ہم کیسے جا رہے ہیں؟" وٹ بولا۔

"گھبراؤ نہیں" ڈرائیور نے آنکھیں چمکائیں "ہمارے پاس سات سلیپنگ بیگ ہیں۔"

"یک نہ شد دو شد" انجینئر ہنسا۔

"چھڈ یار" شاعر نے قہقہہ لگایا۔

"اچھا، چھڈ یار ہے یہ" لیڈر ہنسا "کہ ساتھ خیمے ہیں، سلیپنگ بیگ ہیں ہیورسیک ہے۔"

"برخوردار، پہلے سیاح بننا سیکھو، پھر بات کرو" داستان گو نے دبی زبان سے کہا۔

"سائیلنس پلیز!" ڈرائیور نے اعلان کیا "دی آر آن دی روڈ"۔ اور جیپ چل پڑی۔

ٹھاکوٹ

جیپ چلانے سے پہلے ڈرائیور نے اعلان کیا "ہمارا پہلا پڑاؤ اہل ریسٹ ہاؤس ہے۔ وقت کم ہے، فاصلہ زیادہ۔ لہٰذا گاڑی راستے میں کہیں نہیں رُکے گی۔"

"ارے!" وٹ بولا "یہ ڈرائیور تو لیڈر بن بیٹھا۔ حکم صادر کر رہا ہے۔"

"بوائز!" لیڈر نے غصے میں کہا "گاڑی روکنا یا چلانا میرا کام ہے۔ میں لیڈر ہوں۔"

"لیکن رات پڑنے سے پہلے گاڑی کو اہل ریسٹ ہاؤس تک پہنچانا میرا کام ہے" ڈرائیور بولا۔

"یار، یہ تو میدانی علاقہ ہے" شاعر نے کہا "تم تو پہاڑی علاقے کے لیڈر ہو۔ جب پہاڑ پر پہنچیں گے تو بے شک تمہارا حکم چلے گا۔ فی الحال جو وہ کہتا ہے اُسے کہنے دو۔"

گاڑی ایبٹ آباد کے بازار میں پہنچی تو سب نے شور مچا دیا "روکو، روکو۔"

"معقول وجہ کے بغیر گاڑی نہیں رُکے گی" ڈرائیور بولا۔

"لیڈر، میں نے پہلے ہی تجھ سے کہا تھا" وٹ چلایا "کہ مانگے کی گاڑی میں دھیلا اپنی لیڈری کھو بیٹھو گے۔"

"روکو، روکو" سب نے شور مچا دیا۔

"میں حکم دیتا ہوں کہ گاڑی روکو" لیڈر غرّایا۔

"بھئی، بھُنے گوشت کی خوشبو آ رہی ہے" شاعر بولا۔

"یہ ڈرائیور کیسا مسلمان ہے لیڈر، جو بھُنے گوشت کی خوشبو پر بھی نہیں رُکتا؟" وٹ نے کہا۔

"رُک جاؤ، رُک جاؤ" لیڈر غرّایا "ہمیں یہاں سے ایک کیتلی خریدنی ہے۔"

"بالکل ٹھیک۔ ہاں بھئی، گوشت کی خوشبو پر رُکنا لازم ہے، بشرطیکہ کیتلی خریدنے کا بہانہ موجود ہو" شاعر ہنسا۔

جیپ رُک گئی۔ سامنے اوپن ائیر ہوٹل میں سیخوں پر تکے بھُونے جا رہے تھے۔

"ہم یہاں بیٹھ کر تکے کھاتے ہیں۔ لیڈر بازار جا کر کیتلی خرید لائے" انجینئر نے کہا۔

"بالکل ٹھیک" شاعر نے قہقہہ لگایا "جس کا کام اسی کو ساجھے۔"

"لیکن تم نے کیتلی کس لیے خریدنی ہے؟" داستان گو نے پُوچھا۔

"راستے میں چائے بنانے کے لیے" لیڈر بولا۔

"چائے بنانے کے لیے کیتلی نہیں، تام لوٹ خریدنا چاہیے" داستان گو نے کہا۔

"تام لوٹ؟" سب نے حیرت سے دُہرایا "وہ کیا ہوتا ہے؟"

"کیتلی صرف چائے بنانے کے کام آتی ہے" داستان گو بولا "تام لوٹ میں چائے بنا لو، دُودھ گرم کر لو، شیو کر لو، کنوئیں سے پانی نکال لو، ہنڈیا پکا لو۔"

"اور گورنر کے نام لو لیٹر بھیج دو" وٹ نے لُقمہ دیا۔

"ہاں، ہاں۔ وہ بھی ہو سکتا ہے" داستان گو چلّایا۔

"ہٹاؤ یار، اس جھگڑے کو۔ جو خریدنا ہے، خرید لو۔ ہم یہاں بیٹھ کر تمہارا انتظار کریں گے" انجینئر نے کہا۔

جب لیڈر اور داستان گو تام لوٹ خرید کر بازار سے لوٹے تو شاعر نے قہقہہ لگایا "یہ تام لوٹ ہے کیا؟ بھئی، یہ تو ڈول ہے ڈول۔"

"جس بات کی سمجھ نہ ہو، اس میں دخل نہیں دیا کرتے" داستان گو بولا۔

"بالکل درست" انجینئر نے کہا "پہلے تام لوٹ اور ڈول میں تمیز کرنا سیکھو۔ پھر بات کرو۔"

"تمھیں اتنا بھی پتا نہیں" ڈرائیور بولا" کہ ڈول تو بڑا ہوتا ہے۔"
"بھئی، یہ تو شاعر ہے۔ اسے کیا پتا کہ بڑا کیا ہوتا ہے، چھوٹا کیا ہوتا ہے" انجینئر ہنسا۔
تکّے کھانے کے بعد ہم ایبٹ آباد سے روانہ ہو گئے۔ مانسہرہ کے بعد دفعتاً لیڈر چلّایا "روکو، روکو۔"
"کیوں؟ وجہ؟" ڈرائیور نے پوچھا۔
"یہ بفہ ہے" لیڈر نے کہا۔
"بفہ کیا ہوتا ہے؟"
"اس گاؤں کا نام ہے۔"
"چلو، مان لیا کہ یہ بفہ ہے" ڈرائیور بولا "پھر؟"
"یار، یہ ہمارے ایک بہت بڑے سیاسی لیڈر کا گاؤں ہے۔ اس لیے رُکنا ضروری ہے" انجینئر طنزاً ہنسا۔
"ہمارے سیاسی لیڈروں کا سب سے بڑا گاؤں تو اسلام آباد ہے۔ وہیں رُکے رہتے۔ اِدھر آنے کی تکلیف کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟" شاعر نے کہا۔
"ارے نہیں" لیڈر غرّایا "بفہ کا کھویا بہت مشہور ہے۔ بالکل خالص ہوتا ہے۔"
"میں نہیں مانتا" شاعر بولا "کہ سیاسی لیڈر کے گاؤں کا کھویا خالص ہو۔"
"ہو ہی نہیں سکتا" وٹ بولا۔
"بھئی، ہے، ہے، ہے" لیڈر نے سنجیدگی سے کہا۔
"ہو گا" ڈرائیور نے گاڑی تیز کر دی۔
ٹھہرو، ٹھہرو۔ پہلے فیصلہ کرو کہ لیڈر کون ہے" لیڈر چلّایا۔
"ہاں بھئی، یہ ٹھیک ہے۔ یہ ڈرائیور تو لیڈر بن بیٹھا ہے۔"
"بالکل نہیں" ڈرائیور بولا "میں تو ڈرائیور ہوں۔"

"اور میں کنڈکٹر ہوں" لیڈر نے کہا "کنڈکٹر کا کام جانتے ہو؟"

"کنڈکٹر کا کام تو سواریوں سے لڑنا جھگڑنا ہوتا ہے، اور ڈرائیور کا گاڑی چلانا" شاعر نے کہا۔

"نہیں، نہیں" لیڈر بولا "یہ گاڑی میرے کہنے پر چلے گی۔ میرے کہنے پر رُکے گی۔"

گاڑی رُک گئی۔ لیڈر نے چھلانگ لگائی اور گاؤں کی گلیوں میں غائب ہو گیا۔ جب وہ لوٹا تو اس کے ہاتھ میں کاغذ کا ایک بڑا سا دونا تھا، جس میں بھورے رنگ کی کوئی چیز تھی۔

"ارے! یہ تو لیٹی نظر آتی ہے۔ چھلک رہی ہے" ڈٹ بولا۔

"ایسا کھویا تو ہم نے کبھی نہیں دیکھا۔"

"ہاں یار، کھویا تو قائم ہوتا ہے۔ ٹھوس ہوتا ہے۔"

"بھئی، یہ سیاسی کھویا ہے۔ قائم کیسے ہو؟ یہ تو چھلکے گا۔"

دفعتہً انجینئر چلایا "لو ہم شاہراہِ ریشم پر چڑھ گئے۔" سب کی توجہ سڑک پر مرکوز ہو گئی۔ دیر تک خاموشی طاری رہی۔

"یہ سڑک تو بھئی، ریشمی نہیں مخملی ہے" ڈرائیور بولا "گاڑی کہتی ہے، مجھے چھوڑ دو، روکو نہیں۔"

"میں نے کہا نہ تھا" لیڈر چلایا۔

"یار، اتنی چوڑی سڑک!" شاعر بولا۔

"مال روڈ لگتی ہے۔"

"اُونہوں۔ مال روڈ کی اماں کہو۔"

اِرد گرد پہاڑیاں ہی پہاڑیاں تھیں جن میں ہریالی کے کارپٹ بچھے ہوئے تھے، اور نیچے وہ مخملی سڑک تھی۔ اتنی چوڑی، اس قدر ہموار کہ یقین نہیں آ رہا تھا۔

"میں نے کہا نہ تھا" لیڈر چلایا "یہ سڑک کسی کو سر اُٹھا کر منظر کو دیکھنے نہیں دیتی۔"

"یار، میرے حُقّے کی چلم بھرنا" وٹ بولا۔

"اُونہوں۔ دیکھتے رہو۔ خواب دیکھتے رہو۔"

دیر تک جیپ میں خاموشی طاری رہی۔ سب سڑک کو دیکھ رہے تھے۔ جیپ کے پہیئے بھی خاموش ہو گئے تھے۔

"یہ تو جیپ پر بہت بڑا ظلم ہو گیا" ڈرائیور بولا "آٹھ روز اس سڑک پر چلنے کے بعد یہ واپس پنڈی کی سڑکوں پر کیسے چلے گی؟"

"تم کیوں چُپ ہو؟" لیڈر نے وٹ سے پُوچھا۔

"سڑک کو دیکھ کر اس کی وِٹ وٹ بن کر رہ گئی ہے" داستان گو نے دبی زبان سے کہا۔

"میں یہ سوچ رہا ہوں" وٹ بولا "کہ یہ سڑک کس نے بنائی ہے۔"

"یہ سڑک چین اور پاکستان کے اشتراک سے بنی ہے، مانسہرہ سے چینی سرحد خنجراب تک۔"

"وہ تو ٹھیک ہے" وٹ بولا "اشتراک تو ہے، لیکن بنائی تو پاکستانیوں نے ہے نا۔"

"پاکستانی کاریگر تو بہت ہیں۔ اس میں شک کیا ہے۔ لیکن انھوں نے ہماری ٹریڈیشن کو برباد کر دیا ہے۔"

"وہ کیسے؟"

"بھئی، شُدھ مسالا لگا دیا۔ سمجھ لو کہ ہماری ریت کا جنازہ نکل گیا۔"

"ہاں، کہتا تو ٹھیک ہے" لیڈر ہنسا۔

"اتنی چوڑی سڑک پہاڑوں پر بنا دینا، انسان کا نہیں، جنّوں کا کام ہے۔"

"یہ چینی جن ہی تو ہیں۔"

"جن تو بھئی، ہم بھی ہیں" داستان گو نے کہا "بس مفاد کی بی کے سر پر چڑھے ہوئے ہیں۔"

"وہ دیکھو" لیڈر چلّایا "وہ پہاڑی پر گاؤں۔"

"گاؤں پہاڑیوں پر ہی تو ہوتے ہیں۔"

"نہیں، نہیں" وہ بولا "دیکھو تو، ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے تبتی گاؤں ہو۔"

میں نے سر اُٹھا کر دیکھا۔ پہاڑ کے اُوپر گاؤں یوں بنا ہُوا تھا جیسے کوئی بڑا سا گھونڈا ہو۔ پہاڑی کے پیچھے سُورج غروب ہو رہا تھا۔ درختوں سے سُورج کی سُنہری شعاعیں چھن چھن کر پہاڑی کی چوٹی پر پڑ رہی تھیں۔ نیچے اندھیرے رینگ رہے تھے اور ان کے نیچے کالی مخمل کی سڑک بچھی ہُوئی تھی۔

سب خاموشی سے سڑک کو دیکھنے میں محو تھے۔ وقت تھم گیا۔ سڑک اُبھرتی گئی، اُبھرتی گئی، حتیٰ کہ کائنات پر چھا گئی۔

دفعتہً گاڑی سڑک چھوڑ کر پہاڑی کی طرف مڑ گئی۔ جیپ کی سواریاں ایک دُوسرے سے ٹکرائیں۔

"ارے! یہ کیا کیا، ڈرائیور؟" لیڈر غرایا۔

ایک اور دھچکا لگا۔ دُوسرا موڑ کاٹ کر جیپ رُک گئی۔

"لو، ہم اہل ریسٹ ہاؤس پہنچ گئے" ڈرائیور نے بے نیازی سے کہا۔

سامنے ہموار ٹیلے پر اہل ریسٹ ہاؤس تھا۔ سب گاڑی سے اُتر آئے۔ چوکیدار موجود نہ تھا۔ ریسٹ ہاؤس کے سامنے پختہ فرش کا چبوترا بنا ہُوا تھا، جسے مسجد کے طور پر کام میں لایا جاتا تھا۔ سب مسجد کے فرش پر بیٹھ گئے۔

"اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ چوکیدار سے کس طرح بات کی جائے؟" وٹ نے کہا۔

"ان پہاڑی لوگوں سے صرف ایک طریقے سے بات ہو سکتی ہے" لیڈر بولا "اسلامی طریقے سے۔ یہ لوگ پکّے مسلمان ہیں۔"

"بس یہی تو خطرہ ہے" وٹ بولا "اگر چوکیدار پکّا مسلمان نکلا تو بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔"

"کیا مطلب؟"

"بھئی، چونکہ ہمارے پاس پرمٹ نہیں لہٰذا وہ ہمیں جگہ نہیں دے گا۔ اور اگر ہم نے رقم پیش کی تو جوتے مار کر ہمیں یہاں سے نکال دے گا" وِٹ نے وضاحت کی۔

"ہاں بھئی، ٹھیک کہتا ہے۔ دُعا کرو وہ پکا مسلمان نہ ہو" داستان گو بولا۔

"یار، ہمارے ہاں اسلام نافذ ہو گیا تو" میں نے کہا "مشکل پڑ جائے گی"

"اسلام تو آ گیا بھئی، اب اسے کوئی روک نہیں سکتا" داستان گو بولا۔

"اونہوں" شاعر نے کہا "جب تک سیاست دان موجود ہیں، اسلام نہیں آئے گا"

"وہ کیوں، جناب؟"

"بھئی، اسلام سیاست دانوں کے مفاد میں نہیں" شاعر نے قہقہہ لگایا۔

"پھر انھوں نے نظامِ مصطفیٰ کا نعرہ کیوں لگایا ہے؟" انجینئر نے پوچھا۔

"انھوں نے نہیں لگایا، غلطی سے لگ گیا ہے" داستان گو ہنسا "جب قدرت کو منظور ہوتا ہے تو سیاست دان اپنے پاؤں پر خود کلہاڑی مار لیتے ہیں"

"ہٹاؤ یار۔ چوکیدار کی بات کرو" انجینئر بولا "اس وقت سب سے بڑی حقیقت چوکیدار ہے"

"چوکیدار سے بات کرنا مجھ پر چھوڑ دو" ڈرائیور نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"تم کیسے کرو گے، بات؟" لیڈر غرایا۔

"بیوروکریٹ کے انداز میں" ڈرائیور نے جواب دیا "جو طریقہ ہمارے ملک میں سال ہا سال سے رائج ہے۔ بیوروکریٹ بن کر بات کرو تو سب سمجھتے ہیں۔ گاؤں والے بھی، شہری بھی، دانش ور بھی"

"ہٹاؤ یار، بیوروکریٹ کو تو شہری نفرت کی نظر سے دیکھتے ہیں" انجینئر نے کہا۔

"بالکل، دیکھتے ہیں، نفرت کی نظر سے" ڈرائیور بولا "لیکن سرِ تسلیم خم بھی کر دیتے ہیں"

"بالکل ٹھیک۔ چونکہ سر تسلیم خم کرتے ہیں، پھر خود پر غصہ آنے لگتا ہے کہ ہیں نے ایسا کیوں کیا۔ خود سے نفرت تو کر نہیں کر سکتے، اس لیے بیوروکریٹ سے نفرت کرتے ہیں" داستان گو ہنسا۔

چوکیدار ایک ڈاڑھی والا جوان تھا۔ اس نے ہمارے لیے ریسٹ ہاؤس کھولنے سے صاف انکار کر دیا۔ اسلامی اور بیوروکریٹ دونوں طریقے فیل ہو گئے۔ پھر مُٹھی گرم طریقہ آزمایا گیا۔ اس کا بھی کوئی فائدہ نہ ہُوا۔ آخر میں باری باری ہر ایک نے اپنا اپنا طریقہ آزمایا۔ آخر سب ٹھنڈے ہو کر بیٹھ گئے۔

"چلو بھئی" ڈرائیور بولا "لگاؤ خیمے۔"

"خیموں کی کیا ضرورت ہے۔ بچھاؤ سلیپنگ بیگ۔" اور ہم جیپ سے سامان اُتارنے میں مصروف ہو گئے۔

کچھ دیر کے بعد وٹ بھاگا بھاگا آیا۔ زیرلبی انداز میں بولا "مار لیا میدان!"

سب چونکتے ہو گئے۔

"چوکیدار مان گیا کیا؟" شاعر نے پُوچھا۔

"اونہوں۔ مانا نہیں، لیکن ماننے کے واضح آثار پیدا ہو گئے ہیں۔"

"وہ کیسے؟"

"چوکیدار کا سسر اور بیوی آ گئے ہیں۔"

سب قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔

"یار، تم اتنے جاہل ہو" وٹ غصّے سے چلّایا "اتنی سی بات نہیں سمجھتے۔ وہ ایک بوڑھا آدمی ہے، جی حضوریا ہے، اور پیسے کی اہمیّت کو جانتا ہے۔ پھر چوکیدار کی بیوی بھی تو ساتھ آئی ہے۔ وہ مسلمان کو راہِ راست پر لے آئے گی۔ بیوی مسلمان کو ہمیشہ راہِ راست پر لاتی رہی ہے۔"

"تُو تو سیانا ہو گیا" داستان گو بولا۔

"دیکھ لو" وٹ ہنسا۔

"ابھی پتا چل جائے گا" لیڈر بولا۔

عین اس وقت ایک بوڑھا آدمی قریب آیا۔ بولا "السلام علیکم۔ صاحب جی، یہاں نہ لیٹیے۔ اِدھر سانپ ہوتے ہیں۔"

"تو پھر ہم برآمدے میں پڑ رہیں گے۔"

"نہیں" وہ بولا "صاحب، برآمدہ سونے کے لیے اچھی جگہ نہیں۔ آپ اندر ہی آجائیں۔" اس کے عقب میں چوکیدار ریسٹ ہاؤس کا تالا کھول رہا تھا۔ ریسٹ ہاؤس میں سامان رکھ کر ہم سب نے چھڑیاں سنبھالیں اور باہر سیر کو نکل گئے۔

چاند نکل آیا تھا۔ غالباً وہ چاند کی تیرھویں یا چودھویں رات تھی۔ چاندنی میں سڑک چمک رہی تھی۔ اِرد گرد پہاڑیاں اندھیرے میں لپٹی ہوئی تھیں۔

"یار، یہ ہزارہ کا علاقہ کتنا خوبصورت ہے" ڈرائیور نے کہا۔

"اور زرخیز بھی تو ہے" انجینئر بولا۔

"یہاں کے لوگ پکّے مسلمان ہیں" لیڈر نے کہا۔

"پکّے مسلمان وہیں ملتے ہیں جہاں سے شاہراہ دُور ہو" داستان گو بولا۔

"کیا مطلب ہے تمھارا؟" لیڈر نے پُوچھا۔

"بھئی، شاہ راہ آئی تو نئے شوشے آئے۔ اپنے اور لگتوں کی قدریں ختم ہوئیں۔"

"بالکل غلط" شاعر بولا "مری کو دیکھ لو۔ سالہاسال سے مری ایک تفریح گاہ ہے۔ کہتے ہیں کہ جہاں تفریح گاہ ہو گی وہاں مقامی لوگوں کے اخلاق تباہ ہو جائیں گے۔ عورتیں بکیں گی۔ مرد بھڑوے بن جائیں گے۔ لیکن مری نے یہ مفروضہ غلط ثابت کر دیا۔ آج تک مری کی کسی مقامی خاتون نے مال روڈ پہ قدم نہیں رکھا۔"

"یار، بات تو ٹھیک کہتا ہے، تُو" لیڈر بولا۔

"یاد رکھو، شاہراہ ہزاریوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی۔"

"اونہوں" ڈرائیور بولا "یہ شاہراہ مری جیسی تفریحی شاہراہ نہیں ہو گی۔ جب چین کی ڈیوہیکل بسیں ادھر چلیں گی تو ہزارے کی شکل بدل جائے گی۔"

"پھر تو یہاں کی مسلمانی بھی چند روزہ سمجھو" میں نے کہا۔

"مطلب یہ ہوا کہ شاہراہ سسر اور بیوی کا سا اثر رکھتی ہے۔ ریسٹ ہاؤس کا دروازہ کھلوا دیتی ہے" شاعر نے قہقہہ لگایا۔

"ذرا سوچو" ڈرائیور بولا "جب یہ شاہراہ حرکت میں آئے گی تو کیا ہو گا۔ ہزارہ کے یہ مزارع، جو آج مشکل سے دو وقت کی روٹی کماتے ہیں، خوش حال ہو جائیں گے۔ یہاں جگہ جگہ ہوٹل اور سٹور کھل جائیں گے۔ یہ باغات، جن کا میوہ منڈی تک نہیں پہنچ سکتا، کیش کراپ پیدا کریں گے۔"

"بالکل، بالکل" انجینئر بولا۔

"اور یہاں چہل پہل ہو جائے گی۔ اکنامک ایفلوانس" ڈرائیور نے دانش مندانہ انداز سے کہا۔

"ہاں" داستان گو بولا "یہاں وہی چہل پہل ہو جائے گی جو ہمارے شہروں میں ہے۔ لوگ مفاد کے چکر میں پڑ جائیں گے، اور تباہی کا وہی منظر یہاں بھی نظر آئے گا جس کے ہم شکار ہیں۔"

شاعر ہنسا "اسی کو ڈیویلپمنٹ کہتے ہیں۔ ترقی یا ڈیویلپمنٹ اسلام کو نچوڑ کر رکھ دیتی ہے۔ ایمان کو دھو کر صاف کر دیتی ہے۔ لگتوں کی گفتگو ہیچ نظر آنے لگتی ہے۔"

داستان گو نے ہاتھ اُٹھا کر کہا "یا اللہ! اِس اکنامک ایفلوانس سے محفوظ رکھ۔"

"آمین!" شاعر بولا۔

"لیکن" میں نے بات کرنی چاہی۔

"یہ لیکن اگر مگر چونکہ چنانچہ ہی تو تہذیب کے ستون ہیں" وٹ نے کہا۔

"چھڈ یار" شاعر نے قہقہہ مارا "ہم تو بھگوڑے ہیں۔ تہذیب، دانشوری اور سیاست سے بھاگے ہوئے۔ بڑی مشکل سے جان چھڑا کر آئے ہیں۔ اب ہمیں آٹھ دن تو جی لینے دو۔"

"جیو بھائی، جیو" لیڈر ہنسنے لگا۔

"یہ دیکھو۔ یہ چھائی ہوئی گہری خاموشی۔ اس کی بات سنو" داستان گو نے بات شروع کی۔

"ہاں، ہاں۔ وہ بول رہی ہے۔ کچھ کہہ رہی ہے" وٹ نے روڑا اٹکایا۔

"سنو، سنو" سب نے شور مچا دیا۔

وادی میں ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ ہوا کی آواز میں عجیب سا بیدم تھا۔ دو طرفہ اندھیر کی دیواریں کھڑی تھیں۔ دُور کوئی گا رہا تھا۔ بین کر رہا تھا۔ اس کی آواز میں بلا کی اداسی تھی۔

اگلے روز صبح سویرے ہی ہم اپل ریسٹ ہاؤس سے روانہ ہو گئے۔ چند میل کے بعد انجینئر چلایا "وہ دیکھو۔ وہ بٹل ہے۔"

"بٹل کیا؟" وٹ نے پوچھا۔

"ہمارے ہاں تو بٹھل ایک گہری پرات کو کہتے ہیں" شاعر بولا۔

"بٹل یہاں ایک بازار ہے" انجینئر بولا۔

"دیکھیں تو کیسا بازار ہے" ڈرائیور بولا۔

"اگر ہم راستے کا ہر گاؤں اور بازار دیکھنے لگے تو پھر کہیں پہنچنے کی بات تو ختم سمجھیں" لیڈر غصے سے چلایا۔

"بھئی، ہم پہنچنے کے لیے تو نہیں نکلے۔ ہم تو دیکھنے کے لیے نکلے ہیں۔ راستہ ہی ہماری منزل ہے،" شاعر بولا۔

"بالکل ٹھیک" داستان گو نے کہا "راستے کو نکال دو تو منزل بے معنی ہو جاتی ہے۔"
شاعر نے قہقہہ مارا "زندگی خود ایک راستہ ہے۔ خالی خولی راستہ ہے۔ بٹل بھی راستے پر ہے۔"

"نہیں، نہیں" لیڈر غرّایا "ہم بٹل بازار میں نہیں جا سکتے۔ بازار سڑک سے آدھ میل ہٹ کر ہے۔ ہمارے پاس اتنا وقت نہیں۔"

"چھوڑ یار" شاعر بولا "ہم تو وقت سے بے نیاز ہونے کے لیے گھر سے نکلے ہیں۔ ہمارے سامنے اس وقت نہ وقت ہے نہ منزل۔"

"بہر حال، لیڈر کا حکم ہے" ڈرائیور نے آنکھ ماری۔

"ہاں، لیڈر کا حکم ہے کہ ہم بٹل کے بازار میں نہیں جائیں گے۔ کیوں ڈرائیور؟" انجینئر ہنسنے لگا۔

"بالکل نہیں جائیں گے" ڈرائیور نے سنجیدگی سے کہا، اور ساتھ ہی گاڑی روک لی۔

"ارے!" سب چلّائے "یہ گاڑی کیوں رُک گئی؟"

"ہائیں!" سب ہکّا بکّا رہ گئے۔ گاڑی بٹل کے بازار میں کھڑی تھی۔

لیڈر نے ڈرائیور پر قصائی کی نگاہ ڈالی، لیکن ڈرائیور اس کی زد سے نکل کر بازار میں ٹہلنے لگا۔

وہ ایک مختصر سا بازار تھا۔ بارہ پندرہ کچّی دکانیں تھیں۔ دکاندار کمبلوں میں لپٹے ہوئے اونگھ رہے تھے۔ چند ایک لوگ بازار میں کھڑے دھوپ تاپ رہے تھے۔ سارا بازار گاہکوں کے انتظار میں سجا ہوا تھا۔

"آہا! کتنا خوبصورت منظر ہے!" انجینئر نے کہا "ذرا اُدھر دیکھو۔ چڑھتے سورج کی روشنی میں پہاڑ کی چوٹی جھل مل جھل مل کر رہی ہے۔"

"حد ہو گئی" ڈرائیور بولا "لوگ پہاڑوں کو دیکھتے ہیں، پتھروں کو دیکھتے ہیں، ندی نالوں

کو دیکھتے ہیں، جنگلوں کو دیکھتے ہیں، لیکن اشرف المخلوقات کو کوئی نہیں دیکھتا۔"

"لو بھئی، لوک جاگا" وٹ بولا۔

"یار، یہ پہاڑی لوگ اتنے اُداس کیوں ہوتے ہیں؟" انجینئر نے پوچھا۔

"حسین مناظر میں رہتے ہیں نا، اس لیے۔ حُسن اور اُداسی میں ایک گہرا رشتہ ہے"

داستان گو بولا۔

"اُوہنوں، یہ حسین مناظر میں نہیں رہتے" میں نے کہا۔

"کیا مطلب؟" وہ سب مجھ پر برس پڑے۔

"ذرا اِردگرد نگاہ دوڑا کر دیکھو" شاعر بولا۔

"اِردگرد نگاہ دوڑا کر جو ہم دیکھتے ہیں، وہ یہ نہیں دیکھتے" میں نے جواب دیا۔

"کیا مطلب؟" سب نے شور مچا دیا۔

"جب میں نیا نیا اسلام آباد میں آ کر بسا تھا تو مجھے گردوپیش میں، روشوں میں، سڑکوں میں، درختوں میں، پہاڑیوں میں، عمارتوں میں، فضا میں، اتنا حُسن نظر آتا تھا کہ فرطِ انبساط سے سانس لینا مشکل ہو جاتا تھا۔ راستہ چلنا مشکل ہو جاتا تھا۔ بات سوچنی مشکل ہو جاتی تھی۔ ٹریفک پر توجہ دینا مشکل ہو جاتا تھا۔ سوچتا یا اللہ! اتنا حُسنِ فراواں، اتنی دل آویزی، اتنی دل کشی! لیکن آج میں وہاں نہایت آرام اور اطمینان سے گھومتا پھرتا ہوں۔ ہاں کبھی کبھار شک پڑتا ہے کہ منظر حسین ہے۔"

"آہا!" شاعر بولا "مانوسیت بھی کیا نعمت ہے جو انسان کو معمول پر لے آتی ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے" وٹ چلّایا "مانوسیت بڑی نعمت ہے۔ لیکن پہاڑی لوگ اُداس کیوں ہوتے ہیں؟"

"ہر جگہ کے نہیں ہوتے" داستان گو بولا "سرسبز پہاڑیوں کے باسی اُداس ہوتے ہیں۔ سنگلاخ پہاڑیوں کے خونخوار ہوتے ہیں۔"

"یہ لیڈر بھی تو پہاڑیا ہے، لیکن نہ یہ اُداس ہے نہ خونخوار۔ اس کا کیا کریں"؟ دت نے کہا۔

لیڈر نے قہقہہ مارا "تم کیا جانتے ہو پہاڑیوں اور پہاڑوں کو۔ مجھ سے پُوچھو، مجھ سے۔ میں جو پہاڑوں میں پیدا ہُوا ہوں۔ پہاڑوں میں پلا، جوان ہُوا۔ ایسی پہاڑیاں نہیں جو تم یہاں دیکھ رہے ہو۔ یہ تو کچھ بھی نہیں۔ اگر تم دھرم سالہ کے پہاڑ دیکھ لو تو سمجھ میں آجائے کہ پہاڑ کسے کہتے ہیں۔"

"میں نے دھرم سالہ کے پہاڑ دیکھے ہیں" میں نے جواب دیا۔

"تم ___" لیڈر ہنسا "تم تو وہاں صرف چھ ماہ رہے تھے۔ چھ مہینے میں پہاڑ نظر نہیں آتے۔"

"چھوڑ یار" شاعر نے قہقہہ لگایا "وہ تو کہتا ہے پہاڑ صرف دو ایک مہینے نظر آتے ہیں۔ پھر آنکھ سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ اور تُو کہتا ہے چھ مہینے نظر ہی نہیں آتے۔"

"بھئی، بات تو پہاڑیوں کی ہو رہی ہے، پہاڑوں کی نہیں" دت نے آگ پر تیل چھڑکا۔

"میں نے دھرم سالہ کے پہاڑ بھی دیکھے ہیں" میں نے جواب دیا "کانگڑا کے بچاتوں پر مرد خود پسند تھا۔ عورتیں گویا آگ کی بھٹیاں جلائے بیٹھی تھیں۔ ہر آتے جاتے کو یُوں دیکھتیں جیسے سالہا سال سے اسی کے اِنتظار میں بیٹھی ہوں۔ اُو نچائیوں پر مرد اُداس تھے۔ اور چوٹیوں پر گدی لوگ ڈل اور بے حس تھے۔ صرف محنت ہی محنت۔ مشقّت ہی مشقّت۔"

"ذرا صبر کرو" انجینئر بولا "ہزارہ کی اس سرسبز وادی سے جب ہم نکلیں گے اور کوہستان کی حدود میں داخل ہوں گے تو کوہستانیوں کو دیکھ کر تمہارا خون جم نہ گیا تو کہنا۔"

"چھوڑ یار" شاعر ہنسا "اب وہ بات نہیں رہی۔ جو خطۂ تہذیب کی زد میں آجاتا ہے۔ وہاں کے لوگوں کی ساری خونخواری چھن جاتی ہے۔"

"آج سے پچاس برس پہلے" میں نے کہا "پنڈی سے آگے پشاور تک جاتے ہوئے دل دہلتا تھا۔ ریلوے سٹیشن قلعہ نما ہوتے تھے۔ ریل گاڑی آتی تو قلعے کے دروازے بند کر دیے جاتے تھے۔ قبائلیوں کو دیکھ کر پیشاب خطا ہوتا تھا۔"

"بالکل" وٹ چلّایا اور داستان گو کی طرف اشارہ کر کے بولا "اب یہ بھی تو پٹھان ہے۔ ذرا دیکھو اس کی طرف۔ اس میں پٹھانیت کی ذرا سی رمق بھی باقی ہے؟"

انجینئر بولا "ایک بار ہم کاغان گئے تھے۔ وہاں ایک کوہستانی آ گیا۔ بولا: زیرہ لو، بابو۔ اس کی شکل دیکھ کر اور آواز سن کر میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ میں نے انجانے میں بٹوا نکالا اور منہ مانگے دام پیش کر دیے، حالانکہ مجھے زیرے کی قطعی ضرورت نہ تھی۔"

"اب تو قبائلیوں کو سات پانیوں میں دھو کر ٹھنڈا کر دیا گیا ہے" شاعر نے کہا۔

"کون سے سات پانی؟"

"تہذیب، پیسہ، سڑک، فیشن، باڑا، تعلیم، آرام پسندی۔"

"وہ دیکھو، وہ" دفعتاً انجینئر چلّایا۔ سب نے نگاہ سڑک کی طرف دوڑائی۔ سامنے سڑک کے کنارے، ایک نو بیاہتا جوڑا بیٹھا تھا۔ دونوں یوں اُداس بیٹھے تھے جیسے ان پر کوئی تازہ ہونی بیت گئی ہو۔

"ذرا گاڑی روک لو" وٹ چلّایا۔

ڈرائیور نے اُلٹا گاڑی اور تیز کر دی۔

"دونوں ہی مظلوم نظر آتے ہیں" انجینئر نے کہا۔

"ہاں، شادی کے بعد ابتدا میں دونوں ہی مظلوم ہوتے ہیں" میں نے جواب دیا "پھر آہستہ آہستہ دلہن مظلومیت کی گٹھڑی اپنے سر سے اتار کر میاں کے سر پر رکھ دیتی ہے۔"

"بالکل غلط" وٹ ہنسا "یہ لیڈر کو دیکھ لو۔ اس کے سر پر تو مظلومیت کی گٹھڑی نہیں رکھی، بیگم نے۔"

"ساری بات ہی غلط ہے" داستان گو بولا "یہ مفتی کتاب و شنید کی باتیں کرتا ہے۔ کہتا ہے، پہاڑوں کی نچانوں میں عورت بھٹی جلا کر بیٹھی ہوتی ہے۔ اب ہزارہ اور آزاد کشمیر کے نچانوں کو دیکھ لو۔ یہاں عورتیں اتنی پاکیزہ ہیں کہ جواب نہیں۔"

"بالکل درست" لیڈر نے کہا "آزاد کشمیر میں سڑک پر اجنبی آجائے تو عورتیں پہاڑ کی طرف منہ کر کے رک جاتی ہیں، بیٹھ جاتی ہیں۔ اجنبی گزر جائے تو پھر سے سڑک پر چل پڑتی ہیں۔ اُدھر برقعے کا پردہ نہیں، آنکھ کا پردہ ہے، لاج کا پردہ ہے۔"

"صرف مظفر آباد ہی نہیں، ہزارہ، کاغان، سوات، ایبٹ آباد بھی۔ ان پہاڑوں میں بسنے والے لوگ بہت مذہبی اور پاکیزہ ہیں" انجینئر نے کہا۔

"مانتا ہوں، مانتا ہوں" میں نے کہا "لیکن . . . . ."

"کوئی لیکن ویکن نہیں۔ ہم تمہارے لیکن کے چکر میں نہیں آئیں گے" وٹا نے قہقہہ لگایا۔

"شملہ جاؤ، چنبہ جاؤ، کانگڑا دیکھو" میں نے چلا کر کہا۔

"یہاں کی بات کرو" شاعر بولا۔

"کافرستان جاؤ۔ گلگت کے شمالی علاقوں میں دیکھو۔"

"کافرستان تو ایک عجیب علاقہ ہے" ڈرائیور بولا۔

"وہاں اُداسی کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں۔ اتنی اُداسی میں نے کہیں نہیں دیکھی۔ حُسن اور اُداسی۔ لوگ گانے کے پردے میں بین کرتے ہیں۔ یوں ناچتے ہیں جیسے غم کے بوجھ تلے لڑکھڑا رہے ہوں۔"

"رُکو، رُکو!" لیڈر چلایا "وہ سامنے تھاکوٹ کا ہینگنگ پل ہے، وہ سامنے۔"

ہمارے سامنے دریا پر ایک چھوٹا سا، نازک سا، پل لٹک رہا تھا۔ پل کے قریب دو ایک بارکیں تھیں۔ یہاں وہاں، اُلٹی سیدھی قسم کی مشینیں کھڑی تھیں۔

"یہاں نہیں" ڈرائیور بولا "ہم دریا پار کر کے رکیں گے۔"

"ہاں، ہاں" انجینئر چلّایا "اِدھر تو ملٹری ایریا ہے۔ سول آبادی اُدھر ہے۔ ارے یار، سول آبادی کو چھوڑو۔ کھانے پینے کی بات کرو۔ ہوٹل کہاں ہے؟" شاعر بولا۔

"یا اللہ!" لیڈر چلّایا "میری قوم مجھ سے منحرف ہو رہی ہے۔ اسے غارت کر۔" سب نے قہقہہ لگایا۔

"یہ کوئی نئی بات نہیں" شاعر بولا "یہ انحراف کا دور ہے۔ قوم لیڈر سے منحرف ہے۔ لیڈر قوم سے منحرف ہے۔ سُنا تم نے، لیڈر؟"

"عجب شورہ شوری کا دور ہے" لیڈر نے کہا۔

"شورہ شوری نہ ہوتی تو ہم چھڈیار منانے کا فیصلہ کیوں کرتے؟" شاعر نے قہقہہ مارا۔

"اور اس وقت بھاکوٹ میں نہ ہوتے" وٹ بولا "کیوں، داستان گو تو کیا کہتا ہے؟"

"لیڈر بڑے ہوشیار ہوتے ہیں" داستان گو نے کہا "کوئی پیچھے چلنے والا نہ ہو پھر بھی۔ دوسروں پر ظاہر نہیں ہونے دیتے بلکہ یُوں مونچھ مروڑے رکھتے ہیں جیسے ساری قوم ان کے اشارے کی منتظر ہو۔ لیکن ہمارا لیڈر ایسا احمق ہے کہ اپنے منہ سے اعلان کر رہا ہے کہ کوئی پیچھے نہیں چلتا۔" سب قہقہہ مار کر ہنسے۔

"ہنسو نہیں" انجینئر بولا "پُل پر چلتے ہوئے کورس میں قہقہہ لگانا منع ہے۔"

"وہ کیوں؟" وٹ نے پُوچھا۔

"پُل بوجھ سے نہیں ٹوٹتا۔ وائی بریشن سے ٹوٹنے کا خطرہ لاحق ہوتا ہے۔"

"لاحول ولا قوۃ" لیڈر ہنسا "قہقہے سے ٹوٹ جاتا ہے۔ اچھا پُل ہے یہ۔"

"پتا ہے تجھے کہ پُل پر فوجیں فارمیشن میں مارچ نہیں کرتیں" انجینئر نے کہا۔

"بالکل" ڈرائیور بولا "لَے بھرا شور ایک تخریبی طاقت ہے۔"

"لَے بھری سُر بھی تو تخریبی طاقت ہے" انجینئر بولا۔

"بالکل" شاعر نے کہا "دل کا ستیاناس کر دیتی ہے۔"

"جب تک ہم پُل سے گزر نہ جائیں، کوئی بات نہ کرے" لیڈر بولا "ورنہ جماعتی قہقہے کا خطرہ ہے۔"

جیپ آہستہ آہستہ دریا عبور کر رہی تھی۔ فوجی مُعلّق پُل کے تختے کڑاڈں کڑاڈں کر رہے تھے۔

ٹھاکوٹ ایک فراخ میدان میں واقع ہے، جس کے درمیان میں دریا بہتا ہے۔ چٹانی زمین کی وجہ سے دریا کا دھارا تنگ جگہ میں مقیّد تھا۔ اگرچہ پانی بہت گہرا اور موجیں تُند تھیں، پھر بھی یقین نہیں آتا تھا کہ یہ دریائے سندھ ہے۔ سندھ اور اتنے رکھ رکھاؤ سے بہے! نچلے میدانی علاقوں میں پہنچ کر تو گویا اس کے سر پر جن سوار ہو جاتا ہے۔ میں نے سیلابوں میں دیکھا ہے کہ اس کا پاٹ چالیس میل پر محیط ہو جاتا ہے۔

دریا کے مشرقی کنارے کے پہاڑ سرسبز تھے۔ شاہ کوٹ کے مقام پر وہ شمال کی طرف مُڑ گئے تھے۔ مغربی کنارے پر سوات کا علاقہ تھا جو ریتلا اور بنجر تھا۔ ان پہاڑیوں سے مُردہ مٹّی کی بُو آ رہی تھی۔

"ارے! اس ریشمی سڑک کو موڑ کر ادھر بنجر علاقے میں کیوں لے آئے؟" داستان گو نے پُوچھا۔

"ہاں یار۔ راہِ راست تو اِدھر ہی تھی، ہزارہ کی طرف" لیڈر نے کہا۔

"راہِ راست کو کون پُوچھتا ہے" شاعر ہنسا۔

"راہِ راست بڑا پھیکا راستہ ہے۔ دو ایک کجیاں شامل ہو جائیں تو رنگینی پیدا ہو جاتی ہے" میں نے کہا۔

"اونہوں۔ یہ سیاسی کجی ہے۔ سوات کو حصّہ دینا مقصود تھا" انجینئر ہنسنے لگا۔

ہم دریا پار کر چکے تھے۔ بائیں طرف پہاڑ تھا۔ دائیں ہاتھ پتھر کی بنی ہوئی چند ایک

دُکانیں تھیں۔

"ہوٹل، ہوٹل!" لیڈر چلایا۔

"خشبو، خشبو۔ بھنا گوشت" وٹ نے ہونٹ سنوارتے ہوئے نعرہ لگایا۔

"آگیا، آگیا! دائیں ہاتھ موڑو، دائیں ہاتھ" لیڈر بولا۔

"ارے!" فنڈا شور چلایا "بریک نہیں لگ رہی۔"

جیپ کھٹاک سے ایک چارپائی سے ٹکرائی۔ تڑاخ تڑاخ چارپائی کے پرخچے اُڑے۔ سب چھلانگیں لگا کر جیپ سے باہر نکل آئے۔

"ویری ساری، ویری ساری" لیڈر چلایا "ہم تاوان ادا کریں گے۔"

"بالکل، بالکل"۔

"بسم اللہ، بسم اللہ" ایک درمیانے قد کا دُبلا پتلا آدمی ہوٹل سے باہر نکل آیا۔ کہنے لگا "یہ چارپائیاں ہم نے ٹوٹنے کے لیے بنائی ہیں، تاوان بھرنے کے لیے نہیں۔ بسم اللہ، بسم اللہ اندر آئیے۔ چھوٹے، اندر کا کمرا صاف کر دے، ان کے لیے۔ بڑی دیر کے بعد دُور کے مہمان آئے ہیں۔ بسم اللہ، بسم اللہ، بسم اللہ۔ بڑی برکت ہے۔ او صفدرے، دو دڑکے مرغی حلال کر۔ یہ میرے اپنے مہمان ہیں، خاص الخاص ــــ فتنے، ذرا پانی پلا مہمانوں کو" یہ کہہ کر وہ اندر باورچی خانے میں داخل ہو گیا۔

"بھئی واہ!" وٹ بولا "یہ تو صوفی دِکھتا ہے۔"

"چشتیہ رنگ ہے" داستان گو نے کہا "بالوں کی سیاہی، آنکھوں کی چمک، پیشانی کا عجز۔"

"صوفی جی، تازہ چائے بناؤں؟" اندر شیڈ سے آواز آئی۔

"بالکل تازہ۔ اور الگ الگ۔ سمجھے؟" اندر سے صوفی بولا۔

"لو بھئی۔ یہ تو واقعی صوفی نکلا" انجینئر ہنسنے لگا۔

"نام بھی صوفی، کام بھی صوفی" شاعر نے کہا۔

لیڈر صوفی کے پیچھے گیا اور کمرے میں جھانک کر واپس آکر بولا "یار، بڑی اچھی جگہ ہے۔ نیچے دریا بہتا ہے۔ سامنے ہزارہ کے پہاڑ استادہ ہیں۔"

"اب، جگہ کے ساتھ صوفی بھی تو ہے" انجینئر نے کہا۔

"ہاں یار، بڑا اچھا آدمی ہے" لیڈر بولا۔

"اس کا رویّہ بڑا نان کمرشل ہے" ڈرائیور نے کہا "پھر اس کا ہوٹل کیسے چل رہا ہے؟"

"پتا نہیں، یار۔ ان لوگوں کا کسی نے بھید نہیں پایا" داستان گو نے جواب دیا۔

"تمھارا بھید بھی تو نہیں پایا، شاہ جی" انجینئر نے داستان گو سے کہا۔

"اونہوں۔ اسے شاہ جی نہ کہو، یار" دت زیرِ لب بولا "پتا چل گیا تو مصیبت کھڑی ہو جائے گی۔"

"پتا چل گیا تو کہہ دیں گے کہ تلقین شاہ ہے۔ کیوں، شاہ جی؟"

"بسم اللہ، بسم اللہ" ملحقہ کمرے سے صوفی کی آواز سنائی دی "جم جم بھاگ کہ تلقین شاہ ہمارے گھر آئے۔ شاہ جی، میں نے کئی سالوں سے آپ کا پروگرام مس نہیں کیا۔"

وہ ایک چھوٹا سا مستطیل کمرا تھا جس میں دریا کی طرف ایک کھڑکی کھلتی تھی۔ کمرے میں چار چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ دو ایک چھوٹی میزیں تھیں۔ ایک اونچی چارپائی پر لحافوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔

"اچھا بھئی، ہم ذرا جیپ کی بریک ٹھیک کرا لیں" ڈرائیور اٹھ بیٹھا۔

"بسم اللہ بسم اللہ" صوفی بولا "دریا کے پار مکینک ہے۔ فوجی ورکشاپ بھی ہے۔ چائے پی لیں۔ پھر گاڑی اُدھر لے جائیں۔ جب تک آپ بریک فٹ کرائیں گے، میں کھانا فٹ کر دوں گا۔"

"صوفی جی، آپ ہمیشہ ہوٹل کا کام کرتے آئے ہیں کیا؟" داستان گو نے پوچھا۔

"نہیں، شاہ جی۔ بڑے پاپڑ بیلے ہیں۔ پہلے کلینزی کی، پھر ڈریوی، پھر موٹر مکینک، لوہارا۔ لیکن شاہ جی، ان کاموں میں مزا نہ آیا۔"

"مزا کیوں نہ آیا، صوفی جی؟" شاعر نے پوچھا۔

"یہ سب کام" میں" کو پالتے پوستے ہیں" صوفی نے جواب دیا "میں پھول کر کپّا بن گئی۔ پھر سرکار کی پیشی ہو گئی۔ سرکار نے اس میں پنکچر کر دیا۔ ساری ہوا نکل گئی تو بولے پُتر، ایسا کام کر جس میں دوسروں کی ٹہل سیوا ہو۔ اپنی ہیٹی ہو۔ بہت سوچا کہ ایسا کام کون سا ہو سکتا ہے۔ پھر بات سمجھ میں آ گئی۔ شاہ جی، دوسروں کو جی آیاں نوں کرنا، اُن کے جوتے اُتارنا، پانی پلانا، اور سب سے بڑھ کر مسافروں کو روٹی کھلانا، اس سے بہتر کوئی کام نظر نہ آیا۔ پھر میں نے کہا، چل صوفی، پکیرا سیکھ لے اور ڈٹ جا خدمت پر۔ سو جی، آج یہاں ہوٹل کر رہا ہوں۔"

"کسی شہر میں ہوٹل کیوں نہیں کرتے، صوفی جی؟" انجینئر نے پوچھا۔

"شہر میں مسافر نہیں ہوتے، جی" صوفی نے جواب دیا۔

"مسافر تو ہوتے ہیں" لیڈر بولا۔

"وہ جو مسافر ہوتے ہیں جی، وہ تو "میں" سے ٹن ٹن کرتے ہیں۔ یوں تن کر بات کرتے ہیں جیسے مالک ہوں۔ مسافر تو جی تھکا ہارا ہوتا ہے۔ ٹوٹا ہوا ہوتا ہے۔ بے بس ہوتا ہے۔ عاجز ہوتا ہے۔"

"سچ کہتے ہو، صوفی جی" انجینئر نے متاثر ہو کر کہا۔

"ہم بھی تو مسافر نہیں" داستان گو بولا "ہم تو ٹورسٹ ہیں۔ اپنی "میں" کے رنگین غبارے بھر کے پھرتے ہیں۔"

"نہ شاہ جی" صوفی نے جواب دیا "سرکار فرماتے ہیں، آدمی اُوپر کا نہ دیکھو، بھیتر کا دیکھو۔ اور پھر لوٹا کوئی بھی ہو، کیسا بھی ہو، اپنا کام تو بھر بھر مشکاں دینا ہے۔"

"صوفی جی" ملحقہ شیڈ سے آواز آئی "ہانڈی کا پانی سوکھ گیا ہے۔"

"میں ابھی آیا، سرکار" کہہ کر صوفی باہر نکل گیا۔

"واہ بھئی، واہ! کیا آدمی ہے۔ اگر ہر سو آدمیوں کے پیچھے ایک ایسا آدمی ہو تو ساری مشکلیں حل ہو جائیں۔"

"ساری مشکلیں حل ہو جانا اللہ کو خود منظور نہیں" میں نے جواب دیا۔

"ٹھیک تو ہے" داستان گو نے آہ بھری "ساری لذت راستے کی ہے، منزل کی نہیں۔"

"چھوڑو یار۔ کیا بحث لے بیٹھے۔ ادھر دیکھو۔ دریا کس ٹھاٹ سے بہہ رہا ہے" لیڈر چلّایا۔

"بہتا پانی بھی عجیب چیز ہے" شاعر بولا "دیکھتے رہو تو ایک کیفیت پیدا ہوتی ہے۔"

"جبھی تو اللہ والے عام طور پر بہتے پانی کے کنارے بیٹھتے ہیں" داستان گو نے کہا۔

"ایک فرحت ہوتی ہے، ایک تازگی، ایک پاکیزگی۔ ساری ایوولیوشن اس کی مرہونِ منت ہے" ڈرائیور گنگنایا۔

"چھڈ یار" شاعر گرجا "اب ایوولیوشن کا مسئلہ نہ لے بیٹھنا۔"

"سچ کہتا ہے یہ" داستان گو بولا "نور بابا کے پاس ایک آدمی آیا۔ بولا: بابا، مجھے اللہ دکھا دو، جو کائنات کا خالق ہے۔ بابا اسے ٹالتا رہا، لیکن وہ یہی رٹ لگائے بیٹھا رہا۔ کئی ایک دن گزر گئے۔ ایک دن بابا سوچ میں بیٹھا تھا۔ سائل نے پھر رٹ لگائی: بابا مجھے کائنات کا خالق دکھا دو۔ بابا نے جگ سے پانی کا ایک گلاس بھر کر سائل کے ہاتھ میں تھما دیا۔ بولا: بس اسے پکڑ لے۔ یہی کائنات کا خالق ہے۔"

"واہ! ساری ایوولیوشن کا مسئلہ حل کر دیا" ڈرائیور چلّایا۔

"لیکن بندر کی گتھی تو نہ سلجھی" وٹ بولا۔

"چھڈ یار" شاعر ہنسا "انسان پہلے بھی بندر تھا، اب بھی بندر ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ پہلے کھال میں مست تھا، اب جیّ قمیص میں مکلّف ہے۔"

"چلو، بھائی" لیڈر چلّایا "ہم بریک ٹھیک کروالیں۔ پھر کھانا کھا کر آگے چلیں گے۔

ابھی تو لمبا سفر طے کرنا ہے۔"

لیڈر اور ڈرائیور جیپ لے کر چلے گئے، اور ہم چارپائیوں پر لیٹ گئے۔ اس چھوٹے سے دھواں آلود کمرے میں چپ چاپ لیٹنے میں ایک عجیب کیفیت محسوس ہو رہی تھی۔ دیر تک ہم چپ چاپ لیٹے رہے۔

پھر انجینئر بولا "ایسے لگتا ہے جیسے ہم جھولا جھول رہے ہوں۔"

"یہ دریا کی گھمر گھمر کی وجہ سے ہے" داستان گو نے کہا۔

"نہیں، یار۔ جیپ میں صبح سے سفر کر رہے ہیں، اس لیے۔ کیوں شاہ جی؟ کیا خیال ہے؟" شاعر نے لقمہ دیا۔

"یارو، آم چوسو، پیڑ نہ گنو" میں نے کہا۔

"کیا مطلب؟"

"ہماری مشکل یہ ہے" میں نے کہا کہ ہم جھولا نہیں جھولتے۔ یہ سوچنے بیٹھ جاتے ہیں کہ کیوں جھولا جھول رہے ہیں۔"

"ہمیں بولنے کی لذت مار گئی" داستان گو نے کہا "گگتے کہا کرتے تھے کہ تم چپ رہنا سیکھ لو تو پھر کائنات تم سے باتیں کرنے لگے گی۔"

"بالکل ٹھیک" شاعر بولا "اس وقت دریا ہم سے باتیں کرنا چاہتا ہے۔ ہم اس کی نہیں سنتے، اپنی کہے جا رہے ہیں۔"

"ہاں" میں نے جواب دیا "مہاتما بدھ نے کہا تھا، جو دیکھنا چاہتے ہو تو آنکھیں موند لو۔"

"اگرچہ آنکھیں بھی بڑی رکاوٹ ہیں۔ لیکن سب سے بڑا شر تو زبان نے ڈھا رکھا ہے" شاعر نے کہا۔

"ہاں" داستان گو بولا "باباجی کہا کرتے ہیں کہ زبان میں ہی میں ہے۔ کان تُو ہی تُو ہیں،

اور آنکھیں لذّت ہی لذّت۔ یارو، زبان کو لگام دو، آنکھیں بند کر لو، دریا کی گھر گھر سنو۔ ذرا ہم اس جگہ کی لذّت لیں، اس مقام کی خوشبو اکٹھی کر لیں تاکہ ساتھ لے چلیں۔"

سب خاموش ہو گئے۔ جھولا جھولنے لگے۔ دریا کا گیت اُبھرا۔ اُبھرتا چلا گیا۔

تین بجے کے قریب جب ہم تھاکوٹ سے رُخصت ہوئے تو صوفی سڑک پر کھڑا تھا "بسم اللہ، بسم اللہ" وہ گنگنا رہا تھا "خیر سے جاؤ، خیر سے پہنچو، خیر سے لوٹو۔ تمہارا بہُت احسان ہے کہ مجھ ایسوں کو پانی پلانے اور روٹی کھلانے کا موقع دیتے ہو۔ اللہ تمھیں خوش رکھے۔"

ڈاسو

تھاکوٹ سے روانگی کے بعد دیر تک جیپ میں خاموشی طاری رہی۔
صوفی کے کردار سے ہم اس قدر متأثر ہُوئے تھے کہ فقرہ بازی کا مشغلہ کافی دیر تک معطل رہا۔
عجیب لوگ ہیں یہ!" داستان گو نے آہ بھری۔
"یار، یہ فرقہ جسے صوفی کہتے ہیں.....؟" لیڈر نے کچھ کہنا چاہا۔
"فرقے کا تو مجھے علم نہیں" داستان گو بولا "صوفی میرے نزدیک ایک رُخ ہے۔ ایک زاویۂ نظر ہے۔"
"ہٹاؤ یار، یہ فلسفہ بازی" لیڈر نے چڑ کر کہا۔
انجینئر بولا "شاہ جی، یہ بتاؤ کہ تھاکوٹ کی خُوشبو کیسی رہی؟"
"تھاکوٹ کی خُوشبُو؟" لیڈر نے حیرانی سے پُوچھا۔
"تمھیں کیا پتا" انجینئر بولا "تم تو ورکشاپ میں پٹرول کی بُو سونگھتے رہے، اور شاہ جی تھاکوٹ کی خوش بُو اکھٹی کرتے رہے۔"
"تھاکوٹ کی خوشبُو میں صرف دو عناصر تھے" شاعر نے کہا "ایک تو دریا کی گھمر گھمر اور دُوسرا صوفی کا عجز۔"
"تم کبھی تھرپارکر نہیں گئے" ڈرائیور بولا "وہاں کی خوشبُو انوکھی ہے۔"
"ہاں، بہت انوکھی" داستان گو نے ہاں میں ہاں ملائی۔

"کتنے عناصر ہیں ؟" وٹ نے پوچھا۔

"لوگوں میں غربت کی بُو ہے، عجز کی بُو ہے، معصومیت کی بُو ہے، اور پھر چاروں طرف پھیلے ہوئے ویرانے میں وسعت کی باس ہے" ڈرائیور نے وضاحت کی۔

"کیسا ویرانہ ؟" شاعر نے پوچھا۔

"ریت ہی ریت، تاحدِ نظر" ڈرائیور نے وضاحت کی۔

"صحرا کی کیا بات ہے! سارے پیغمبر صحراؤں میں اُتارے گئے۔ عظیم ترین انسان کی تشکیل میں صحرا کا بہت بڑا حصّہ ہے۔ صحرا کی کیا بات ہے!" انجینئر نے آہ بھری۔

"آہستہ بولو" وٹ نے زیرِ لب کہا "لیڈر سُن رہا ہے۔"

"ایک یہ ہمارا لیڈر ہے جو صحرا میں پک نک کرنے کا قائل نہیں" ڈرائیور نے کہا۔

"یہ تو پہاڑوں کا دیوانہ ہے" انجینئر بولا۔

"پہاڑ انسان کو کبڑا کرتے ہیں۔ صحرا عظیم بنا دیتے ہیں" شاعر نے کہا۔

"سب بے کار ہے" داستان گو نے آہ بھری۔

"بے کار کیوں ؟" وٹ نے پوچھا۔

"ہم ایسوں کے لیے کیا پہاڑ، کیا صحرا۔ نہ پہاڑ ہمارا کچھ بگاڑتے ہیں نہ صحرا" داستان گو بولا۔

"وہ کیوں ؟" لیڈر نے پوچھا۔

"اس لیے کہ گرد و پیش کی بولی سُننے کے لیے ہم نے خود میں کوئی ریسیور فٹ ہی نہیں کیا" داستان گو نے جواب دیا۔

"ریسیور تو اللہ نے فٹ کر رکھا ہے، ہم ہیں۔ لیکن جو اثر ڈالنے کے دیوانے ہوں انھیں اثر لینے کا نہ شعور ہوتا ہے اور نہ فرصت" شاعر نے کہا۔

"ارے!" ڈرائیور چلایا "یار، یہ بریک پوری طرح سے ٹھیک نہیں ہوئی۔ ابھی ہم نے

کوہستانی علاقے میں سفر کرنا ہے۔ اسے ٹھیک کرائے بغیر بات نہیں بنے گی۔"

"میں بتاؤں؟" انجینئر بولا "وہ سامنے بشام ہے، اور بشام میں فوجی ورکشاپ ہے۔"

بشام ایک نہایت غیر پُر فضا مقام ہے۔ چھوٹے چھوٹے مٹیالے ٹیلوں میں ایک غیر پہاڑی سا میدان۔

"ارے، یہ تو بالکل ہی فلیٹ جگہ ہے" شاعر چلّایا۔

"ایسا معلوم پڑتا ہے جیسے راستے ونڈ میں آ گئے ہوں" دت بولا۔

"قصبہ تو آگے ہوگا۔ یہ تو فوجی کیمپ ہے" انجینئر نے کہا۔

"چھوڑو یار۔ ان کی ورکشاپ تو ادھر ہی ہوگی" لیڈر چلّایا۔

ڈھلان پر چند ایک خیمے لگے ہوئے تھے۔ سامنے ورکشاپ کا بورڈ لگا تھا۔ ورکشاپ کے خیموں کے سامنے دو فوجی کھڑے تھے۔ ایک کام میں مصروف تھا۔ دوسرا بندوق لیے کھڑا تھا۔

"یہاں کا انچارج کون ہے؟" ڈرائیور نے پوچھا۔

"اُدھر میجر صاحب ہیں" سپاہی نے جواب دیا۔

"ہمیں اُدھر لے چلو۔ ہم میجر صاحب سے بات کریں گے۔"

میجر صاحب ایک معمولی سے خیمے میں میز کرسی لگائے بیٹھے تھے۔ انھوں نے ہمیں مشکوک نگاہوں سے دیکھا۔ پھر بولے "مسٹر، ہم آپ کی مدد نہیں کر سکتے۔ ہاں، اگر آپ کو ٹولز کی ضرورت ہے تو لے لیجیے اور خود بریک ٹھیک کر لیجیے۔" ان کا لہجہ بے حد خشک تھا۔ انداز ایسا جیسے اُکتائے بیٹھے ہوں۔

"تھینک یو میجر۔ ہم بریک خود ٹھیک کر لیں گے۔" ڈرائیور بولا۔

میجر نے ایک مستری سپاہی کو بلایا اور ہدایات دیں، یوں، جیسے کہ رہے ہوں، انھیں ٹال دو۔۔

انجینئر اور ڈرائیور کام میں لگ گئے اور ہم سب ورک شاپ سے کچھ فاصلے پر، درختوں کی چھاؤں میں بیٹھ گئے۔ ہمارے قریب ہی سپاہیوں کے خیمے لگے ہوئے تھے۔ دس بیس ہوں گے۔ لیکن ہماری طرف خیموں کی پُشت تھی۔

"یہ تو بڑی سپاٹ جگہ ہے" میں نے کہا۔

"یہاں تو صرف مٹی کی بُو ہے" وٹ ہنسا۔

"مٹی کی بُو سے بہتر خوش بُو کوئی نہیں۔ کاش کہ کوئی فرم مٹی کا عطر بنا سکتی!" شاعر نے کہا۔

"شاید کسی کمپنی نے بنایا ہو" داستان گو بولا "کیا پتا۔"

"بنایا ہوتا تو پتا چل جاتا" لیڈر نے کہا۔

"نہیں یار۔ پتا نہیں چلتا" داستان گو بولا۔

"وہ کیسے؟" لیڈر نے پوچھا۔

داستان گو کہنے لگا "ہم فیس کریم بناتے ہیں۔ اس لیے خوش بو بنانے والی کمپنیوں سے ہمارا رابطہ ہے۔ ایک بار میں نے تفریحاً ایک کمپنی کو خط لکھا کہ جناب، میں آپ کی توجہ اس بات کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ انسان کے جسم کی خوش بو بھی ایک خصوصی چیز ہے۔ اگر مرد کی خوشبو اور عورت کی خوشبو الگ الگ بنائی جائے تو وہ کمرشلی بہت کام کی چیز ہوگی۔"

"کیا کہا؟ مرد کی خوش بُو؟" شاعر نے قہقہہ لگایا۔

"وہ تو بُو ہوتی ہے" لیڈر ہنسا۔

"تمھارے لیے بُو ہوتی ہے کیوں کہ تم مرد ہو۔ عورت کے لیے تو وہ خوش بُو ہوگی" میں نے کہا۔

"خوشبو تو خیر نہیں کہہ سکتے" انجینئر بولا۔

"خوش بُو میں تو بھئی لطافت کا ہونا ضروری ہوتا ہے" ڈرائیور نے کہا

"اگر عورت کی بُو بنائی جائے تو وہ ہم پر کثافت طاری کر دے گی۔"

"بھئی، اس کی یہی تو خوبی ہے کہ کثافت طاری کرتی ہے" میں نے جواب دیا "ہم سب اس کثافت پر جان دیتے ہیں۔"

داستان گو بڑا رند آدمی ہے۔ وہ بات چھیڑ کر چپ ہو جاتا ہے۔ سُننے والے بھڑوں کا چھتّا بن کر بِھن بِھن کرتے رہتے ہیں۔ دیر تک ہم سب بِھن بِھن کرتے رہے۔

"ہاں بھئی، تو پھر کیا ہُوا؟" دت نے پُوچھا۔ داستان گو چُپ چاپ بیٹھا رہا حتیٰ کہ سب چلّانے لگے "پھر، پھر، پھر؟"

"پھر" وہ بولا "تین مہینے کے بعد مجھے کمپنی کی طرف سے خط موصول ہُوا۔ لکھا تھا: جنابِ والا، ہمیں خوشی ہے کہ آپ ہمارے کام میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ انسان کے جسم کی خوش بُو سب سے پہلے ہماری کمپنی نے ۱۷۷۶ء میں بنائی تھی۔"

"ارے! ۱۷۷۶ء میں!" سب چیخنے لگے۔

داستان گو نے سلسلۂ کلام جاری کیا "پھر ۱۸۲۴ء میں مسٹر آندرے جوریان نے اس میں ترمیم کی اور ۱۹۰۵ء میں مسٹر کیرن ماؤزرے نے اسے تکمیل تک پہنچا دیا۔ لیکن یہ خوش بو کمپنی نے عام نہیں کی بلکہ اُمرا اور رؤسا تک محدود رکھی ہے۔ وجہ ظاہر ہے۔ چونکہ آپ خوش بوؤں سے دلچسپی رکھتے ہیں لہٰذا بطور تحفہ ہم آپ کو عورت کی خوش بُو کی ایک شیشی بھیج رہے ہیں۔ از راہِ کرم ہمیں اپنی رائے سے مطلع فرمائیں۔"

"ارے! ارے!" سب چلّانے لگے۔ ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ عین اس وقت ہم نے دیکھا کہ چھ سات فوجی، سادہ کپڑوں میں ملبوس، ہماری طرف بڑھے چلے آ رہے ہیں۔

"بھئی، شور نہ مچاؤ۔ وہ ہماری طرف آ رہے ہیں" لیڈر نے سپاہیوں کی طرف اشارہ کیا۔

"السلام علیکم" وہ بولے۔ پھر آپس میں باتیں کرنے لگے۔

"میں کہتا ہوں، وہی ہے" ایک بولا۔

"نہیں، نہیں یار" دوسرے نے کہا۔

"شرط لگالو" پہلا بولا۔

"تیرا گرائیں ہے کیا؟" تیسرے نے پوچھا۔ ہم سب حیرت سے ان کی طرف دیکھنے لگے۔ بالآخر ان میں سے ایک آگے بڑھا اور داستان گو کی طرف اشارہ کر کے بولا:

"معافی چاہتا ہوں۔ مگر کیا آپ تلقین شاہ ہیں؟"

داستان گو نے سر اثبات میں ہلا دیا۔

"یا علیؑ!" انھوں نے نعرہ بلند کیا، اور پھر — پھر ہم پر یورش کر دی۔

چند ایک منٹ میں وہاں ایک مجمع لگ گیا۔ چار آدمی ورک شاپ کی طرف بھاگے تاکہ جیپ کی بریک ٹھیک کریں۔ چار ایک سپاہی کیمپ کے لانگری کی طرف بھاگے کہ شاہ جی کو چینی کی چائے پلانے کا انتظام کریں۔ ایک آدمی بسکٹوں کا ایک لفافہ لے کر آ گیا۔ دس ایک داستان گو کے چرنوں میں آ بیٹھے۔ پھر ہاتھ ملانے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

ایک بولا "میں چار سال سے بلاناغہ تلقین شاہ سُن رہا ہوں۔"

دوسرا بولا "میں تو تب سے سُن رہا ہوں جب ابھی میں بھرتی نہیں ہُوا تھا۔"

تیسرا بولا "شاہ جی، ذرا تلقین شاہ کی بولی سُنا دیں۔" ایک ہنگامہ مچ گیا۔

مانا کہ میں داستان گو کا بہت پُرانا دوست ہوں۔ گزشتہ ۳۲ سال سے ہم ایک دوسرے کے ساتھی ہیں۔ میں اس کی صلاحیتوں کو مانتا ہوں، لیکن جب بھی لوگ تلقین شاہ کو ہیرو بنا کر بیٹھ جاتے ہیں تو مجھے غصہ آنے لگتا ہے۔ بات سمجھ میں نہیں آتی۔

اصولوں کو جھٹلانے والی بات کیسے سمجھ میں آئے۔ تلقین شاہ ایک منفی کردار ہے۔ اس میں کوئی مثبت پہلو نہیں۔ خسیس ہے۔ باتونی ہے۔ جو کہتا ہے وہ کرتا نہیں۔ جو کرتا ہے

وہ کہتا نہیں۔ کہنہ ہے۔ باتیں ہی باتیں۔ لچھے دار باتیں۔ باتوں کے جال بنتا ہے۔ مُنھ زبانی باتیں۔ اس کے باوجود لوگ تلقین شاہ کو پُوجتے ہیں۔ اس کی باتیں سُنتے ہیں۔ سر دھنتے ہیں۔ صدقے واری جاتے ہیں۔ ریڈیو پر آج تک کوئی منفی کردار اتنا مقبول نہیں ہُوا۔

پورے دو گھنٹے بشام میں فوجی لوگ تلقین شاہ کے صدقے واری جاتے رہے۔

جب ہماری جیپ وہاں سے چلی تو وہ سب میدان میں کھڑے ہاتھ ہلا رہے تھے۔

بشام کے بعد سبھی گاڑی میں خاموش بیٹھے تھے۔ داستان گو تو یُوں بیٹھا تھا جیسے آرتی چڑھنے کے بعد دیوتا بن گیا ہو۔ دراصل بشام میں فوجیوں کی آؤ بھگت نے ہم سب کو ٹھنڈا کر دیا تھا۔

وہ علاقہ جس سے جیپ گزر رہی تھی، اُجڑا اُجڑا تھا۔ پہاڑ دُور ہٹ چکے تھے۔ مٹیالے ٹیلے قریب آ گئے تھے۔ زمینیں سُوکھی پڑی تھیں۔ لوگوں میں سواتی رنگ کم ہوتا جا رہا تھا۔ کوہستانی عُنصر اُبھر رہا تھا۔

دفعتہً گاڑی دبیر کے بازار میں جا داخل ہُوئی۔

دبیر ایک مختصر سا میلا سا، بازار تھا۔ گاؤں چالیس پچاس گھروں پر مشتمل تھا۔ دس بیس دُھواں آلود دُکانیں تھیں جہاں دکاندار یُوں بیٹھے تھے جیسے ازل سے بجھے ہُوئے ہوں۔

"یہ لوگ ہزارہ سے کتنے مختلف ہیں" ڈرائیور بولا "بجھے بجھے تو ہیں، لیکن ان کی اُداسی اُداسی نہیں ہے۔"

"یہ اُداسی ہزارہ کی اُداسی سے کتنی مختلف ہے" انجینئر نے کہا۔

"بھئی، یہ دیکھتے نہیں، یہ تو گھُورتے ہیں" لیڈر بولا۔

"کیا یہ کوہستانی لوگ ہیں؟" میں نے پُوچھا۔

"ابھی کوہستانی کہاں" انجینئر نے جواب دیا۔

"ان میں سرحدی لوگوں کا رنگ غالب نظر آتا ہے" شاعر بولا۔

"سرحد کے لوگوں کا باہر نہ دیکھو، ان کے اندر دیکھو۔ باہر سے گھورتے نظر آتے ہیں" داستان گو نے کہا۔

"اور اندر سے؟" وٹ نے پوچھا۔

"یہ داستان گو خود پٹھان ہے نا، اس لیے ان کے اندر کا بھید جانتا ہے" لیڈر نے لقمہ دیا۔

"اونہوں۔ یہ میری رائے نہیں" داستان گو بولا "یہ آرنلڈ کی رائے ہے۔ آرنلڈ ایک انگریز تھا۔ کھاتے پیتے گھر کو لات مار کر پاکستان آگیا۔ اتفاق سے وہ مجھے مل گیا۔ میں اسے اپنے گھر لے آیا۔ میرے ہاں وہ دو تین مہینے رہا۔ میں نے اس سے پوچھا: آرنی، تو ایک امیر باپ کا بیٹا ہے، پھر تو کیوں در بدر کی ٹھوکریں کھا رہا ہے، پردیس میں؟ کہنے لگا: میں مغرب کی افلوانس سے بے زار ہوں۔ بے راہ روی سے بے زار ہوں۔ وہاں کی فرسٹریشن سے بے زار ہوں۔ میں چار سال ملک ملک گھوما ہوں۔ اطمینان و سکون کی تلاش میں دربدر ہُوا ہوں۔ اور اب، اب میں نے فیصلہ کر لیا ہے، میں پاکستان میں رہوں گا۔ یہاں غربت ہے۔ امن ہے۔ سکون ہے۔ کیا پنجاب میں رہو گے؟ میں نے پوچھا۔ بولا: نہیں، میں سرحد میں رہوں گا۔ سرحد کے لوگ بہت اچھے ہیں۔ باہر سے کڑوے ہیں۔ غُصیل ہیں۔ اندر سے مساوات کو مانتے ہیں۔ وہ سُخنے نہیں۔ ہپوکرٹ نہیں۔"

"پھر؟ پھر؟" سب نے شور مچا دیا۔

اس وقت ہم دبیر کے بازار میں گھوم پھر رہے تھے۔ لوگ ہماری طرف مشکوک نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔

"بتاؤ یار۔ اب وہ آرنی کہاں ہے؟" لیڈر نے پوچھا۔

"ایک مہینا ہُوا مجھے اس کا فون آیا تھا" داستان گو نے کہا "فون پر آرنی کہنے لگا کہ میں یہاں لاہور میں لوم گلڈ ہوٹل میں ٹھہرا ہُوا ہوں۔ ملنے کو جی چاہتا ہے۔ کہو تو آجاؤں۔ میں

گاڑی لے کر بھاگا۔ بڑی مشکل سے یوم گلڈ کا پتا چلایا۔ یہ ہوٹل قلعہ گوجر سنگھ کے پچھواڑے سے ایک پرانے بوسیدہ دو منزلہ چوبارے میں واقع ہے۔ میں تو حیران رہ گیا۔ اس میں ہوٹل کی کوئی بات نہ تھی۔

"یہاں وہاں ہر جگہ چارپائیاں ہی چارپائیاں کھڑی تھیں۔ جو بھی آتا، اسے ایک چارپائی دے دیتے، اور رات کے پانچ روپے لے لیتے۔ بس ہوٹل کا اتنا ہی کام تھا۔ البتہ ایک کونے میں کڑک چائے کا سٹال لگا ہوا تھا۔ سارا چوبارہ کھچا کھچ ہپیوں سے بھرا ہوا تھا۔ میں باری باری سب کمروں میں گھوما۔ آخری کمرے میں داخل ہوا تو ایک سواتی نے بڑھ کر مجھے گلے لگا لیا۔ ارے! میں چلایا۔ تم آرنی ہو؟ وہ مسکرا کر بولا: نہیں، آرنی نہیں، میں عبداللہ ہوں۔ اور وہ دیکھو، اُدھر۔ میرے رُوبرو ایک سواتن عورت بیٹھی بچے کو دودھ پلا رہی تھی۔ یہ کنیز فاطمہ ہے، وہ بولا، میری بیوی۔ تو کیا سوات میں شادی کر لی ہے تُو نے؟ نہیں، وہ ہنسا کنیز فاطمہ فرانسیسی ہے۔ ان دونوں کو دیکھ کر بالکل یقین نہ آتا تھا کہ وہ فارنیر ہیں۔"

"تو کیا وہ سوات میں رہتا ہے؟" لیڈر نے پوچھا۔

"ہاں، سوات میں۔ میں نے اس سے پوچھا: بتا، تیرا گزارہ کیسے چلتا ہے؟" داستان گو نے کہا "آرنی بولا: اسی طرح جس طرح دی ہولی پرافٹ کا گزارہ ہوتا تھا۔ میں نے تھوڑی سی زمین خرید لی ہے۔ مٹی کا ایک کوٹھا تھوپ لیا ہے۔ گھر میں ایک بکری ہے۔ آٹھ مرغیاں ہیں۔ ہم انڈے کھاتے ہیں، دودھ پیتے ہیں، سارا دن دھوپ سینکتے ہیں، اور کھیتی باڑی کرتے ہیں۔ میں خوش ہوں۔ بہت خوش۔ یہ پٹھان بہت اچھے لوگ ہیں۔ وہ ہمیں اپنا جانتے ہیں۔ غیر نہیں سمجھتے۔"

"یار، ہمیں بھی مِلاؤ کبھی، اس سے" انجینئر نے کہا۔

"تم اس کی باتیں نہیں سمجھ سکو گے، اس لیے کہ ہم سب افلوانس کے مارے ہوئے ہیں۔ افلوانس دورِ حاضرہ کی سب سے بڑی لعنت ہے" میں نے کہا۔

"افلواٹس ہیں تو نصیب ہی نہیں ہُوئی ہم"، شاعر بولا "حسرت ہی رہی"۔ سب نے قہقہہ لگایا۔

دفعتہً ہم نے دیکھا کہ بازار کے اختتام پر ہم ایک شوریدہ سر نالے کے پُل آپہنچے ہیں، جہاں بیسیوں فوجیوں کا جمگھٹا ہے اور سب لوگ حیرت اور رشک بھری نگاہوں سے ہمیں دیکھ رہے ہیں۔

"بھئی، یہ سڑک کیوں بند کر رکھی ہے آپ نے؟" لیڈر چلّایا۔

"سڑک بند ہے" قریب کھڑا فوجی بولا "آگے مرمّت ہو رہی ہے"۔

پُل پر بڑا خوشگوار سماں تھا۔ پانی اتنی تیزی سے بہہ رہا تھا جیسے طوفان میں بہہ پتھروں سے ٹکرانے کی وجہ سے پانی کی پھوار دُور دُور تک اُڑ رہی تھی۔ پھر پن چکّیوں کی گھمر گھمر اور چلتے خانوں کا شور۔ نالے پر پہنچ کر بازار کی اُداسی اور گھٹن دُور ہو گئی۔

دفعتہً ایک فوجی افسر ہمارے سامنے آ کھڑا ہُوا اور خشک لہجے میں ہم سے پوچھ گچھ کرنے لگا۔ آپ کہاں سے آئے ہیں؟ کیوں آئے ہیں؟ کہاں جا رہے ہیں؟ کیوں جا رہے ہیں؟ آپ کون ہیں؟ پوچھ گچھ کرنے کے بعد وہ واپس چلا گیا۔

"یار، یہ ہمیں مشکوک کیوں سمجھ رہے ہیں؟" لیڈر بولا۔

"سمجھنے کی کیا بات ہے، بھئی۔ ہم تو ہیں ہی مشکوک" وہ بولا۔

"وہ تو ظاہر ہے" شاعر نے کہا "سوال یہ ہے کہ ہم کیوں مشکوک ہیں؟"

"نہیں، سوال یہ ہے کہ ہم میں کون مشکوک ہے؟" ڈرائیور نے کہا۔

"ہاں، یار۔ کوئی ہے ضرور" وہ بولا۔

"صرف ڈرائیور ہے جس پر شک کیا جا سکتا ہے" داستان گو بولا۔

"وہ کیوں؟" ڈرائیور نے پوچھا۔

"وہ اس لیے کہ سواریاں تو سواریوں جیسی ہی ہیں، ڈرائیور ٹرک ڈرائیوروں جیسا

نہیں۔ اس لیے مشکوک ہے" داستان گو نے کہا۔

"ہاں بھئی، ڈرائیور تو خالص انگریزنہ ٹائپ ہے" شاعر بولا۔

"بس یہی بات ہے" وٹ ہنسا "انھیں ڈر ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے پھر سے قبضہ جمانے کے لیے ہراول پارٹی کے طور پر اسے بھیجا ہے تاکہ جائزہ لے"

ابھی ہماری بحث جاری تھی کہ دو فوجی آگئے۔ بولے "اگر آپ کو جلدی ہے تو چلیے، آپ کو لے چلتے ہیں۔ آپ ہماری جیپ کے پیچھے پیچھے آجائیں"

جب ہم جیپ میں بیٹھ رہے تھے تو وٹ نے کہا "یار، ان سے یہ بھی تو پوچھنا تھا کہ لے تو جا رہے ہو، پرے جاؤ گے کہاں؟ کہیں نظر بند کرنے تو نہیں لے جا رہے؟"

"کیوں؟ سکھے شاہی ہے کیا؟" لیڈر غصے میں چلایا۔

"وہ تو ہے" وٹ بولا "صورتِ حالات دیکھ لو"

"وہ صورتِ حالات جسے دیکھ کر ہم راولپنڈی سے بھاگے ہیں اور یہاں چھڈیار منا ہے ہیں، واقعی مخدوش ہے" شاعر نے سنجیدگی سے کہا "ایک طرف ایک پارٹی کھڑی ہے، دوسری طرف دوسری۔ ایک ترقی کی رٹ لگا رہی ہے، دوسری اسلامی نظام کا ورد کر رہی ہیں۔ بازاروں اور گلیوں میں لوگ جمع ہیں۔ انھیں کچھ نہیں پتا کہ کیا ہو رہا ہے۔ البتہ چاہتے ہیں کہ کچھ ہو جائے۔ چاہے کچھ بھی ہو، مگر ہو جائے۔ بازار اور گلیوں میں دھول اُڑے۔ یہ سکھے شاہی نہیں کیا؟"

"بالکل ہے" انجینئر بولا۔

"نہ ہوتی تو سات شریف آدمی یوں چھڈیار منانے کے بہانے ان پہاڑوں میں چوہے نہ چھنکارہے ہوتے" ڈرائیور بولا۔

"رُک جاؤ، رُک جاؤ" فوجی چلائے۔ جیپ رُک گئی۔

دونوں فوجی جیپ سے اُتر کر ہمارے پاس آئے۔ بولے "گاڑی آگے نہیں جا سکتی۔ سڑک پر تیل بچھا ہوا ہے"

"سڑک پر تیل؟ سڑک پر تو پتھر ہوتے ہیں، ٹک ہوتا ہے، بجری ہوتی ہے۔ یہ تیل کہاں سے آیا؟" انجینئر بولا۔

"یہ چینی جو ہیں ان کا اپنا ہی حساب ہے" فوجی نے جواب دیا "پہلے پتھر کوٹتے ہیں، پھر تارپین کا تیل ڈالتے ہیں۔ پھر کوٹتے ہیں اور آخر میں کول تار بچھا دیتے ہیں۔"

شام کے گھسمچے میں وہ ایک خوفناک جگہ تھی۔ دونوں طرف چیل کے درختوں سے ڈھکے ہوئے پہاڑوں کی اونچی لمبی دیواریں کھڑی تھیں۔ سڑک کے دائیں ہاتھ پندرہ بیس فٹ کا ہموار میدان تھا۔ اس کے عین درمیان میں سیمنٹ کا چبوترا بنا ہوا تھا۔ ہم سب اس چبوترے پر جا بیٹھے۔

"اس ویرانے میں چبوترا؟" لیڈر نے کہا۔

"یہ تو ہیلی پیڈ معلوم ہوتا ہے" انجینئر نے جواب دیا۔

"یہاں ہیلی کا پٹر اُترنے کا مطلب؟" وٹ بولا۔

"ارے بھئی،" انجینئر نے کہا "یہ پٹن کا علاقہ ہے۔ پچھلے سال پٹن میں بہت بڑا زلزلہ آیا تھا۔ ایک قیامت برپا ہو گئی تھی۔"

"ہاں، ہاں۔ اخباروں میں خبریں آئی تھیں" داستان گو بولا۔

"شاید یہ ہیلی پیڈ ان دنوں بنایا گیا ہو، ریسکیو کے لیے، پروویژن کی سپلائی کے لیے" انجینئر بولا۔

رات پڑ چکی تھی۔ اونچے لمبے پہاڑ کالے بھوتنے بن چکے تھے۔ اس مقام سے خوف آنے لگا تھا۔

"یار، جو ہمیں نظر بند ہی کرنا تھا" شاعر نے فوجیوں سے کہا "تو کسی اچھی جگہ کرتے۔" وہ ہنسنے لگے۔

"تلقین شاہ جی، اپنے اگلے پروگرام میں اس وی آئی پی ٹریٹمنٹ کا ذکر ضرور کرنا جو

فوجیوں نے ہمیں دیا ہے" میں نے ترپ کا پتّا پھینکا۔

تلقین شاہ کا نام سُن کر فوجیوں کے کان کھڑے ہو گئے۔ ان کا انداز یکسر بدل گیا۔

"پھینک دیا، بھئی، ترُپ کا پتّا" وٹ زیرِ لب بولا۔

یہ سُن کر پہلے تو فوجی تلقین شاہ سے پروگرام کی باتیں کرتے رہے، پھر سڑک پہ کام کرنے والے چینیوں اور مزدوروں کو ڈانٹنے لگے: بھئی جلدی کرو۔ رات پڑ گئی ہے، اور ہمارے مہمانوں نے جلدی پہنچنا ہے۔

ہیلی پیڈ سے رُخصت ہو کر ڈرائیور کو دو میل تک تیل سے بھیگی ہوئی سڑک پر بڑی احتیاط سے گاڑی چلانی پڑی۔

"دیکھو، بھئی۔ بولنا نہیں،" لیڈر نے کہا "ایک تو تیل کی پھسلن ہے، دوسرے سڑک خطرناک ہے، اور تیسرے گھُپ اندھیرا ہے۔"

پٹن کا یہ علاقہ بڑا خوفناک تھا۔ دو رُویہ اُونچے اُونچے پہاڑ کھڑے تھے۔ سڑک گھومتی بل کھاتی جا رہی تھی۔ ہر چند ایک منٹ کے بعد موڑ آجاتا جس پر گاڑی چلانا بڑی چابکدستی کا کام تھا۔

یہ پہاڑ ویران تھا۔ دُور دُور تک بستی کا کوئی نشان نہ تھا۔ سڑک پر کوئی گاڑی آ جا نہ رہی تھی۔ اس خوفناک راستے کو دیکھ کر سبھی خاموش بیٹھے تھے۔

گھنٹوں گزر گئے۔ جیپ آہستہ آہستہ چلتی رہی۔ راستہ ویسے ہی بند بند رہا۔

"کتنی خوفناک جگہ ہے!" لیڈر بولا۔

"ہاں، بھئی۔ پٹن کا علاقہ ہے" انجینئر نے کہا۔

"اچھا تو یہ وہ پٹن ہے" داستان گو بولا "جس کی امداد کے لیے دُنیا بھر سے چیزیں آئی تھیں۔"

"ہاں" ڈرائیور نے کہا "بستر، کمبل، کپڑے، خوراک، فارن ایکسچینج اور دُودھ۔"

"ہاں" وٹ چلایا "وہ دودھ جو آج بھی پنڈی کے بازاروں میں بِک رہا ہے۔"

"وہ کمبل بڑے عمدہ تھے" لیڈر نے کہا "میں نے بھی ایک خریدا تھا، مارکیٹ سے۔"

"خریدنے والے بھی نہال ہو گئے اور بیچنے والے بھی" ڈرائیور بولا۔

"نہیں یار" داستان گو نے احتجاجاً کہا "وہ چیزیں تو عوام میں بانٹی گئی تھیں۔ اخباروں میں دس پندرہ دن تصویریں چھپتی رہی تھیں۔ کمبل دیئے جا رہے ہیں۔ اناج کی بوریاں تقسیم کی جا رہی ہیں۔"

"ہاں، ہاں۔ بڑی بڑی تصویریں چھپی تھیں" وٹ نے کہا "رسکیو کرنے والے فوٹوگرافر ساتھ لاتے تھے۔ پہلے وہ ہیلی کاپٹر کی سیر کرتے پھر تصویریں کھنچواتے اور پھر انھیں شاہ سرخیوں کے ساتھ اخباروں میں چھپواتے۔"

"اس علاقے کی ڈویلپمنٹ کے منصوبے بھی تو بنے تھے" داستان گو نے کہا۔

"بالکل بنے تھے" شاعر بولا۔

"ان پر عمل درآمد بھی کر دیا گیا" انجنیئر ہنسا۔

"نظر تو نہیں آتا، اِدھر کوئی عمل درآمد" داستان گو نے کہا۔

"شاید اُدھر پٹن میں ہو" ڈرائیور بولا۔

"پٹن میں نہیں" وٹ بولا "اسلام آباد سکرٹریٹ کی فائلوں میں جا کر دیکھو۔ آنکھیں نہ کھل جائیں تو کہنا۔"

دفعتہً گاڑی رُک گئی۔ ہمارے سامنے ایک نالا تھا۔ نالے پر ایک بہت بڑا چھپر بنا ہُوا تھا۔

"لو بھئی، ہوٹل تو آ گیا" لیڈر بولا۔ ہوٹل میں چھ سات لوگ بیٹھے چائے پی رہے تھے۔

"پٹن یہاں سے کتنی دُور ہے؟" ڈرائیور نے پوچھا۔

ایک سفید ریش بوڑھا ہمارے پاس آ کھڑا ہُوا۔ بولا "صاب، یہی پٹن ہے۔"

"یہاں آبادی تو نہیں" شاعر نے کہا۔

"آبادی نیچے ہے" بابا نے جواب دیا۔

"راستہ کدھر سے جاتا ہے؟" ڈرائیور نے پوچھا۔

"آدھ فرلانگ آگے جاؤ۔ پھر دائیں ہاتھ نیچے اُتر جاؤ۔"

"ہٹاؤ یار" شاعر بولا "راستہ تلاش کرنے کا فائدہ؟ اسی ہوٹل میں کیوں نہ رات بسر کر لیں۔"

بابا کے ہوٹل میں چھپر تلے چارپائیوں کی ایک قطار لگی ہوئی تھی۔ ہم نے کھانا کھایا اور لیٹ گئے۔

بابا کے ہوٹل والی وہ رات مجھے آج تک نہیں بھولی۔ چاروں طرف خوفناک سناٹا چھایا ہوا تھا۔ نالے میں بہتے ہوئے پانی کی مسلسل گھمر گھمر اس مہیب سناٹے کو اور بھی سنگین بنا رہی تھی۔ ایسے لگتا تھا جیسے فطرت اس سناٹے کی زبان سے آفرنیش کا راز بیان کر رہی ہو۔ قدرت کے تخلیقی چکر کا بھید کھول رہی ہو۔

پتا نہیں کس اصول کے تحت پہاڑوں میں پُرفضا مقامات سطحی جذبات پیدا کرتے ہیں اور خوفناک مقامات دل کی گہرائیوں میں عظیم جذبات جگا دیتے ہیں۔

اگلے روز صبح سویرے ہی ہم بابا کے ہوٹل سے روانہ ہو گئے۔

اس روز سبھی خاموش تھے۔ وٹ کو کہنے کے لیے کوئی بات نہ سوجھ رہی تھی۔ لیڈر سنگلاخ پہاڑوں کو حسرت کی نظر سے دیکھ رہا تھا۔ داستان گو بدھ بھکشوؤں کا سا آسن جمائے بیٹھا تھا۔

ماحول اس قدر بوجھل تھا کہ ہم ایک عجیب سی گھٹن محسوس کر رہے تھے۔ اُونچے اُونچے پہاڑ اپنا گھیرا مسلسل تنگ کرتے جا رہے تھے۔ گھٹن بڑھتی جا رہی تھی۔ ننگی سنگلاخ چٹانوں سے گرمی کے بھبکے اُٹھ رہے تھے۔ سڑک پر آبادی کا نشان تک نہ تھا۔

دوپہر کے قریب ایک موڑ کاٹنے کے بعد دفعتہً ہم ایک آبادی میں داخل ہو گئے۔

"ارے! یہ آبادی کیسی ہے؟" وٹ بولا۔

"یار، یہ تو بروزنِ کالا پانی، کالا پہاڑ نظر آتا ہے" شاعر نے کہا۔

"یہ ایک نہیں، دو آبادیاں ہیں" انجینئر نے جواب دیا۔

"دو آبادیاں ایک ہی جگہ، ساتھ ساتھ!"

"یہ ڈاسو ہے، سوات کا آخری قصبہ۔ اور وہ اُدھر سامنے کومیلا، کوہستان کا پہلا قصبہ۔ درمیان میں دریا ہے۔ اِدھر ڈاسو، اُدھر کومیلا" انجینئر نے وضاحت کی۔

"میں نہیں مانتا" میں نے کہا "یہاں دریا ہوتا تو کچھ تو خنکی ہوتی"

"کیا واقعی درمیان میں دریا ہے؟" شاعر نے پُوچھا۔

"ہاں، ہاں بھئی۔ وہ دیکھو، درمیان میں فوجی پُل ہے۔ یہ وہی دریا ہے جو ہم نے تھاکوٹ پر عبُور کیا تھا" انجینئر نے مزید وضاحت کی۔

"اونہوں۔ یہ وہ دریا نہیں" وٹ بولا "اس میں گیلا پانی نہیں معلوم پڑتا۔ بھئی، وہ تو خوشگوار دریا تھا۔ ہوا میں نمی تھی۔ ٹھنڈک تھی۔ یہاں تو گرمی کی بھڑاس کے سوا کچھ بھی نہیں"

"ضرور یہ لاوے کا دریا ہوگا۔ جبھی تو یہ جگہ جہنّم معلوم ہوتی ہے" داستان گو بولا۔

"کتنا خوفناک مقام ہے!" ڈرائیور نے جھُرجھُری لی۔

"روکو، یار، روکو! کہیں سے چائے کا پیالہ پئیں" لیڈر بولا۔

"رُکنے کو جی نہیں چاہتا" ڈرائیور نے کہا "رُکے تو دم گھُٹ ہو جائیں گے"

"ہاں یار، یہ شہر نہیں، بھٹی معلوم پڑتی ہے"

"روکو، روکو" لیڈر غرّایا "ہم رُکیں گے" گاڑی رُک گئی۔

ہوٹل دھواں دھار تھا۔ کمرے میں بوریوں کے انبار لگے ہوئے تھے۔ درمیان میں چار پانچ پٹھان ڈرائیور پڑے تھے جیسے تلے ہوئے کریلے ہوں۔

"ہٹاؤ بھئی۔ یہ تو دم گھُٹ مقام ہے" میں نے کہا۔

"ہوں۔ پانی پیو اور چل پڑو" ڈرائیور بولا۔

"جانا کہاں ہے، بابو؟ آگے سڑک بند ہے" پٹھان ڈرائیور قہقہہ مار کر ہنسا۔

راستہ بند ہے!" لیڈر نے دہرایا" لیکن کیوں؟"

"دیکھو، بابو، اَم اِدھر دس سال سے ٹرک چلا رہا ہے۔ جب کوئی بولتا ہے کہ سڑک بند ہے اَم رُک جاتا ہے۔ جب کوئی بولتا ہے کہ سڑک کھل گیا تو اَم چل پڑتا ہے۔"

"کب سے اِدھر رُکا ہُوا ہے، آپ؟" انجینئر بولا۔

"چار دن سے،" خان نے جواب دیا۔

"چار دن سے!" سب نے حیرت سے دہرایا۔

خان ڈرائیور نے قہقہہ لگایا۔ بولا "صاحب، اس سڑک پر چلنے کے لیے صبر ہونا چاہیے۔ جہاں روکا رُک گئے۔ جہاں چلایا، چل پڑے۔ رُک گئے تو رُکنے کا غم نہیں۔ چل پڑے تو چلنے کی خوشی نہیں۔"

"لیکن راستہ بند کیوں ہے؟ وجہ کیا ہے؟" لیڈر نے پُوچھا۔

"بس بند ہے۔ پتا نہیں کیوں بند ہے" اس نے جواب دیا۔

"کب کھلے گا؟" انجینئر نے پُوچھا۔

"کچھ پتا نہیں۔ چاہے آج کھل جائے، چاہے چار دن بند رہے" دوسرا ٹرک ڈرائیور بولا۔

"چار دن اور بند رہے گا؟" لیڈر چلّایا "ہماری چھٹیاں تو یہیں ختم ہو جائیں گی۔"

"یہ بڑی مشکل ہُوئی" انجینئر نے کہا۔

"چلو، یہیں سے واپس چلے جائیں" ویٹ نے مُنھ بنایا۔

"پیچھے بھی تو سڑک بن رہی ہے" خان بولا" اگر پیچھے بھی سڑک بند ہُوئی تو کیا کرے گا؟ نہ اِدھر کا رہے گا نہ اُدھر کا۔"

"مارے گئے یار" شاعر تڑپ کر بولا۔

"سمجھ لو جنازہ نکل گیا" وٹ نے منہ بنایا۔

"صبر، بابو، صبر۔ اس سڑک پر چلنے کے لیے صبر چاہیے" ٹرک ڈرائیور ہنسا۔

"یہاں کوئی افسر ہے، جس سے بات کی جا سکے؟" انجینئر نے پوچھا۔

"بس ایک کرنیل ہے" خان ڈرائیور نے جواب دیا "اُدھر مینلا میں اس کا کیمپ ہے، دریا کے پار۔"

بہت سے خیموں کے درمیان کرنل کا دفتر ایک چھوٹے سے کوارٹر میں واقع تھا۔ دروازے پر ایک سپاہی بندوق اُٹھائے چلچلاتی دھوپ میں کھڑا تھا۔

"ہے جوان، ہمیں کرنیل صاحب سے ملنا ہے" ڈرائیور نے کہا۔

"کون ہے تم؟" وہ بولا۔

"ہم اسلام آباد سے آیا ہے۔"

"تو پرچی پر نام پتا لکھواؤ۔ ام پرچی لاتا ہے۔"

چار ایک منٹ کے بعد سپاہی اندر سے ایک پرچی اور پنسل لے آیا۔

"کیا نام ہے؟" وہ بولا "باپ کا نام؟ کہاں کا ہے؟ گاؤں کا نام؟"

"اسلام آباد" ڈرائیور نے جواب دیا۔

"تحصیل کا نام؟"

"یہی کافی ہے، خان" انجینئر بولا۔

"ہائی، یہ کافی نہیں ہے۔ ام جو بولتا ہے، یہ کافی نہیں ہے۔"

"تم کرنیل صاحب کو جا کر دکھاؤ تو" لیڈر نے کہا۔

"نہیں" وہ بولا "کیسے دکھلائے ام؟"

"کیوں؟"

"بس، یہی حکم ہے کہ پرچی پوری لکھو" سپاہی نے کہا۔

"اچھا تو پوری لکھ لو" ڈرائیور بولا۔

"بولو۔ تحصیل کا نام؟ سپاہی نے پوچھا۔

"اسلام آباد" ڈرائیور نے جواب دیا۔

"گاؤں کا نام بھی اسلام آباد، تحصیل کا نام بھی اسلام آباد" سپاہی نے مشکوک نظروں سے ہماری طرف دیکھا۔

"بالکل" انجینئر نے سنجیدگی سے کہا۔

"اچھا۔ ضلعے کا نام؟" سپاہی نے پوچھا۔

"اسلام آباد" انجینئر نے جواب دیا۔

"خو ہم سے تخول کرتا ہے؟" سپاہی بگڑ گیا۔

وٹ آگے بڑھا "بھئی خان صاحب سے مذاق نہ کرو۔ لکھو خان: گاؤں اسلام آباد، تحصیل راولپنڈی، ضلع چک لالہ۔" شاعر قہقہہ مار کر ہنسا۔

خان نے پرچی پھاڑ دی اور رائفل اُٹھا کر کھڑا ہو گیا۔

"اب اس سے بات نہ کرنا" داستان گو نے کہا "گولی مار دے گا۔"

اتنے میں ایک اور سپاہی آ گیا "کیا بات ہے؟" اس نے پوچھا۔

"کرنل صاحب سے ملنا ہے" انجینئر نے جواب دیا۔

"کیا کام ہے؟"

"سڑک کے بارے میں پوچھنا ہے" ڈرائیور نے کہا۔

"کیا پوچھنا ہے؟"

"کہ سڑک کب کھلے گی؟"

"جب کھلے گی، کھل جائے گی" سپاہی نے کہا "وہ دیکھو، ڈیڑھ سو ٹرک یہاں رُکا پڑا ہے۔ چار روز ہو گئے ہیں۔"

"ہم حکومت کے آدمی ہیں۔ ہم نے واپس جانا ہے" انجینئر نے کہا۔

"تو جاؤ۔ واپس جاؤ۔ کون روکتا ہے" سپاہی بولا۔

"بے کار ہے، یار۔ چھوڑو" شاعر نے زیرِ لب کہا "خواہ مخواہ یہاں دھوپ میں اپنا آملیٹ بنا رہے ہو"

"چلو، بھئی، چلو" وٹ چلایا، اور ہم وہاں سے واپس چل پڑے۔ راستے میں ڈرائیور کہنے لگا "یار، اس ہوٹل میں جانے کو جی نہیں چاہتا۔ آگے ہی سڑک بند ہے۔ چلو، پیچھے چلتے ہیں۔ دو چار میل دُور کوئی پُرفضا مقام ضرور مل جائے گا، جہاں پانی کا چشمہ ہو، درختوں کا سایہ ہو۔ وہاں جا کر پڑاؤ کریں گے، خیمے لگائیں گے، اور آرام کریں گے۔ کیوں کیسا؟"

"ہاں یار، ہوٹل میں جانے کو جی نہیں چاہتا" شاعر بولا۔

"ہوٹل کہاں ہے؟ تندور ہے" وٹ نے مُنھ بنایا۔ اور ہم واپس پتن کی طرف چل پڑے۔ اس تجویز سے سب متفق تھے۔

ابھی ہم ڈاسو سے ایک میل دُور گئے ہوں گے کہ برلبِ سڑک ایک ٹھنڈی کھوہ نظر آئی۔ اس کھوہ میں ایک چوڑا سا ربڑ کا پائپ لگا ہُوا تھا، جس میں سے پانی کا اتنا موٹا دھارا بہ رہا تھا۔

ڈرائیور نے جیپ روک لی "واہ! کیا مقام ہے!"

"یہ پائپ کیوں لگا ہُوا ہے؟" انجینئر نے پُوچھا۔

"بس لگا ہُوا ہے" وٹ نے کہا "آم کھاؤ، پیڑ نہ گنو"

"یہ لگا نہیں، لگایا گیا ہے۔ دیکھو، اُدپر سے پانی پائپ کے ذریعے لایا گیا ہے۔ پھر یہاں اسے سپلنڈرٹ دے کر کھڑا کیا گیا ہے" ڈرائیور نے وضاحت کی۔

"بالکل، بالکل۔ تاکہ ہم اس دھارے کے نیچے کھڑے ہو کر نہا سکیں" وٹ چلایا۔

"ہاں، یار۔ میں بھی نہاؤں گا" شاعر نے کپڑے اُتارنے شروع کر دیے۔ ابھی ہم نہانے کی تیاریاں ہی کر رہے تھے کہ ایک واٹر ٹینک ٹرک آ گیا، اور دو چینی ٹرک سے اُتر کر چیں چاؤ چاؤ

چلانے لگے۔ ٹرک بیک ہو کر دھارے کے نیچے آ کھڑا ہوا۔

"دیکھا!" انجینئر بولا "یہ چینیوں کا واٹر ڈپو معلوم دیتا ہے۔ انھوں نے یہ دھارا سوچ سمجھ کر بنایا ہے۔"

"اے، بابو صاحب" ایک سپاہی آ دھمکا "یہاں اڈا نہ بناؤ۔ یہ چینیوں کا واٹر ڈپو ہے۔"

"سنتری" ڈرائیور نے پوچھا "اس سڑک پر قریب ہی کوئی اور ایسی جگہ ہے جہاں پانی کا چشمہ ہو اور جہاں ہم قیام کر سکیں؟"

"اونہوں" اس نے نفی میں سر ہلایا "یہ سارے پہاڑ بنجر ہیں۔ پٹن کے قریب کوئی چشمہ مل جائے تو پتا نہیں۔"

"ہم نیچے دریا میں خیمے لگا لیں تو کیسا رہے؟" ڈرائیور نے انجینئر سے پوچھا "وہ دیکھو، نیچے دریا کے کنارے پر ریت بچھی ہوئی ہے۔"

"لیکن نیچے جانے کا کوئی راستہ بھی ہو" انجینئر نے جواب دیا۔

"نہیں ہے تو بنا لیں گے۔ کیوں سنتری جی!" ڈرائیور نے کہا۔

"یہ قبائلی علاقہ ہے، بابو صاحب" سنتری بولا "بستی کے سوا کوئی جگہ محفوظ نہیں۔ رات بسر کرنی ہے تو داسو جاؤ۔ اِدھر اُدھر کیمپ نہ لگانا۔"

"یہ جگہ بہت اچھی تھی" لیڈر بولا۔

"یہاں کیمپ لگانے کی اجازت نہیں" سنتری نے کہا۔

"یار، ٹھیک ہے۔ داسو چلے جائیں گے۔ لیکن یہاں نہا تو لیں" رات تک ہم وہاں نہاتے رہے۔ پھر مجبوراً داسو واپس چلے گئے۔

داسو پہاڑوں کے درمیان واقع ہونے کے باوجود ایک تپتا ہوا صحرا تھا۔ چاروں طرف پہاڑوں سے بھڑاس نکل رہی تھی۔ ہوٹل کا چولھا مسلسل دھواں دے رہا تھا۔ وہاں رات گزارنا ایک عذاب نظر آ رہا تھا۔

سُورج غروب ہونے کے بعد خنکی ہونے کے بجائے لُو کا جھکڑ چلنے لگا۔ کسی مسخرے نے افواہ اُڑادی کہ سڑک کھلنے والی ہے۔ ٹرک ڈرائیور اپنے اپنے ٹرک کی طرف بھاگے۔ ڈیڑھ سو ٹرکوں کے انجن سٹارٹ ہو کر مزید بھڑاس نکالنے لگے۔

"بند کر دیار، بند کرو" داستان گو چلّایا "ہم کب تک اس تپتی ہوئی جیپ میں بیٹھے انتظار کریں گے کہ کب سڑک کھلتی ہے۔"

"بھئی، سڑک کھلنے والی ہے" لیڈر غصّے سے بولا۔

"کھُلنے والی ہے تو کیا ہُوا؟" شاعر بولا۔

"ڈیڑھ گھنٹے سے ہم جیپ میں بیٹھے انتظار کر رہے ہیں۔ خواہ مخواہ۔ کھُل جائے گی تو دیکھا جائے گا" داستان گو نے کہا۔

"اونہوں۔ یہ سڑک نہیں کھلے گی" سنتری قریب آکر بولا۔

"تو کیا ہمیں رات یہیں بسر کرنی پڑے گی؟ اس تندور میں؟"

"یارا" وہ بولا "دو سال سے ہم اس تنور میں پڑے ہیں۔ یہاں سارا دن تندور جلتا ہے۔ شام کو لُو کا جھکڑ چلتا ہے، اور رات کو مچھّروں کی فوج چڑھائی کر دیتی ہے" سپاہی نے کہا۔

"اتنی گرمی میں مچھّر؟" داستان گو نے حیرت سے پُوچھا۔

"یہاں کے مچھّر خاص الخاص ہیں" سپاہی نے کہا "جو گرمی میں مرتے نہیں، پلتے ہیں۔"

"رات تو ٹھنڈی ہو جاتی ہو گی" لیڈر نے پُوچھا۔

"اونہوں۔ رات کو آندھی چلتی ہے۔ روز بلا ناغہ بجلی چمکتی ہے۔ بڑی خوف ناک کڑک۔ دل دہل جاتے ہیں۔"

"اچھا پہاڑ ہے یہ!" لیڈر چلّایا۔

"یہ پہاڑ نہیں، کوہستان ہے جیسا موسم ہے، ویسے ہی لوگ ہیں" سپاہی نے کہا۔

"تھرڈ، یار" لیڈر چلّایا "کیوں نہ ہم ہوٹل کی چھت پر رات گزاریں؟ میں ہوٹل والوں

سے بات کرتا ہوں۔"

ہوٹل کی چھت ہموار تھی۔ اس پر دس ایک چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔

"چھت پر سونا منع ہے" سپاہی نے کہا۔

"کیوں؟" ڈرائیور غصے سے بولا۔

"پرے کوہستانیوں کے گھر ہیں بے پردگی ہوتی ہے۔ تم تھانے میں ڈیرا لگالو۔ تمہیں چارپائیاں دے دیں گے" سپاہی نے کہا۔

رات کو ہم نے تھانے میں ڈیرا لگا لیا۔ ڈرائیور نے ہموار جگہ پر دونوں خیمے لگا لیے۔ یہ خیمے عروسی نوعیت کے تھے۔ ایک خیمے میں دو فرد سو سکتے تھے۔ اُٹھنے یا بیٹھنے کی گنجائش نہ تھی۔ رینگ کے اندر داخل ہونا پڑتا تھا۔ اور پھر یوں جیسے کوئی لحد میں آ پڑا ہو۔

آدھی رات کے وقت آندھی چلنے لگی۔ پہلے تو ہوا سیٹیاں بجاتی رہی، پھر ریت اُڑنے لگی۔ ساری وادی غبار آلود ہو گئی۔ بالآخر گرج چمک شروع ہو گئی۔ یہ گرج بھی عجب قسم کی تھی۔ ہر کڑک پر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے بجلی ہم پر گری ہو۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے بم باری ہو رہی ہو، اور دشمن تاک تاک کر نشانہ لگا رہا ہو۔ ہم نے بھاگ کر جیپ میں پناہ لی۔ لیکن جیپ میں مکھی مکھی جتنا بڑا مچھر ہمارا منتظر تھا!

الائچی نالا

اگلے روز دوپہر کے قریب سڑک کھلنے کا اعلان ہو گیا۔ ڈرائیور نے شور مچا دیا "جلدی، جلدی۔ اگر ہم ٹرکوں کے بیچ میں پھنس گئے تو مارے جائیں گے۔"

جب سڑک کھلی تو ہماری جیپ سب سے آگے تھی۔ ہمارے پیچھے سو ڈیڑھ سو ٹرک تھے۔

"ارے! یہ سڑک ہے کیا؟" ڈرائیور چلایا۔

"کیوں؟ کیا ہوا؟"

"ذرا دیکھو تو!"

ہم نے آگے کی طرف نگاہ دوڑائی۔ سامنے پتھروں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔

"بھئی، وہ سڑک کہاں ہے" وٹ چلایا "جو انھوں نے کھولی ہے؟ اگر یہ پتھروں کا ڈھیر سڑک ہے تو اسے بند کرنے یا کھولنے کا مطلب؟"

"ہاں، یار۔ کہتا تو ٹھیک ہے" شاعر نے وٹ کی ہاں میں ہاں ملائی۔

"شکر نہیں کرتے کہ انھوں نے ٹریفک کھول دی ہے" لیڈر نے کہا "اگر ڈاسو میں ایک رات اور بسر کرنی پڑتی تو طبیعت صاف ہو جاتی۔"

"اُف!" وٹ سر سہلاتے ہوئے بولا "بڑے دھکے لگ رہے ہیں، یار۔"

"دھکے تو لگیں گے۔ سڑک ہی ایسی ہے۔ پتھروں کا ڈھیر لگا ہے۔ گاڑی کے دباؤ سے پتھر لڑھک جاتے ہیں" ڈرائیور بولا "حالانکہ میں پانچ میل کی سپیڈ سے چل رہا ہوں۔"

وہ منظر عجیب تھا سو ڈیڑھ سو ٹرک پتھروں پر لڑھک رہے ہیں۔ انجن گھاؤں گھاؤں کر رہے تھے۔ پہیّوں تلے سے پتھر پھسلتے اور پھر یوں اُڑتے جیسے بٹیرے ہوں۔ ہمارے دل سہمے ہوئے تھے۔ اب گرے کہ اب گرے۔

موٹے پٹرول کی بُو سے دماغ پھٹے جا رہے تھے۔ سُورج جھنڈا گاڑ کر سر پر کھڑا تھا۔ چٹانوں سے گرمی یوں پھوٹ پھوٹ کر نکل رہی تھی جیسے جبڑے سے بروزہ رِستا ہے۔ ہوا بند تھی۔ سڑک پر درخت، پودے یا جھاڑی کا نشان تک نہ تھا۔ دُور نیچے دریا یوں بہ رہا تھا جیسے مکھیوں کا چھتا بھنبھنا رہا ہو۔ دریا کے باوجود ہوا میں نہ خنکی تھی نہ نمی۔ ہم پر بے نام خوف و ہراس طاری تھا۔

"واہ! کیا ریشمی سڑک بچھی ہے" دٹ بولا۔

"خبردار!" لیڈر غرّایا "اگر تُو نے مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی تو میں تجھے اُٹھا کر دریا میں پھینک دوں گا۔"

"اللہ کے واسطے پھینک دو" دٹ نے ہاتھ جوڑ کر کہا "وہاں پانی تو ہوگا، کم از کم۔"

"پانی میں تو تیری لاش پہنچے گی" شاعر غرّایا۔

"چلو، لاش ہی سہی۔ میری لاش تو پانی میں ہوگی۔ تیری لاش کو تو اِدھر گدھ کھائیں گے" دٹ نے کہا۔

"یہاں تو گدھ بھی نہیں آئیں گے" انجینئر بولا۔

"بکواس بند کرو" ڈرائیور غرّایا "اگر میری توجہ ذرا بھٹکی تو ساری لاشیں دریا میں تیریں گی۔"

"کیا فرق پڑتا ہے" انجینئر بولا۔

"بڑا فرق پڑتا ہے" داستان گو بولا "دیکھ لو، ذرا سے موسم سے کتنا فرق پڑ گیا ہے۔ قہقہے تیوریوں میں بدل گئے ہیں۔ جملوں کی جگہ گالیاں برسنے لگی ہیں۔"

"بند کرو اپنا فلسفہ" لیڈر غرّایا "ڈرائیور کی توجہ بھٹکی تو ــــــ"

"تو ڈرائیور کا چاچا لگتا ہے کیا؟" شاعر بولا۔

"ارے!" سب چلائے۔ جیپ نے شدید ہچکولا کھایا۔ سب ایک دوسرے میں گڈمڈ ہوگئے۔

کچھ دیر کے بعد وٹ نے خود کو سنبھالا۔ بولا "یارو، ہم خیریت سے ہیں کیا؟"

کسی نے جواب نہ دیا۔

"کیا ہم سڑک پر ہی ہیں؟" وٹ نے پوچھا۔

"کیا پتا" شاعر نے کہا "سڑک کہاں ہے؟ یہاں تو پتھر ہی پتھر ہیں۔"

"شکر ہے، کوئی تو بولا۔ میں سمجھا تھا کہ میں واحد سروائیور رہا ہوں۔"

"چوں چوں، چی چی، چن" باہر سے آواز آئی۔

"یہ چڑیاں کہاں چہکنے لگیں؟" وٹ بولا۔

"بے وقوف! خاموش! سامنے چینی سڑک روکے کھڑے ہیں" ڈرائیور بولا۔

"سامنے پتھروں پر چینی یوں چمٹے ہوئے تھے جیسے گڑ کی بھیلیوں پر چیونٹے۔

"رک کیوں گئے، ڈرائیور؟" انجینئر بولا۔

"آگے سڑک بند ہے" ڈرائیور نے جواب دیا۔

"پھر بند ہے کیا؟" سب چلائے۔

"سڑک تو ہے ہی نہیں، پھر بند کرنے کا مطلب؟" شاعر نے منہ بنایا۔

"گاڑی سے اتر جاؤ" رائفل والا حوالدار قریب آکر چلایا۔ آگے بلاسٹنگ ہو رہا ہے۔ پتھر گرے گا۔ مغز پھٹ جائے گا۔ کوَر لے لو، کوَر۔"

دڑام دڑام!

دڑا دڑام! ایک خوفناک دھماکا ہوا۔ پہاڑوں نے مزید اچھالا۔ سب نے

جیپ سے چھلانگیں لگادیں، اور کور لینے کے لیے بھاگے۔ آدھ گھنٹے تک دھماکوں کی قیامت بپا رہی۔ سب یوں جیپ تلے یا اطراف میں دبکے ہوئے تھے جیسے وہ بلاسٹنگ نہیں، ائیر ریڈ ہو۔

آدھ گھنٹے کے بعد حوالدار کی آواز سنائی دی "بلاسٹنگ خلاص۔ بلاسٹنگ خلاص۔"

ساتوں مُردے جیپ تلے سے نکلے۔

"حوالدار، حوالدار" لیڈر چلّایا "اب سڑک کھل گئی ہے کیا؟"

"خو، بابو، اب تو سڑک بالکل بند ہو گیا ہے، بلاسٹنگ سے۔ سڑک پر پتھر کا ڈھیر لگ گیا ہے، ڈھیر کو صاف کرے گا، پھر راستہ بنے گا۔ جب اِدھر کا راستہ بن جائے گا تو اُدھر بلاسٹنگ ہوگا۔"

"خان، راستہ کب کھلے گا؟" ڈرائیور نے پوچھا۔

"کیا خبر" وہ بولا "چار دن لگ جائیں۔"

"چار دن!" ڈٹ چلّایا "دوڑو، دوڑو، یارو۔ میں بے ہوش ہونے لگا ہوں۔ جلدی سے میرے منہ میں پانی ڈالو۔"

وہ جگہ ڈاسو سے بھی زیادہ بھیانک تھی۔ اُونچے اُونچے بلے چٹیل پہاڑوں کی دو متوازی دیواریں کھڑی تھیں۔ درمیان میں ایک گہرے اور تنگ کھڈ میں دریا بہ رہا تھا۔ پہاڑوں پر نہ جھاڑی تھی، نہ پودا، نہ درخت۔ گھاس کا پتا تک دکھائی نہ دیتا تھا۔ کسی جگہ ہریاول یا سائے کا نشان نہ تھا۔ چٹانیں تپ رہی تھیں۔ ان سے گرمی کے بھبکے اُٹھ رہے تھے۔ سڑک پر پتھروں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ اس ڈھیر پر ڈیڑھ سو ٹرکوں کی قطار کھڑی تھی۔

کوئی بھی ٹرک سیدھا نہ تھا۔ کوئی اِدھر جھکا ہوا تھا، کوئی اُدھر۔ کوئی عین کنارے پر کھڑا ڈول رہا تھا۔ نیچے گہرا کھڈ تھا۔ بائیں ہاتھ ایک چھوٹے سے میدان میں پندرہ بیس دم بخت قسم کے موٹے موٹے خیمے لگے ہوئے تھے۔ یہ چینیوں کا کیمپ تھا۔ اس کے ساتھ ہی

اُونچی نیچی زمین پر پاکستانی حوالدار کا خیمہ تھا، جس میں چھ سپاہی مُقیم تھے۔ ساتھ ہی بلاسٹنگ کے لیے بارُود کا ذخیرہ تھا۔

ہم نے منظر کی طرف دیکھا۔

"یارو، میں بے ہوش ہونے لگا ہوں" وٹ چلّایا "سٹیچر کا انتظام کر لو۔"

"غم نہ کھاؤ" شاعر بولا "ہم تمھیں اُٹھا کر نیچے کھڈ میں پھینک دیں گے۔"

"یارو، کہتا تو ٹھیک ہے" انجینئر بولا "صورتِ حال اچھّی نہیں۔"

لیڈر دوڑتا ہُوا آیا "حد ہو گئی، بھئی، حد ہو گئی" وہ چلّایا "ٹرکوں کے سارے ڈرائیور رُوپوش ہو گئے ہیں۔"

"کیا سارے کے سارے؟" میں نے پُوچھا۔

"ایک بھی دکھائی نہیں دیتا" لیڈر نے کہا۔

"بھئی، وہ ٹرکوں کے نیچے پڑے ہوں گے" انجینئر نے کہا۔

"ٹرکوں کے نیچے؟" شاعر نے حیرت سے دُہرایا۔

"ہاں، یہاں اور کہیں سایہ بھی ہو" انجینئر ہنسا۔

"اچھّا، تو سالے اپنا اپنا سایہ ساتھ لائے ہیں" وٹ بولا۔

"ہم تو جیپ تلے لیٹنے سے رہے" لیڈر نے آہ بھری۔

"گنجائش ہی نہیں" شاعر نے کہا۔

"حوالدار صاحب، حوالدار صاحب، یہاں کہیں سایہ ہو گا؟" لیڈر نے پُوچھا۔

حوالدار نے سر نفی میں ہلا دیا "خو، یہ تو دوزخ ہے، دوزخ، بابو صاحب۔ یہاں سایہ کدھر سے آیا۔"

"چلو، یار۔ چار دن یہاں دوزخ میں رہنے کی ریہرسل ہی کر لیں گے" وٹ بولا۔

"چار دن ــــ؟" ڈرائیور غصّے سے چلّایا۔

"اوہ حوالدار، کہیں پانی ملے گا؟" شاعر نے پوچھا۔

"ہاں، ہاں" حوالدار بولا "وہ سامنے موڑ پر نالا ہے۔"

چینی کیمپ کے عین مقابل ایک بڑا نالا تھا۔ پانی اُوپر سے آتا اور ایک چھوٹے سے میدان میں جمع ہو جاتا، اور پھر نیچے گرتا، جہاں ایک وسیع چو بچہ سا بنا ہُوا تھا۔

پانی کو دیکھ کر سب نے چو بچہ میں چھلانگیں مار دیں۔ نہانے کے بعد ہوش آیا تو شاعر بولا "لیڈر، ایک پیالہ چائے کا مل جائے تو۔۔۔۔"

"خبردار، جو کسی نے گرم مشروب کا نام لیا تو" انجینیئر بولا "یہ جگہ تو خود چائے کی گرم کیتلی ہے۔ یہاں چائے کا نام نہ لو۔"

"وہ ہومیو پیتھی والے تو کہتے ہیں کہ گرمی کو گرمی کاٹتی ہے" وٹ بولا۔

"یار، چائے تو میں بنا دوں" لیڈر نے کہا "لیکن یہاں چُولھا جلانے کے لیے لکڑی کہاں سے ملے گی۔"

"ہاں، یار۔ یہاں تو گھاس کا تنکا تک نہیں جلانے کو۔"

"تو پتھر جلا لو" وٹ بولا۔ سب قہقہہ مار کر ہنسے۔

"ہنسنے کی بات نہیں، یار" وٹ بولا "کوئی نہ کوئی چڑنے کا پتھر مل ہی جائے گا۔"

"ہٹاؤ، یار، چائے کو۔ کچھ کھانے کو مل جائے۔ کوئی بسکٹ۔ کوئی پھل۔ کوئی چیز۔"

"ہاں، یار۔ سخت بھوک لگی ہے۔"

"ارے! وہ جو تافتانے ہیں ہمارے پاس" لیڈر چلّایا "جاؤ، یار، جاؤ۔ وہ تافتانوں کا پیکٹ تو اُٹھا لاؤ، جیپ میں ہے۔"

پانچ ایک منٹ کے بعد وٹ منہ لٹکائے تافتانوں کا تھیلا اٹھائے لوٹا "ارے یار، یہ تو بڑی ظالم جگہ ہے۔"

"کیوں؟ کیا ہُوا؟"

"ایسی ظالم گرمی ہے کہ گھی بھی اوپر سے ریٹ ہو گیا" دوٹ نے رونی آواز میں کہا۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ پراٹھے سوکھے ٹکڑے بنے ہوئے ہیں۔"

"ارے! سچ کہتے ہو کیا؟"

"چلو، سوکھے ٹکڑے پانی سے نگل لیں گے" لیڈر نے کہا۔

"اونہوں۔ یہ سوکھ کر کاٹھ نہیں بنے، پتھر کی سلیں بن گئے ہیں۔ پانی سے نگلیں نہیں جائیں گے" دوٹ بولا۔

ہر کسی نے ایک ایک ٹکڑا اُٹھا لیا۔

"اونہوں۔ یہ تو بالکل ہی کاٹھ بن گئے ہیں" انجینئر نے کہا۔

"یار، ہم کھائیں گے کیا؟" داستان گو نے پوچھا۔

"گرمی جو ہے، کھانے کو۔ گرمی کھاؤ۔ پانی پیو" دوٹ چہکا۔

"بکواس نہ کر" شاعر چلّایا۔

"کرنے دے، یار، بکواس" داستان گو بولا "اور یہاں کرنے کو ہے ہی کیا۔ اب کیا بکواس بھی نہ کرے؟"

"بی سیریس، بوائز" لیڈر بولا "نہ یہاں ہوٹل ہے، نہ دکان۔ نہ لکڑی ہے۔ جس سے چولھا جلایا جا سکے۔ پھر یہ بھی پتا نہیں کہ یہاں ہمیں کتنے دن رکنا پڑے۔"

"ہاں، یار۔ بات تو ٹھیک ہے" سب سنجیدہ ہو گئے۔

"بالکل غلط" دوٹ بولا "یار، ہم اکیلے تو نہیں۔ ہمارے ساتھ ڈیڑھ سو ٹرک ڈرائیور جو ہیں۔"

"ہاں، یار۔ وہ تو ہم بھول ہی گئے" لیڈر نے کہا۔

"مرگِ انبوہ ہے۔ جشن رہے گا" دوٹ بولا۔

شام کو جب ہم نالے سے باہر نکل کر سڑک پر آئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ واقعی جشن ہو رہا ہے۔ ہر ٹرک کے پہلو میں چولھا جل رہا ہے۔ توے پر پراٹھے پک رہے ہیں۔

"ارے!" داستان گو بولا "یہ تو جیسے برات اتری ہوئی ہے۔"

"خان صاحب" لیڈر ایک ٹرک ڈرائیور کی طرف لپکا "خان، یہ چولھا جلانے کو لکڑی کہاں سے لی؟"

"خو، ہم ساتھ لایا" وہ بولا "سب کچھ ساتھ لایا۔ لکڑی، آٹا، مسالا، مرغی، گھی۔ سب کچھ۔"

"ارے! لکڑی بھی ساتھ لایا؟" انجینئر نے پوچھا۔

"یہاں سب کچھ ساتھ لانا پڑتی ہے۔ میرے پاس پندرہ دن کا راشن ہے۔"

"اور ہمارے پاس پورے مہینے کا" دوسرا ٹرک ڈرائیور بولا۔

"ہمارے پاس بھی ہے" داستان گو نے سوکھے ٹکڑوں کا تھیلا ہلایا۔

"میں بتاؤں؟" وٹ بولا "ٹکڑے چباؤ اور پراٹھے سونگھو۔ پراٹھے کا مزا نہ آئے تو میرا ذمہ۔"

"ارے نہیں۔ ان کے مہمان بن جاؤ۔ یہ لوگ بڑے مہمان نواز ہوتے ہیں" شاعر نے کہا۔

"اس صورتِ حال میں نہیں ہوتے" ڈرائیور ہنسا۔

"ایک ایک ڈرائیور سے ایک ایک نوالہ مانگو تو . . . ." شاعر رُک گیا۔

کدو

"ارے! مانگنا نہیں" حوالدار نے ہمیں دھمکی دی "تم بابو لوگ ہمارے کیمپ میں ڈیرا لگاؤ۔ روٹی ہم دے گا۔ کدو خود پکاؤ۔ مسالا گھی بھی ہم دے گا۔"

"کدّو کدھر سے آئے گا؟"

"کدّو جتنا چاہو۔ فکر نہ کرو۔"

خان چلا گیا تو داستان گو نے کہا "یہاں تو گھاس کا پتا نظر نہیں آتا۔ کدّو؟ اور پھر جتنا چاہو؟"

"یار، اس نے دریا کی طرف اشارہ کیا تھا" انجینئر ہنسا۔

"بالکل ٹھیک۔ بالکل ٹھیک۔ چلو، دریا کا جائزہ لیں" لیڈر نے کہا۔

دریا کیمپ کے پیچھے تقریباً تین منزلیں نیچا تھا۔ اُدھر پتھروں پر ریت کے تودے لگے ہوئے تھے۔ جلی ہوئی چٹانوں کی بُو پھیلی ہوئی تھی۔ پھر بدبو کا ایک ریلا آیا۔

"ارے!" وٹ بولا "یہاں تو خالص کھاد کا ڈپو معلوم پڑتا ہے۔ ذرا دیکھو تو۔"

دیکھا تو فضلے کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔

"لو بھئی" وٹ چلایا "کھاد ہے تو کدّو بھی ہو گا۔"

دریا کے پاٹ پر موٹی ریت کی بیچ بچھی ہوئی تھی۔ سامنے ٹیلوں کی چوٹیوں پر جگہ جگہ ریت بچھی ہوئی تھی۔

"کمال ہے!" ڈرائیور نے کہا "پہاڑ کی چوٹیوں پر صحرا۔ ریت ہی ریت —— ریت ہی ریت!"

"ہاں، یار۔ یہ عجب بات ہے!" لیڈر نے جائزہ لیا۔

"ایولیوشن تو ٹھیک ہے، یار۔ مگر کدّو؟" شاعر بولا۔

"ارے! سانپ!" لیڈر بولا۔

دیکھا تو ہمارے قریب ہی ایک دو گز لمبا بھورا سانپ جا رہا تھا۔

سب اُٹھ کر بھاگے۔ وٹ سب سے آگے تھا۔

"بڑا بڑا سانپ ہے یہاں تو" انجینئر بولا۔

"یہاں سانپ نہ ہو گا تو کیا ہو گا۔ یہ پتھریلے پہاڑ، ریت کے تودے اور دریا"

ڈرائیور نے کہا۔

"ہاں، یار۔ جبھی اِدھر دریا کی طرف کوئی نہیں آتا" لیڈر بولا۔

"مل گیا! مل گیا!" دت کی آواز آئی۔

اُدھر کیمپ کے قریب وٹ کھڑا ہاتھ ہلا رہا تھا "مل گیا! بھئی، مل گیا!"

"کیا ملا؟ سانپ؟" شاعر نے پوچھا۔

"نہیں، یار، کدو" وٹ بولا۔

وہاں پہنچے تو دیکھا کہ ایک لمبی سی نالی میں، بیل پر، پندرہ بیس کدو لگے ہوئے تھے۔

"یار! اتنے بڑے کدو!" لیڈر نے حیرت سے کہا۔

"یہ مٹی میں نہیں اُگے ہوئے۔ خالص فضلے کی پیداوار ہیں" وٹ ہنسا "بڑے تو ہوں گے۔"

اب سوال یہ تھا کہ کدو پکائے گا کون؟

"لو، کدو پکانے میں کیا مشکل ہے۔ اور پھر یہ کدو۔ خاص کھاد میں اُگا ہوا کدو۔ بس ہنڈیا میں ڈالو اور پھر ہنڈیا اُتار لو۔ اللہ اللہ خیر سلا" وٹ نے کہا۔

"تو پھر یار، تم ہی پکا دو" ڈرائیور نے جواب دیا۔

"وہ رہا، باورچی خانہ" داستان گو بولا۔

وٹ دو منٹ کے بعد باورچی خانے سے باہر نکل آیا اور لمبے لمبے سانس لینے لگا۔

"کیوں؟ کیا ہوا؟" لیڈر نے پوچھا۔

"ہونا کیا ہے۔ بس پکا لیا کدو" انجینئر ہنسنے لگا۔

"نہ بھئی نہ" وٹ نے کہا "کدو پکانا تو مشکل نہیں، لیکن اس باورچی خانے

میں کھڑا ہونا دل گردے کا کام ہے۔ اندر جاؤ تو دم گھٹتا ہے۔"

"اور وہ جولانگری اندر کام کر رہا ہے؟" داستان گو نے پوچھا۔

"پسینے کا فوارہ چل رہا ہے۔ ہانڈی میں پانی ڈالنے کی ضرورت ہی نہیں" وٹ بولا۔

"اچھا، بھئی۔ میں تو چلا" ڈرائیور نے کہا "جب تک میں خیمے لگا لوں باہر میدان میں۔"

جب ہم خیمے لگا رہے تھے تو چینی کیمپ میں سے کسی کی نگاہ پڑ گئی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے سات آٹھ چینی ہمارے اِرد گرد آ کھڑے ہوئے۔ وہ بڑے غور سے خیموں کو دیکھنے لگے۔ نائیلون کی رسّیوں کا معاینہ کرنے لگے۔

وہ خیموں کو غور سے دیکھ رہے تھے اور آپس میں بحث کر رہے تھے۔ ان کی چی چی چُو چُو چن چو سے سارا گرد و پیش بھر گیا۔

"یار، یہ تو چڑیاں بول رہی ہیں" وٹ نے کہا۔

"بولنے دو" شاعر ہنسا۔

قریب ہی سے حوالدار کی آواز آئی "کوئی نئی چیز ہو، یہ چینی اُسے دیکھ دیکھ کر پاگل ہو جاتے ہیں۔ نئی مشین پر تو مکھیوں کی طرح بھنبھناتے ہیں۔"

"حوالدار، آپ ان کی بات سمجھتے ہیں کیا؟" داستان گو نے پوچھا۔

"ہمارے پلّے تو کچھ نہیں پڑتا، ہاں، اشاروں سے چھوٹی موٹی بات کر لیتے ہیں" حوالدار نے جواب دیا۔

خیمے گاڑنے کے بعد ہم نے باہر زمین پر بستر بچھائے اور لیٹ گئے۔ چار خیموں میں، تین باہر۔ اس وقت شام پڑ چکی تھی۔ سورج غروب ہو چکا تھا۔ اس کے باوجود پہاڑوں سے بھڑاس نکل رہی تھی۔ خنکی کا نام و نشان تک نہ تھا۔

"حوالدار صاحب، یہ جگہ اتنی گرم کیوں ہے؟" انجینئر نے پوچھا۔

"یہ تو جہنّم ہے، صاحب، جہنّم" حوالدار بولا "یہاں دن اور رات میں کوئی فرق

نہیں پڑتا۔ رات کے دو بجے جب پہاڑ ٹھنڈے پڑتے ہیں تو گرم لُو کی آندھی چلنے لگتی ہے۔"

"رات کے دو بجے گرم لُو؟" لیڈر نے کہا "وہ کس اصول کے تحت؟"

"یہاں اصول نہیں چلتے، صاحب" حوالدار نے کہا" گرم بگولے چلتے ہیں۔ ایک دن کے وقت، چار پانچ بجے، دُوسرا رات کو، دو تین کے قریب۔ ان بگولوں میں گرمی ہوتی ہے، اور ریت۔ منیلا سے لے کر چلاس تک ریت اُڑتی ہے۔ ساتھ چمک اور کڑک بھی ہوتی ہے۔ کبھی کبھار چار بوندیں بھی پڑ جاتی ہیں تو ایک ڈیڑھ گھنٹے کے لیے ٹھنڈ ہو جاتی ہے۔"

"یہاں سانپوں کی افراط ہے کیا؟" انجینئر نے پُوچھا۔

"سانپ تو ہیں۔ بہت ہیں۔ اُدھر دریا کی طرف" حوالدار بولا "زہریلے بھی ہیں۔ پر اُوپر نہیں آتے۔"

"اُوپر کیوں نہیں آتے؟" داستان گو نے پُوچھا۔

"کیسے آئیں؟ موسم کی وجہ سے سر چھپائے پھرتے ہیں، بگولوں میں ریت کی وہ مار پڑتی ہے کہ آنکھیں نہیں کُھلتیں۔ پھر اُوپر سے گرمی۔ اور صاحب، کھانے کو یہاں ہے کیا؟ نہ چوہا، نہ مینڈک سب بے چارے بھُوک کے ہاتھوں تنگ ہیں۔"

زندگی کا راز

شاعر نے قہقہہ لگایا۔

"تم ہنستا ہے، بابُو" حوالدار بولا "یہاں آٹھ دن رہو تو سمجھ میں آ جائے۔ جو ہم یہاں دو سال سے بیٹھا ہے اس جہنم میں۔"

"خان" ایک ٹرک ڈرائیور بولا "تو دو سال کی بات کرتا ہے، ام دس سال

سے اس سڑک پر چل رہا ہے۔ ہاں "

"تم چل رہا ہے، بیٹھا نہیں" خان بولا "بیٹھنے اور چلنے میں بڑا فرق ہوتا ہے "

"دیکھ، خان" ٹرک ڈرائیور نے حوالدار کو چھیڑا "جو جینا سیکھتا ہے تو چلنا سیکھو۔ ہم تو کہتا ہے، بابو، جو جینا سیکھنا ہے تو پہلے ٹرک چلاؤ۔ دو سال ٹرک چلاؤ تو پھر تم زندگی کر سکتے ہو۔ پھر کچھ فکر نہیں۔ غم تمھارے پاس نہیں آئے گا۔ خوشی تمھارا کچھ نہیں بگاڑے گی۔ دال کھاؤ گے تو یوں لگے گی جیسے پلاؤ ہو۔ کپڑا اچھا ہو، بُرا ہو، نیا ہو، پُرانا ہو۔ کچھ فرق نہیں پڑے گا۔ گرمی ہو یا سردی۔ برف پڑ رہی ہو۔ پڑی پڑے "

"تم کب سے اس سڑک پر چل رہے ہو؟" شاعر نے پُوچھا۔

"اپنی تو ساری زندگی ہی اسی سڑک پر گزری ہے۔ پہلے کلینر تھا، پھر ڈرائیور بن گیا۔ اب مالک ہوں، ٹرک کا۔"

"کسی اور سڑک پر کیوں نہیں چلتے؟" وٹ نے پوچھا۔

"اس سڑک کو چھوڑ کر کون جائے" ٹرک ڈرائیور ہنسا۔

"کیوں؟ اس سڑک میں کیا ہے؟" شاعر نے پوچھا۔

"اس سڑک میں یادہ سواد ہیں، بابو" ٹرک ڈرائیور ہنسا۔

"جہنم ہے، جہنّم" خان غصّے سے چلّایا۔

"جہنم بھی ہے، بہشت بھی ہے، حوالدار۔ ٹرک ڈرائیور جہنّم اور بہشت دونوں سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ اب دیکھ لو، سڑک چلتی رہے تو ٹھیک، رُک جائے تو ٹھیک۔ سب اچھا۔ دس دس دن رُکے رہتے ہیں، پر کبھی ملال نہیں آیا۔ دل میلا نہ ہوا۔ راشن ہو تو پراٹھے کھاتے ہیں، مرغی پکاتے ہیں۔ نہ ہو تو چنے چبا کے پانی پیا۔ اللہ اللہ خیر سلّا۔ بس بابو، یہی بھید ہے زندگی کا۔ دل تنگ نہ کرو۔ بس اتنی سی بات ہے۔ جو ہے اسے قبول کرو۔ جو نہیں، اُس کے خواب نہ دیکھو "

"بالکل یارا" داستان گو بولا "تُو نے صوفی کا بھید پالیا۔"

"صوفی ووفی کا تو اپنے کو پتا نہیں" وہ بولا "نہ ہی ولی کا پتا ہے۔ اور پتا لگا کر کرنا بھی کیا ہے؟" وہ اُٹھ بیٹھا "اچھا، حوالدار۔"

"کیسے آیا تھا؟" حوالدار نے پُوچھا۔

"اِدھر پانی لینے آیا تھا۔"

"نیند نہیں آئی کیا؟"

"تاش کی بازی چل رہی ہے" وہ بولا۔

"اس اندھیرے میں؟"

"لال ٹینیں جو ہیں۔"

"اور گرمی؟ اس گرمی میں تو جان نکل رہی ہے"، لیڈر نے کہا۔

"بابو، اپنی جان تو کب سے نکل چکی۔ سالی نکل گئی تو سکھی ہو گئے۔ ایک یہ حوالدار ہے کہ جان کو یوں مٹھی میں دبائے ہوئے بیٹھا ہے جیسے ہاتھ کا بٹیرا ہو۔ سالی کو ناز نعمت میں رکھو تو سر پر چڑھ جاتی ہے۔ عذاب بن جاتی ہے" وہ ہنستا ہُوا چلا گیا۔

"یار" انجینئر بولا "کیا بات کر گیا ہے، یہ ٹرک ڈرائیور!"

"ان کی بات نہ سنو، صاحب" حوالدار بولا "ان کا کیا اعتبار۔ آج یہاں، کل وہاں۔ پہیئے کی کمائی کھاتے ہیں۔ پہیئے پر چڑھے رہتے ہیں۔ جگہ جگہ کا پانی پیتے ہیں۔ ان کا کیا بھروسا۔"

گرمی کی وجہ سے رات بھر ہمیں نیند نہ آئی۔ پھر تیسرے پہر آندھی چلنے لگی، اور ہم نے منھ سر چادر میں لپیٹ لیا۔

چینی کیمپ

چینیوں کا کیمپ، بالکل ایسا تھا جیسے شہد کی مکھیوں کا گھروندا ہوتا ہے۔ ہر تفصیل

سوچی سمجھی ہوئی تھی۔

چینی ایسی جگہ کیمپ لگاتے ہیں جہاں پانی وافر ہو، اور وہ پانی چشمے کا ہو۔ دریا یا نالے کا نہیں۔ پہلے پانی کا معاینہ کرتے ہیں کہ صحت کے لیے موافق اجزا موجود ہیں یا نہیں۔ پھر بلندی پر کسی محفوظ جگہ ربڑ کی موٹی سی نال لگا دیتے ہیں اور بڑے بڑے بانسوں کی مدد سے نال کو سہارا دے دے کر کیمپ تک پہنچا دیتے ہیں۔ کیمپ میں پہنچ کر نال کا پانی دو حصوں میں بٹ جاتا ہے۔ ایک پینے کے لیے اور دوسرا برتنے کے لیے۔

پینے کا پانی سیدھا ایک حمام میں اکٹھا ہو جاتا ہے، جس کے نیچے ہر وقت آگ جلتی رہتی ہے۔ وہاں سے پانی کچن میں جاتا ہے اور باہر ایک ٹونٹی پینے کے لیے مخصوص کر دی جاتی ہے۔ کیونکہ چینی ٹھنڈا نہیں، گرم پانی پیتے ہیں۔

جب وٹ نے یہ سنا تو وہ چیخ اٹھا "نہیں، یار۔ میں نہیں مانتا۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ اتنی سمجھدار قوم اور ایسی حماقت کرے! بھلا گرم پانی پینے کی تک ہے کوئی؟"

"پی کے دیکھو تو پتا چلے" انجینئر بولا "پیٹ نہیں بڑھتا۔ جراثیم مر جاتے ہیں۔ معدے میں گڑبڑ نہیں ہوتی۔ بار بار پیاس نہیں لگتی۔"

"ہٹاؤ، یار" شاعر بولا "ہمیں دنیا بھر کی بیماریاں منظور ہیں، لیکن پینے کو ٹھنڈا پانی ملے۔"

نالے پر چینیوں نے ایک عام چوبچہ بنا رکھا تھا۔ اس چوبچے سے ایک دھارا بہتا تھا۔ دھارے کے سامنے ایک چھوٹی سی پن چکی لگی ہوئی تھی۔ اگر دھارا پن چکی کے پروں پر ڈال دیا جاتا تو دو چھوٹے چھوٹے پتھر کے پاٹ گھومنے لگتے۔ غالباً یہ آٹا یا چاول پیسنے کی مشین تھی۔

کیمپ میں ایک جنریٹر لگا ہوا تھا جو بجلی پیدا کرتا تھا۔ اس بجلی سے چھوٹے چھوٹے قمقمے روشن ہو جاتے۔ لیکن سارے کیمپ میں کوئی بجلی کا پنکھا نہ تھا۔

خیمے موٹی اور دوہری کینوس کے بنے ہوئے تھے، جو چاروں طرف سے بند تھے۔ پہلو

میں صرف ایک جالی دار کھڑکی تھی۔ خیمے کو دیکھ کر ہی شدّت سے گرمی لگنی شروع ہو جاتی۔ ان خیموں میں چینی قمیص اُتار کر ہلکی نکریں پہنے بیٹھے رہتے تھے۔ کھانے کے وقت گھنٹی بجتی اور وہ اپنی اپنی بالٹی اُٹھا کر لائن میں جا لگتے۔ صبح کے وقت کالی کالی کھیر سی کھاتے اور دوپہر کو چاول۔

چینی کیمپ کی ایک خصوصیت بڑی عجیب تھی۔ وہ گروپوں میں کام کرتے تھے۔ چلچلاتی دھوپ میں سڑک پر کھڑے ہو کر بلاسٹنگ کرتے۔ پھر سڑک کے پتھروں کو مشین سے ہموار کرتے۔ پھر خود ہاتھوں سے پتھر سڑک پر جماتے۔ لیکن اس دوران میں دیکھنے والے کو پتا نہ چلتا کہ کون کام کروا رہا ہے اور کون کام کر رہا ہے۔

کیمپ میں بھی ایک کڑا انتظام رائج تھا۔ لیکن پتا نہیں چلتا تھا کہ نظام کون چلا رہا ہے۔ عمل درآمد کی ذمّے داری کس کے سر پر ہے۔ لباس، انداز، طور طریقے سے وہ سبھی ایک سے نظر آتے تھے۔ نہ کوئی حاکم تھا، نہ محکوم۔ کیمپ میں کوئی خصوصی خیمہ نہ تھا جس سے پتا چلتا کہ یہ ناظم کا ہے۔

اس بات پر وٹ بڑا خشمگیں ہوا "لو، کوئی بات ہے" وہ بولا "یہ اپنے حوالدار ہی کو دیکھ لو۔ ایک میل دُور سے دیکھو تو بھی صاف پتا چل جاتا ہے کہ یہ حوالدار ہے، اور باقی سپاہی ہیں۔"

"بالکل پتا چل جاتا ہے" شاعر بولا۔

"ہر وقت اس کا ہاتھ مونچھ پر رہتا ہے" ڈرائیور بولا۔

"ہاتھ مونچھ پر نہ ہو، تب بھی پتا چل جاتا ہے" لیڈر نے کہا۔

"لیکن" وٹ چلّایا "ان چینیوں کا پتا ہی نہیں چلتا کہ کون حوالدار ہے، کون سپاہی ہے۔ خواہ مخواہ خلقِ خدا کو کنفیوژ کرتے ہیں۔"

چینی کیمپ میں ہر وقت ریڈیو لگے رہتے تھے۔ گمان غالب ہے کہ کیمپ میں

ایک بہت طاقت ور ریسیور لگا ہُوا تھا، جہاں سے ہر خیمے میں تار فٹ کر کے لاؤڈ سپیکر لگائے ہوئے تھے۔ صبح سویرے ہی چینی ریڈیو کی آوازیں کان میں پڑتیں۔

پہلی بار انھیں سن کر لیڈر گھبرا گیا۔ دوڑا دوڑا آیا۔ کہنے لگا "یار، تم تو کہتے تھے چینی کیمپ میں کوئی لڑکی نہیں"۔

"تو کیا غلط ہے؟" شاعر نے پوچھا۔

"ہاں، غلط ہے" پھر وہ قریب ہو کر زیرِ لب بولا "کیمپ میں ایک لڑکی ہے۔ سالوں نے اسے چھپا کے رکھا ہُوا ہے"۔

"تم نے اسے دیکھا ہے کیا؟" انجینیئر نے پوچھا۔

"دیکھا تو نہیں" لیڈر بولا۔

"ہاں" داستان گو مسکرایا "میں نے بھی اسے روتے ہوئے سُنا ہے۔ ہر خیمے کے لاؤڈ سپیکر سے اس کی آوازیں آتی ہیں"۔

"ارے بھائی، وہ تو ان کا ریڈیو ہے۔ کوئی گا رہی ہوگی" انجینیئر بولا۔

"اس طرح چیخیں مار مار کر گاتے ہیں کیا؟" لیڈر نے غصے سے کہا۔

"کل دو چینی ٹرک ڈرائیوروں کے اڈے پر پہنچے ہوئے تھے۔ ٹرک ڈرائیور ان سے چہلیں کر رہے تھے۔ ایک نے تو گال تک سہلائے۔ اس پر چینی طیش میں نہیں آئے بلکہ مسکرانے لگے" وٹ نے کہا۔

"یہ جو کام کر رہے ہیں، بہت چھوٹی عمر کے لڑکے ہیں" لیڈر بولا۔

"ہاں، ہاں۔ کھیلنے کودنے کے دن ہیں" داستان گو نے کہا۔

چینیوں کی ایک خصوصیت حیران کن تھی۔ اگرچہ وہ خود سڑک بنا رہے تھے، ساری ذمہ داری ان کے سر پر تھی، اس کے باوجود وہ انتظامی امور میں قطعی دخل نہیں دیتے تھے۔ اسی وجہ سے ہر چینی کیمپ کے ساتھ ایک پاکستانی یونٹ منسلک تھا۔ یہ

فوجی یونٹ پبلک سے رابطہ رکھتا تھا اور پاکستانی حکومت کے احکامات بجا لاتا تھا۔
چینیوں کا کام صرف سڑک بنانے تک محدود تھا۔

جہنّم

اس جہنّم میں ہم تین دن رُکے رہے۔ وہ صبح شام بھی عجیب صبح شام تھے۔
صبح سات بجے سے نو بجے تک اور رات کو نو بجے سے گیارہ بجے تک، صرف چار گھنٹے کے لیے اس تندور کی آگ میں کچھ تخفیف ہو جاتی۔ باقی وقت سورج سر پر آ کر یوں بیٹھ رہتا جیسے کلاہ ہو، اور پھر ہم سائے کے لیے ترستے۔

ان پہاڑوں میں کوئی ایسی کھوہ بھی نہ تھی جہاں کڑکتی دھوپ میں سر چھپایا جا سکتا۔ کوئی ٹنڈ منڈ درخت بھی نہ تھا۔ لہٰذا مجبوراً ہم نالے کے چو بچے میں جا کھڑے ہوتے۔ جب بھی دھوپ ناقابلِ برداشت ہو جاتی تو چو بچے میں ڈبکی لگا لیتے۔

اگر ٹرک ڈرائیور بھی ہماری طرح نالے میں پناہ لینے کا فیصلہ کر لیتے تو پھر مشکل ہو جاتی۔ نالے کے چو بچے میں بیک وقت زیادہ سے زیادہ دس بیس افراد سما سکتے تھے۔ وہاں ایک سو پچاس آدمیوں کی گنجائش نہ تھی۔

ٹرک ڈرائیور باری باری نالے پر آتے، ڈبکی لگاتے اور پھر اپنے اپنے ٹرک تلے لیٹ کر سو جاتے۔ اس لیے نالے میں مستقل طور پر رہنے والے صرف ہم سات تھے۔

ہر پندرہ بیس منٹ کے بعد سڑک سے اعلان سنائی دیتا "بلاسٹنگ، بلاسٹنگ"۔
ایک چینی دھوپ میں دوڑا دوڑا آتا "بلاسٹن، بلاسٹن"۔ اس پر نالے پر کھڑا سنتری شور مچا دیتا "خلاص، خلاص"۔ اور ہمیں مجبوراً نالے سے نکل کر سڑک پر جیپ کی اوٹ میں کوُر لینا پڑتا۔۔۔ وہاں دھوپ میں کھڑے کھڑے ہمارا مُرتا بن جاتا۔

بلاسٹنگ ختم ہوتی تو ہم دوڑے دوڑے نالے پر پہنچتے اور پانی میں ڈبکیاں

لگتے۔ بیس پچیس منٹ کے بعد پھر سے اعلان ہوتا: بلاسٹنگ، بلاسٹنگ۔ سنتری "خلاص، خلاص" چلاتا۔ اور ہمیں پھر سے چلچلاتی دھوپ میں کوُر لینا پڑتا۔

"یار، یہ اچھی پریڈ ہو رہی ہے 'اپنی'" وٹ چلاتا۔

"اپنا تو وہی حال ہو رہا ہے جو ٹینس کورٹ میں بال کا ہوتا ہے" شاعر ہنسا۔

"یار، کچھ کرنا چاہیے" لیڈر نے کہا۔

اس سنتری کو رام کرلو۔ کم از کم دوڑ بھاگ سے تو نجات ملے گی" انجینئر نے مشورہ دیا۔

سنتری کو بھی ہم سے بہت ہمدردی تھی، لیکن وہ بے چارہ مجبور تھا۔ کیونکہ چینی ہر وقت اس کے سر پر سوار رہتے تھے۔ پھر ایک ٹرک ڈرائیور آکر کہنے لگا "خو، بابو۔ کیوں خوامخواہ گرمی سردی کے چکر میں پڑا ہے۔ تاؤ کھا جائے گا تو تین مہینے چار پائی پر پڑا رہے گا۔"

"وہ کیا ہوتا ہے 'تاؤ'؟" وٹ نے پوچھا۔

"دیکھو، بابو۔ تم ادھر ٹھنڈے پانی میں ڈبکی لگاتا ہے، پھر اُدھر سڑک پہ دھوپ میں ہو کر کوُر لیتا ہے۔ پھر اِدھر آتا ہے۔ پھر اُدھر جاتا ہے۔ اس سردی گرمی سے تاؤ لگ جائے گا" ٹرک ڈرائیور بولا۔

"تو پھر کریں کیا؟" شاعر نے پوچھا۔

"اُدھر الائچی نالے میں جاکر چھپ جاؤ" ڈرائیور نے ہمیں آنکھ ماری۔

الائچی جھاڑیاں

"اُدھر کوئی اور نالا بھی ہے کیا؟" لیڈر نے پوچھا۔

"ہاں۔ آگے سڑک پر۔ ایک فرلانگ دور" ٹرک ڈرائیور نے زیرِ لب کہا۔

جب ہم الائچی نالے پر پہنچے تو بے حد مایوس ہوئے۔ وہ نالا نہیں تھا بلکہ نالی تھی۔

نہ چوبچہ، نہ دھارا۔

"ارے!" دفعتہً ڈرائیور چلایا "وہ دیکھو، وہ۔"

ہم نے اُدھر دیکھا تو حیران رہ گئے!

نالے کے اُوپر، ایک بڑے سے میدان میں، گہرے سبز رنگ کی چھتریاں لگی ہوئی تھیں۔ بالکل اس طرح جس طرح بڑے ہوٹلوں کے لان میں شام کے وقت رنگ دار چھتریاں لگادی جاتی ہیں۔

اُوپر گئے تو دیکھا کہ وہ جھاڑیاں تھیں۔ سارے میدان میں تقریباً بیس پچیس سبز جھاڑیوں کے جُھنڈ تھے۔ پتے بے حد سبز تھے۔ شاخیں خشک اور یوں مڑی تڑی ہوئی تھیں جیسے پُرانی رسیاں ہوں۔ نیچے رسیاں ہی رسیاں تھیں، اُوپر جھاڑ دار پتے۔ چار چار پانچ پانچ جھاڑیوں کا جُھنڈ چھتری کی شکل اختیار کیے ہوئے تھا۔

ایک چھتری کے نیچے چھ ٹرک ڈرائیور بیٹھے تاش کھیل رہے تھے۔ دوسری چھتری تلے چار آدمی سوئے ہوئے تھے۔ تیسری خالی تھی۔ ہم اندر اکڑوں داخل ہوئے۔ وہاں صرف لیٹنے یا بیٹھنے کی جگہ تھی۔ عجیب سی خنکی تھی وہاں۔

"واہ، بھئی واہ! کیا جگہ ہے!" لیڈر بولا۔

"ہم تو بھُولے ہی رہے۔ اس سائے کا تو جواب ہی نہیں۔"

"یار، یہ کیا الائچیوں کی جھاڑیاں ہیں؟" دت نے پُوچھا۔

"خوشبو تو الائچیوں کی ہی آرہی ہے" شاعر بولا۔

"بھئی، الائچی نالا جو نام ہے تو ضرور یہ الائچیوں کے پیڑ ہی ہوں گے" لیڈر بولا۔

"لیکن کوئی الائچی نظر نہیں آتی" انجینئر نے کہا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ الائچیوں کے پیڑ ہوں اور الائچی نہ لگی ہو؟" ڈرائیور بولا۔

"کیوں نہیں ہو سکتا؟ کیا تم نے مری کے راستے پر زیتون کے پیڑ نہیں دیکھے"؟ داستان گو بولا "اتنے سرسبز پیڑ ہیں کہ سبحان اللہ! لیکن گزشتہ نو سال سے پھل نہیں لگا۔"

"آب و ہوا موافق نہیں آئی ہو گی"، ڈرائیور بولا۔

"میں نے ایکسپرٹس سے بات کی ہے" داستان گو نے کہا "وہ کہتے ہیں، پھل اس لیے نہیں لگ رہا کہ پودوں کو آب و ہوا ضرورت سے زیادہ موافق آ گئی ہے۔ اس لیے پودے پل رہے ہیں، پھل نہیں دے رہے۔"

"یہ کیسی دلیل ہے؟" لیڈر نے غصے میں کہا۔

"وہ کہتے ہیں، پھل دار درخت کی بات الٹی ہے۔ اگر پودا روکھا سوکھا رہے تو پھل آتا ہے۔ اگر پودا پل کر بڑا ہو جائے تو پھل نہیں آتا" داستان گو نے کہا۔

"ارے او بے وقوفو! نالائقو!" میں غصے میں چیخنے لگا "دو دن مسلسل گرمی کھانے کے بعد ہمیں یہ الائچی نالے کا ٹھنڈا ٹھنڈا سایہ دستیاب ہوا ہے۔ ان سبز چھتریوں کی لذت کے بجائے، اللہ کا شکر ادا کرنے کے بجائے، تم یہ جھگڑا لے بیٹھے ہو کہ ان جھاڑیوں پر الائچیاں کیوں نہیں لگتیں۔ یار، تم واقعی سچے اور کھرے دانش ور ہو۔"

"ہاں، یار۔ ٹھیک کہتا ہے یہ" وٹ بولا۔

"چلو، اب دو منٹ کی خاموشی سادھ کر شکر ادا کرو" شاعر نے ہنس کر کہا۔

"ابھی آدھ منٹ ہی گزرا تھا کہ بلاسٹن بلاسٹن کی آواز آئی۔

"ابے احمقو! وٹ چلایا "ہمیں شکریہ تو ادا کر لینے دو۔ پھر بلاسٹنگ کرنا۔"

"خلاص، خلاص"، سنتری چلایا۔

"جا، جا بے" تاش کھیلنے والے ٹرک ڈرائیوروں نے سنتری کو ڈانٹا "بڑا آیا ہے بلاسٹنگ کا چچا"۔ سنتری ان کے تیور دیکھ کر پیچھے ہٹ گیا۔

"ویٹ اِن دی سُپر ہٹ" شاعر نے تالی بجائی۔

"ہم بھی یہاں سے نہیں ہٹیں گے" لیڈر بولا۔

اتنے میں دو چینی آ گئے "چائیں چائیں چِہ چن چِہ" وہ چلائے۔

"بالکل درست کہتے ہو" انجینئر بولا "ہم یہاں سے نہیں ہٹیں گے۔"
چینی ہماری چھتری کے قریب آ کر کھڑے ہو گئے۔ اُدھر ٹرک ڈرائیور چلّائے کہ سنتری انھیں سمجھاؤ۔ جب قضا آئے گی تو کوئی روک نہیں سکے گا۔ اگر پتھر لگنا ہے تو لگنا ہے۔
"ہاں" دوسرا بولا "وہ عجب خان ٹرک تلے لیٹا ہُوا تھا۔ پتّھر ٹرک کی چادر توڑ کر اس کے سر پر جا گرا۔ بے چارہ مر گیا۔ خو، یہ تو نصیب کی بات ہے۔"
"او نہوں۔ چینی یہ بات نہیں سمجھتا" سنتری بولا "یہ چینی لوگ نصیب کو نہیں مانتا۔ تم ادھر سے خلاص کرو، بابُو۔ جلدی۔"
لیکن ہم ڈھیٹوں کی طرح چھتری تلے پڑے رہے۔
ہر چند منٹوں کے بعد چینی چلّا کر چیں چیں کرتے اور پھر خاموشی سے ہمیں گھورنے لگتے۔
"ارے، یار" شاعر بولا "یہ تو نگاہوں کی چاندماری کرتے ہیں۔"
"ان کی خاموشی تو خود پتّھر کی طرح بوجھل ہے" لیڈر ہنسا۔
ہم چینیوں کی اس چاندماری کو زیادہ دیر برداشت نہ کر سکے، اور مجبوراً اُٹھ کر ٹیلے سے نیچے اُترنے لگے۔ ٹرک ڈرائیور بھی گالیاں دیتے ہُوئے بھاگ رہے تھے۔
جب بلاسٹنگ ختم ہُوئی تو انجینئر بولا "یارو، وہیں چلتے ہیں، الائچی نالے کی چھتریوں تلے۔"
"ہٹاؤ، یار" ڈرائیور نے کہا "جب تک ہم وہاں پہنچیں گے تو پھر بلاسٹنگ بلاسٹنگ ہو جائے گا۔"
"ہاں، یار۔ اتنی دُور جانے کا فائدہ؟" وٹ چلّایا۔

منقار زیرِ پَر

تین دن ہم الائچی نالے پر پڑے میں لگے رہے۔ کبھی نالے کی طرف بھاگتے، کبھی

کوزہ لینے جیپ کی طرف دوڑتے۔ گرمی اتنی شدید تھی کہ ہمارے دماغ دُھواں دے رہے تھے۔ جسم تپ رہے تھے۔ مزاج چڑچڑ کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ وِٹ مزاح کی بات کرتا تو لیڈر غصّے سے لال پیلا ہو جاتا "خبردار! جو وِٹ کی بات کی تو۔ میں تمہیں اُٹھا کر نیچے کھڈ میں پھینک دوں گا۔"

"بالکل ٹھیک ہے" شاعر کہتا "اس احمق کو اتنا بھی پتا نہیں کہ ہنسی مذاق کی بات پُرسکون فراغت میں چلتی ہے، ان حالات میں نہیں۔"

اُدھر داستان گو غصّے میں کھول رہا تھا "یار، یہ بتاؤ کہ ہم میں سے وہ کون تھا جس نے کہا تھا کہ شاہراہِ ریشم مخملی سڑک ہے؟"

انجینئر کہہ رہا تھا "کیوں نہ ہم یہیں سے واپس ہو جائیں؟"

ڈرائیور چلّاتا "فی الحال تو آندھی کی بات کرو، بھائی۔ تین بج گئے ہیں۔ اب بگولا چلے گا۔"

بگولے کا نام سُن کر ہمارے دل بیٹھ جاتے۔ جب بگولا چلتا تھا تو ہمارا دم گھٹنے لگتا۔ جسم پر گرم ہوا کوڑے برساتی۔ جی چاہتا کہ موٹے گرم کپڑے لپیٹ کر خود کو ان کوڑوں سے محفوظ کر لیں۔ کھانے پینے کے سلسلے میں بھی ہم بہت دُکھی تھے۔ چائے پینے کو جی چاہتا۔ بڑی شدّت سے جی چاہتا۔ لیکن پہلا گھونٹ بھرتے تو جی متلانے لگتا۔ یوں محسوس ہوتا جیسے کانٹے نگل گئے ہوں۔ رہا کھانا تو پہلے دن تو کدّو ہم نے بڑے شوق سے کھایا تھا۔

"یار، اتنا اچھا! اتنا نرم کدّو!"

"بھئی، مٹی کا کدّو نہیں، خالص کھاد کا کدّو ہے۔"

لیکن دوسرے دن وِٹ چیخنے لگا۔ لبلا "آہاہا! کتنا نرم ہے۔ بالکل حلوے کی طرح۔ اور کتنا اچھا ہے۔" پھر وہ رونی آواز میں چلّایا "یہ کدّو ــــ"

اس کے بعد وہ کدّو جو خالص کھاد میں اُگا تھا عام کدّو بن کر رہ گیا۔

تیسرے دن ہماری کیفیت یہ ہوگئی کہ بات بات پر ایک دوسرے سے الجھنے لگے۔ ایک دوسرے کی بات ہمیں بری لگنے لگی۔ شاعر کے قہقہے میں تلخی ابھر آئی۔ داستان گو کی داستانیں مدھم پڑتی گئیں۔ ڈراٹیور کی ایوولیوشن ریوولیوشن میں بدل گئی۔ ادھر حوالدار ہمیں گھور گھور کر دیکھنے لگا۔ روٹی پکانے والے لانگری کی نگاہوں میں غیظ و غضب ابھر آیا۔

اگر ہم ایک دن اور وہاں رکے رہتے تو پتا نہیں کیا ہو جاتا۔ لیکن ہماری خوش قسمتی کی وجہ سے تیسرے دن شام کے وقت دفعتہً اعلان ہوا کہ سڑک کھل گئی ہے۔

پہلے تو ہمیں یقین ہی نہ آیا۔ وٹ بولا "یار، ان سے کہو کہ ہم سے مذاق نہ کریں۔"

"ہاں، ہم پہلے ہی جلے بھنے بیٹھے ہیں" لیڈر بولا۔

پھر حوالدار آ گیا۔ بولا، "صاحب راستہ کھل گیا ہے۔"

"اونہوں۔ اس کا بھی اعتبار نہیں رہا" داستان گو بولا۔

"ہاں، یار۔ یہ تو ہمیں کدو چور سمجھتا ہے نا" شاعر نے کہا۔

"ٹھیک تو ہے۔ روز اس کے دو کدو ضائع ہو رہے ہیں" انجینئر بولا۔

اور آٹے کی بات کرو" داستان گو نے کہا۔

پھر دفعتہً ایک شور اٹھا۔

ڈیڑھ سو ٹرک سٹارٹ ہو کر گھاؤں گھاؤں کرنے لگے۔

"ارے!" ہم سب اٹھ کر جیپ کی طرف بھاگے۔ عین اسی وقت بعد دوپہر کا بگولا چلنے لگا۔

جب ہم الاچی نالے سے روانہ ہوئے تو ساری فضا بگولے کی وجہ سے دھواں دھار تھی۔ ریت اڑ رہی تھی۔ ہوا چیخیں مار رہی تھی۔ وادی پر خوفناک قسم کی وحشت طاری تھی۔ ایسے لگتا تھا جیسے بھتنے بیدار ہو گئے ہوں۔ وہ ہم کو

اپنے دیس سے نکالنے کے لیے ہمارے پیچھے دوڑ رہے ہوں، اور ہم پر ریت اور پتھر برسا رہے ہوں۔

اس وقت منظر اتنا خوف ناک تھا کہ ہم محسوس کر رہے تھے کہ ہم کوئی قبیح جرم کر کے بھاگ رہے ہیں، اور شیطانی طاقتیں ہمیں بھاگنے سے روک رہی ہیں۔

سڑک پر چینی مزدور ہاتھ ہلا رہے تھے۔ ساتھ ہی حوالدار حسرت ناک نگاہوں سے ہمیں دیکھ رہا تھا۔ لیکن اس کا ہاتھ مونچھ پہ تھا۔ رسی جلی ہوئی تھی، پر بل بڑھتا جا رہا تھا۔

چلاس

آسیب زدہ گھاٹی

الاچی نالہ سے انخلا کی وہ شام میں زندگی بھر نہیں بھول سکوں گا۔ چٹیل پہاڑوں سے گھری ہوئی وہ تنگ تاریک گھاٹی۔ وہ تند و تیز جھکڑ جو ریت پچکاری سے گویا ہولی کھیل رہا تھا، اور جس نے فضا کو تیرہ و تار بنا رکھا تھا۔ پھر وہ شام کا دھندلکا جس میں پتا نہیں چل رہا تھا کہ پہاڑ کدھر ہے اور کھائی کس طرف۔ اُوپر سے سیٹیاں بجاتے ہوئے بھتنے جو اس آسیب زدہ گھاٹی میں ہمارا پیچھا کر رہے تھے۔ اور وہ ڈیڑھ سو ٹرک جو ہمارے عقب میں گھاؤں گھاؤں کر کے چیخ رہے تھے، چلّا رہے تھے۔

مجھے ایسے لگ رہا تھا جیسے وہ کوہستان نہ ہو بلکہ الف لیلہ کا کوہِ ندا ہو۔ کوئی پُراسرار آواز ہمیں پکار رہی تھی اور ہم عالمِ دیوانگی میں، کسی سحر کے زیرِ اثر، موت کی وادی کی طرف کھنچے جا رہے تھے۔

میں نے دہشت کے مارے آنکھیں بند کر لیں۔ جیپ پر موت کی سی خاموشی طاری تھی۔

صدیاں بیت گئیں۔

آخروٹ کی آواز نے وہ دہشت ناک طلسم توڑا "ارے!" وہ چلّایا "یہ سڑک کو کیا ہوا؟"

"کیا ہوا؟" لیڈر نے پوچھا۔

"بھئی، کوئی گڑبڑ ہے" وٹ بولا

"کیسی گڑبڑ؟" شاعر نے پوچھا۔

"بھئی، یہ سڑک تو چلنے لگی ہے۔ باقاعدہ چل رہی ہے۔ وہ دیکھو، سپیڈو میٹر۔" اس نے ٹارچ کی روشنی میٹر کی طرف موڑ دی "ہم تو تیس میل کی سپیڈ پر جا رہے ہیں۔"

"ہاں، یار۔ سڑک تو پھر سے ریشمی ہو گئی" میں نے کہا۔

"خبردار!" داستان گو غرایا "خبردار جو کسی نے اس سڑک کو ریشمی کہا۔ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔"

"بالکل ٹھیک ہے" شاعر بولا "اس سڑک کا کوئی بھروسا نہیں۔"

"سالی کبھی مخمل بچھا دیتی ہے، کبھی کانٹے" وٹ ہنسا۔

"ہنسو نہیں" لیڈر غرایا۔

"کیوں؟ ہنسیں کیوں نہیں؟" انجینئر بولا۔

"کمینو!" لیڈر نے دونوں ہاتھ اٹھا کر ہمیں ڈانٹا "جو جو کچھ تم پر بیتی ہے، اگر تم میں ذرا بھی غیرت ہوتی تو یوں کھی کھی نہ کرتے۔"

"ہاں، بھئی۔ ٹھیک کہتا ہے یہ" شاعر بولا "کم از کم چار ایک دن کے لیے تو ہنسی کا فور رہنی چاہیے۔"

"دقت یہ ہے" داستان گو نے کہا "کہ تم سب بے غیرت ہو۔ کیوں ڈرائیور؟ یہ بے غیرت ہیں نا؟ غیرت مند صرف ڈرائیور ہے اور میں ہوں۔"

"یہ کیا کہہ رہا ہے، ڈرائیور؟" لیڈر نے پوچھا۔

"خاموش!" ڈرائیور نے وہیل سے منھ موڑے بغیر کہا "مجھے نہ بلاؤ۔ میں پھانسی پر لٹکا ہوا ہوں۔ اس سے زیادہ مشکل ڈرائیونگ نہ میں نے کبھی کی ہے، نہ پھر کبھی موقع ملے گا۔

اگر یہاں سے بچ نکلے تو۔"

"ہاں، یار۔ اسے نہ بُلاؤ" لیڈر بولا۔

"اور مجھے بھی نہ بُلاؤ" داستان گو نے کہا۔

"کیوں؟ تو بھی پھانسی پر لٹکا ہُوا ہے کیا؟" انجینئر نے پُوچھا۔

"میں پھانسی پر نہیں لٹکا ہُوا" داستان گو نے جواب دیا "لیکن اگر کسی نے مجھے بُلایا تو میں اُسے پھانسی پر لٹکا دوں گا۔ ڈرو، میرے مُوڈ سے ڈرو۔"

"ہاں، بھئی۔ اس کے موڈ سے ڈرو" وٹ ہنسا "اسے کہتے ہیں غیرت مند موڈ۔"

"ہوٹل آ گیا، ہوٹل۔ سازین کا ہوٹل ــــ رُک جاؤ۔ رُک جاؤ" لیڈر چِلّایا۔

ڈرائیور نے اس کی بات اَن سُنی کر دی۔ اُلٹا گاڑی کی سپیڈ تیز کر دی۔

"یہ ہوٹل تھا کیا؟" وٹ بولا۔

"ہوٹل نہیں تو اور کیا تھا؟" لیڈر چِلّایا "بھئی، سازین کا ہوٹل تھا۔"

"یہ تو بالکل دم گھُٹت تھا، جیسے مال خانہ ہو" داستان گو بولا۔

"کیا مطلب؟"

"مال خانے میں نہ در ہوتا ہے نہ دریچہ" داستان گو نے وضاحت کی۔

"ہاں، یار۔ اس ہوٹل کے باہر برآمدہ بھی تو نہ تھا" شاعر نے کہا۔

"تو پھر یہ ہوٹل کیسے ہو سکتا ہے؟" انجینئر بولا۔

"یار، تم سارے ہی احمق ہو" داستان گو ہنسا "جس علاقے میں دن میں دو بار جھکڑ چلتا ہو، مَنوں ریت اُڑتی ہو، وہاں ہوٹل دم گھُٹت نہ ہو گا تو کیا بارہ دری قسم کا ہو گا۔"

"ہاں، یار۔ بات تو ٹھیک ہے" لیڈر نے کہا۔

مُغلیہ دسترخوان

"چُپ چاپ بیٹھے رہو۔ ایسے مقبرہ نما ہوٹل کے اندر جانے سے تو بھوکا رہنا کہیں

بہتر ہے" ڈرائیور بولا۔

یہ سن کر سب خاموش ہو گئے۔

"ہاں، بھئی" وِٹ نے زیرِ لب کہا "اس ٹرپ کا ایک فائدہ ضرور ہوا ہے کہ ہمیں بھوکے رہنے کی عادت ہو گئی ہے۔"

"ابے" لیڈر بولا "ایک بار چلاس پہنچ لو۔ ایسا کھانا کھلاؤں گا کہ تمھیں مغلیہ دور کا دسترخوان یاد آ جائے گا۔"

"ہاں، ہاں۔ دیکھو، فی الحال خواب دیکھو۔ مغلیہ دور کے دسترخوان کے خواب دیکھو۔ وقت کٹی کا یہ لاجواب نسخہ ہے" ڈرائیور بولا۔

"کیوں بے، لیڈر؟" انجینئر بولا "تو خواب دکھا رہا ہے ہمیں کیا؟"

"کیوں نہ دکھائے، خواب" شاعر نے کہا "ہر لیڈر کا فرضِ اوّلین ہے کہ قوم کو خواب دکھائے۔"

"وہاں پہنچ گئے، چلاس میں، پھر دیکھنا۔ خواب دکھا رہا ہوں یا حقیقت" لیڈر بولا۔

"وہاں ہے کون جو مغلیہ دور کا کھانا کھلائے گا؟" داستان گو نے پوچھا۔

"میرا ایک دوست ہے" لیڈر نے فخر سے سر اٹھا کر کہا۔

"تیرا دوست مغلوں کا باورچی رہا ہے کیا؟" داستان گو نے پوچھا۔

"میرا دوست ہیڈ ماسٹر ہے" لیڈر بولا "ہائی سکول کا ہیڈ ماسٹر۔"

شاعر قہقہہ مار کر ہنسا۔ بولا "ماسٹر کے پاس بے شک حکومت ہوتی ہے، لیکن کھانے کو روٹی نہیں ہوتی۔"

"تجھے کیا پتا، ان علاقوں میں ماسٹر کس قدر اثر و رسوخ والے ہوتے ہیں" لیڈر نے کہا۔

"اثر و رسوخ والے لوگ تو دعوتیں کھاتے ہیں، کھلاتے نہیں" داستان گو نے جواب دیا۔

"بالکل، بالکل۔ کھلاتے تو وہ ہیں جو اثر و رسوخ والے نہ ہوں" انجینئر ہنسا۔

"میں کہتا ہوں ہم چلاس جائیں ہی کیوں ؟" ڈرائیور بولا۔

"کیا مطلب ؟ ظالم، تو نے تو سارا مغلیہ دستر خوان اُلٹ کر رکھ دیا" وٹ چلایا۔

"یار، چھوڑو" ڈرائیور نے کہا "ہم رات کے دو بجے کے قریب چلاس پہنچیں گے۔ اس وقت خوامخواہ خراب ہوں گے۔ چلو سیدھے گلگت چلتے ہیں۔ صبح سویرے گلگت پہنچ جائیں گے۔"

"یہ نہیں ہو سکتا" لیڈر غصے میں چیخا۔

"کیوں نہیں ہو سکتا ؟" ڈرائیور بولا "چلاس جانے کے لیے ہمیں شاہراہ سے اُتر کر چار پانچ میل کا چکر کاٹنا پڑے گا۔"

"یہ اس لیے نہیں ہو سکتا" انجینئر نے کہا "کہ لیڈر کی عزت پہ حرف آتا ہے۔"

"مغلیہ دستر خوان کو چھوڑ کر جانا کفرانِ نعمت ہے" شاعر ہنسا۔

"دیکھ، لیڈر!" ڈرائیور نے کہا "میں تیرے بھلے کی کہتا ہوں۔ کیوں خود کو امتحان میں ڈالتا ہے تُو ؟"

"کیا مطلب ؟" لیڈر غرّایا۔

"ہاں، بھئی" وٹ بولا "اپنی عزت اپنے ہاتھ ہوتی ہے۔"

بل اور بوٹیاں

"روکو ! روکو !" لیڈر چلّایا۔

"وہ کس لیے ؟" میں نے پوچھا۔

"وہ دیکھو۔ برآمدے والا ہوٹل آ گیا" لیڈر بولا "وہ دم بخت قسم کے ہوٹل ختم ہو گئے۔"

"عجیب آدمی ہو !" شاعر بولا "ایک طرف چلاس میں مغلیہ دستر خوان کے خواب دکھا

رہے ہو، دوسری طرف برآمدے والے ہوٹل پر رُکنے کو کہہ رہے ہو۔"

"ہاں بھئی، یہاں رُک کر کرو گے کیا؟" انجینئر نے پوچھا۔

"روکو، روکو!" لیڈر چلّایا "ورنہ میں چھلانگ لگا دوں گا۔"

"ارے، ارے! وہ چھلانگ لگانے لگا ہے۔" سب چیخنے لگے۔

گاڑی رُک گئی۔ سب اُتر آئے۔

"بول، اب کیا کرے گا؟" شاعر نے لیڈر سے پوچھا۔

"بھئی، بیٹھیں گے، پانی پئیں گے، چائے کا دَور چلے گا، اس بھتنوں کی گھاٹی سے نکلنے کی خوشی میں" لیڈر نے جواب دیا۔

وہ ایک صاف ستھرا اور کھلا ہوٹل تھا۔ سامنے چار ایک ٹرک کھڑے تھے۔ برآمدے میں چھ سات آدمی بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ برآمدہ ایک منزل اُونچا تھا۔ قریب ہی ایک نالا بہہ رہا تھا۔

ہوٹل میں ہم سب چارپائیوں پر لیٹ گئے۔

"پانی لاؤ، بھئی، پانی۔"

"لڑکے، جلدی سے چائے بنا دے۔"

"کیوں بھئی، کھانے کو کیا ملے گا؟"

ہر کوئی آرڈر دینے لگا۔

"غلط، بالکل غلط" لیڈر غرّایا "صرف لیڈر آرڈر دے گا۔ بولو، کیا کھاؤ گے؟"

"کدّو" وٹ چلّایا۔ سب قہقہہ مار کر ہنس دیے۔

"یار، ہنستے کیوں ہو؟ تین روز، صبح شام، کدو کھا کھا کر مجھے کدو کھانے کی عادت پڑ گئی ہے۔ اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟" وٹ نے خود پر مظلومیت طاری کر کے کہا۔

"صاحب" ہوٹل والا داخل ہو کر بولا "مرغی کٹوا دوں؟"

"ہاں، ہاں۔ کٹوادو" داستان گو نے کہا "اب بنے گی۔ رات بارہ بجے چڑھے پر رکھو گے۔ انشاء اللہ صبح سویرے گل جائے گی۔ کھا کر ہم کل دوپہر کو یہاں سے چل پڑیں گے۔ کیوں، لیڈر؟"

"بھئی، مرغی ہے، پائے تو نہیں" شاعر بولا۔

"بھئی، سات ہزار کی بلندی پر بیٹھے ہیں۔ یہاں تو ٹماٹر بھی دو گھنٹے میں گلتا ہے" داستان گو نے کہا۔

"مرغی دکھاؤ، مرغی دکھاؤ" لیڈر چلّایا۔

جب ہوٹل والا مرغی لے کر آیا تو سب اُٹھ کر بیٹھ گئے "ارے! یہ مرغی ہے کیا؟"

"لگتا تو شکرا ہے" شاعر نے کہا۔

"اتنی بڑی مرغی!" انجینئر بولا۔

"یہ تو بکرے کی ماسی نظر آتی ہے" ورٹ ہنسا۔

"دیکھو، خان" داستان گو نے کہا "اس مرغی کو ہنڈیا میں ڈالو۔ اس کا شوربا بناؤ۔ پھر شوربا مجھے ڈونگے میں ڈال دو اور بوٹیاں ان سب صاحبوں میں بانٹ دو۔"

"مطلب کیا ہے، تمہارا؟" سب پنجے جھاڑ کر داستان گو کے پیچھے پڑ گئے۔

"مطلب یہ ہے کہ میں تو ویجی ٹیرین ہوں۔ شوربے پر گزارہ کر لوں گا۔ تم سب گوشت خور ہو۔ تم گوشت کھا لینا۔"

"بالکل غلط" لیڈر چلّایا "دیکھو، خان۔ مرغی کاٹو، مسالا لگاؤ اور بھون دو۔ سمجھے؟"

"بالکل ٹھیک" داستان گو نے کہا "پھر بل ہم سے وصول کر و اور بوٹیاں پیچھے آنے والے ٹرکوں کے ڈرائیور کھائیں گے۔"

داستان گو نے سچ کہا تھا۔ جب بھُنی ہوئی مرغی سامنے آئی تو سب کے دانت کھٹے ہو گئے۔ ہم نے بل ادا کیا، بوٹیاں پیچھے آنے والے ٹرک ڈرائیوروں کے چھوڑ دیں،

اور سفر پہ روانہ ہو گئے

مستقل مہمان

جب ہم چلاس پہنچے تو رات کے دو ڈھائی بجے تھے۔ ہمارے سامنے ایک کھلا ریتلا میدان تھا جس کے ایک طرف چار ایک ٹوٹی پھوٹی دکانوں کا بازار تھا۔

"ارے! یہ ہے چلاس!" وٹ چلایا "اس سے تو وہ ہوٹل ہی زیادہ آباد تھا۔"

میدان میں چارپائی پر سوئے ہوئے ایک شخص کو ہم نے جگایا۔ وہ آنکھیں ملتا ہوا اٹھا۔

"کیوں میاں، ہیڈ ماسٹر صاحب کہاں رہتے ہیں؟" لیڈر نے پوچھا۔

اُس نے اُنگلی سے مشرق کی طرف اشارہ کیا، اور پھر لیٹ کر سو گیا۔

ہم مشرق کی طرف چل پڑے۔ بہت دیر میدان میں گھومتے رہے۔ کوئی سڑک نظر نہ آئی تو پھر وہیں آ کر اس شخص کو جگایا "میاں، ریسٹ ہاؤس کدھر ہے؟" اس نے اُٹھ کر پھر مشرق کی طرف اشارہ کیا، اور پڑ کر سو گیا۔

ہم پھر مشرق کی طرف چل پڑے۔ اتفاقاً ایک سڑک نظر آئی۔ نیم پختہ اور تنگ۔ دیر تک ہم اس سڑک پر مارے مارے پھرتے رہے۔ آخر ریسٹ ہاؤس مل گیا۔ اندر داخل ہوئے تو وہاں کوئی چوکیدار نہ تھا۔ چلا چلا کر ہار گئے۔ آخر کار ایک شخص باہر نکلا۔ بولا "یہاں بالکل جگہ نہیں ہے۔ شور نہ مچاؤ۔" یہ کہہ کر وہ اندر چلا گیا۔

"یہ کون تھا؟"

"اہلکار تو نہیں لگتا تھا۔"

"سلیپنگ سوٹ تو کسی رئیس کا تھا۔"

"انداز غنڈے کا تھا۔"

ابھی ہم باتیں ہی کر رہے تھے کہ ایک آدمی آگیا۔ کہنے لگا "ریسٹ ہاؤس لگا ہوا ہے، جی۔"

"کون ٹھہرا ہوا ہے، اُدھر؟"

"اُدھر افسر لوگ رہتا ہے" اجنبی نے کہا۔

"کتنے دن ٹھہرے گا؟"

"ٹھہرا ہوا نہیں۔ وہ اُدھر ہی رہتا ہے" اجنبی بولا۔

ہیڈ ماسٹر

ریسٹ ہاؤس سے نکل کر جب ہم گاڑی میں بیٹھے تو ڈرائیور بولا "دیکھ لو، تین بج گئے ہیں۔ کیوں ہیڈ ماسٹر کو ڈھونڈنے میں وقت ضائع کر رہے ہو؟ چلو سیدھے گلگت چلتے ہیں۔"

لیڈر تڑپ کر گاڑی سے نیچے اُتر گیا "تم یہاں بیٹھو۔ میں ہیڈ ماسٹر کو تلاش کرتا ہوں۔"

"پاگل ہو گئے ہو کیا؟"

"ہاں، پاگل ہو گیا ہوں" لیڈر یوں چلّایا جیسے آسیب زدہ ہو۔

"یار، اسے کیا ہو گیا ہے؟"

"بھئی عزت کا معاملہ ہے۔ پرسٹیج کا سوال ہے" دٹ زیرِ لب بولا۔

"میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ یہ رات کے تین بجے اس تنگ و تاریک سڑک پر کیسے ہیڈ ماسٹر کا گھر ڈھونڈے گا!" ڈرائیور نے کہا۔

"اس کی کوئی بات بھی سمجھ میں آسکی ہے آج تک؟" میں نے کہا "چودہ سال محبوبہ کے رُوبرو بیٹھا رہا۔ سامنے بیٹھ کر روتا رہا۔ لیکن اسے اپنا دُکھ نہیں بتایا۔"

"کمال اس کا نہیں، محبوبہ کا تھا" انجینئر بولا "سالی کو سب پتا تھا۔ لیکن اس نے نہیں جتایا کہ مجھے پتا ہے۔ چودہ سال پوچھتی رہی کہ بات کیا ہے۔"

"ایمان سے، کیا عظیم داستانِ عشق ہے" داستان گو بولا "چودہ سال تخلیے میں ایک دُوسرے کے آمنے سامنے بیٹھے رہے۔ ایک دوسرے کے آنسو پونچھتے رہے کہ تجھے کیا دُکھ ہے۔"

"واہ وا! واہ وا!" ڈرائیور بولا "بڑا بڑا کردار پڑا ہے، اللہ کی دُنیا میں۔"

"سبحان اللہ! عشق بھی کیا رُوپ دھارتا ہے" داستان گو نے کہا۔

"مل گیا! مل گیا!" دُور سے لیڈر کی آواز آئی۔

"کیا مل گیا، بھئی اِسے؟"

"ہیڈ ماسٹر کا گھر مل گیا۔"

"اونہوں۔ گھر نہیں گھر کا پتا مل گیا ہو گا۔"

"آجاؤ، آجاؤ" لیڈر کی آواز سنائی دی۔

سامنے دیکھا تو سڑک کے درمیان کوئی لالٹین جھلا رہا تھا، جیسے ریلوے گارڈ بتی جھلاتے ہیں۔

"لو بھئی، گھر کا پتا نہیں بلکہ گھر ملا ہے۔"

"وہ کیسے؟"

"اس لیے کہ لالٹین جھلائی جا رہی ہے۔"

جب ہم لالٹین کے پاس پہنچے تو دیکھا کہ لیڈر کے ساتھ ایک شخص ہاتھ میں لالٹین لیے کھڑا ہے۔ ہم گاڑی سے نیچے اُترے تو وہ سب سے باری باری ہاتھ ملانے لگا۔ ہاتھ ملانے کے بعد وہ آگے آگے چل پڑا۔ ہم سڑک سے اُتر کر کچیان پر چل پڑے۔ آگے گئے تو چھ نوجوان قطار میں کھڑے تھے۔ انھوں نے با آوازِ بلند السّلام علیکم کہا اور پھر باری باری ہم سے ہاتھ ملانے لگے۔

"لو، باقی رات تو ہاتھ ملانے میں گزر جائے گی" دِٹ زیرِ لب بولا۔

"یار، یہ مسلمانی ہم کو بڑی مہنگی پڑ رہی ہے" انجینئر ہنسا۔
"ہاں بھائی، کوئی چائے پانی پوچھو۔ کوئی پھل فروٹ سامنے رکھو۔ یہ کیسی میزبانی ہے کہ ہاتھ ملائے جا رہے ہیں؟" شاعر نے کہا۔
"آج کی رات تو بھئی ہاتھ ملانے پر ہی گزارہ کرو۔ کل دیکھا جائے گا" وٹ بولا۔
"بھئی، مجھے تو صرف ایک عدد چارپائی چاہیے" داستان گو نے کہا۔
"جو چارپائی نظر آئی تو میں تو یار ڈھیر ہو جاؤں گا، وہیں" ڈرائیور نے کہا۔
ہاتھ ملا کر فارغ ہوئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ہم ایک مرغزار میں کھڑے ہیں۔ نیچے مخملی گھاس کا فرش بچھا ہے۔ چاروں طرف اونچے اونچے چنار کے درخت قطار در قطار کھڑے ہیں، اور قریب ہی بہتے نالے نے بھیرویں کا الاپ چھیڑ رکھا ہے۔

الف لیلوی منظر

"ارے! میرے چٹکی بھرنا" وٹ بولا "میں سو رہا ہوں یا جاگتا ہوں؟"
"یہ وہی چلاس ہے کیا، جہاں ہم آ کے رکے تھے؟" شاعر نے پوچھا۔
"نہیں، نہیں۔ یہ وہ چلاس نہیں۔ وہ تو ایک ویرانہ تھا۔ اور یہ تو الف لیلوی منظر ہے" میں نے جواب دیا۔
"ضرور ہم مر چکے ہیں" وٹ زیرِ لب بولا "اور مر کر اپنے نیک اعمال کی وجہ سے بہشت میں داخل ہو گئے ہیں۔"
"تشریف لائیے، تشریف لائیے" ایک نوجوان آگے بڑھا۔
"یار، یہ بہشت تو ٹھیک ہے، لیکن یہ غلمان سیکنڈ ہینڈ معلوم پڑتے ہیں" وٹ نے کہا۔
"تشریف لائیے، تشریف لائیے" ہیڈ ماسٹر صاحب لالٹین لے کر آ گئے۔
آگے بڑھے تو لان میں سات آرام کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ ایک طرف دیوان تھا

جس پر گاؤ تکیے رکھے ہُوئے تھے۔

"بیٹھو، یار، بیٹھو" دت زیرِ لب بولا "اب سٹیج سٹ ہو گیا ہے۔ اب حوریں آئیں گی"۔

ہیڈ ماسٹر ایک دُبلا پتلا عجز اور اخلاق سے بھرا ہُوا آدمی تھا۔ اس کی گفتار میں عجیب شیرینی تھی۔ حرکات میں ٹھہراؤ تھا۔ انداز میں لگن اور محبّت تھی۔

جب وہ کچھ دیر کے لیے اندر گیا تو میں نے کہا "میں نہیں مانتا کہ یہ شخص ہیڈ ماسٹر ہے"۔

"مجھے بھی شک پڑ رہا ہے" شاعر ہنسا۔

"کیوں؟" لیڈر غصّے سے بولا۔

"نہ اس کے ماتھے پر تیوری ہے، نہ آواز میں تحکّم ہے، نہ انداز میں درشتی ہے۔ پھر ہیڈ ماسٹر کیسے ہو سکتا ہے؟" میں نے جواب دیا۔

"بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو" شاعر بولا۔

"بھئی، میں نے خود بارہ سال ماسٹری کی ہے" میں نے وضاحت کی "آج ماسٹری چھوڑے تیس سال ہو گئے ہیں لیکن ماتھے کی تیوری ابھی تک نہیں گئی۔ لہٰذا یہ شخص کوئی بہروپیا ہے، ہیڈ ماسٹر نہیں"۔

"بکواس مت کرو" لیڈر غصّے سے چلّایا۔

"دیکھ، میری جان۔ میں تیرے دوست کی بدتعریفی نہیں کر رہا۔ صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ وہ حاتم ہو سکتا ہے، صوفی ہو سکتا ہے، سوشل ورکر ہو سکتا ہے، سچّا مسلمان ہو سکتا ہے، لیکن ہیڈ ماسٹر نہیں ہو سکتا"۔

ابھی ہم باتیں ہی کر رہے تھے کہ ہیڈ ماسٹر باہر نکلا۔ اس کے پیچھے پانچ چھ نوجوان تھے۔ انھوں نے ہاتھوں میں بڑے بڑے قاب اُٹھائے ہُوئے تھے اور میز کی طرف بڑھ رہے تھے۔

شاعر نے مجھے کہنی ماری۔ کہنے لگا "میں تو سمجھا تھا کہ یہ مُنھ زبانی اخلاق کا پُتلا ہے،

لیکن یہ تو عامل نکلا۔"

"یار، یہ تو بالکل الف لیلوی منظر ہے!" میں نے کہا۔

"شاہی باغیچہ ہے۔ رات کے تین بجے ہیں۔ دستر خوان چُنا جا رہا ہے۔ غلمان خدمت کے لیے دست بستہ حاضر ہیں۔ مجھے تو شک پڑنے لگا ہے کہ ابھی یہ پُراسرار میزبان حکم دے گا کہ خدام، مہمانوں کو پیٹ بھر کر کھانا کھلاؤ۔ ہر قسم کی نعمت ان کے لیے مہیا کرو۔ اور جب یہ سیر ہو جائیں تو ان کے سر قلم کر کے اسی قاب میں رکھ کر ہماری خدمت میں پیش کرو۔"

میز پر کھانے چُن دیے گئے تو میں نے کانی آنکھ سے دیکھا۔ ان میں چائے تھی۔ بسکٹ تھے۔ کیک تھے۔ کباب تھے۔ انڈے تھے۔ گوشت تھا۔ میٹھا تھا۔ پھل تھے۔ ایسا میز میں نے کبھی نہ دیکھا تھا جس پر بیک وقت چائے، بریک فاسٹ اور ڈنر لگا ہو۔

"یہ ہمارے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟" شاعر نے میز کا جائزہ لے کر کہا۔

"ایسا تو کبھی نہ ہوا تھا، ہمارے ساتھ" داستان گو بولا۔

"بھئی، ہمارے ساتھ تو اس کے برعکس ہمیشہ ویسا سلوک ہوتا رہا ہے جیسا بادشاہ بادشاہوں سے کرتے ہیں" دٹ نے کہا۔

"دیکھا؟" لیڈر فخر سے بولا "میزبانی اسے کہتے ہیں۔"

"بالکل نہیں کہتے" شاعر بولا "میزبان تو وہ ہوتا ہے جو چق میں سے مہمان کو دیکھ کر پچھلے دروازے سے باہر نکل جائے اور پھر ملازم آ کر کہے کہ جناب، صاحب گھر پر نہیں ہیں۔"

"ہم خود یہی کرتے ہیں" میں نے کہا۔

"سارے شریف آدمی یہی کرتے ہیں" انجینئر بولا۔

"اگر میرے گھر کوئی مہمان رات کے تین بجے آ جائے تو ایمان سے میں تو اُسے قتل کر کے باغیچے میں دفن کر دوں" میں نے کہا۔

"بالکل۔ اور جو تو اُسے قتل نہ کرے اور انٹرٹین کرنا شروع کر دے تو تیری بیوی

تجھے قتل کر کے باغیچے میں دفن کر دے" شاعر کی بات پر سب ہنس دیے۔

"ہنسنے کی کیا بات ہے ؟" میں نے انھیں ڈانٹ پلائی "بالکل ٹھیک کہتا ہے یہ۔ سب نیک بیبیاں ایسا ہی کرتی ہیں "

"معلوم ہوتا ہے، ہیڈ ماسٹر کے گھر کوئی نیک بی بی نہیں" وٹ بولا۔

امپاسبل پلیس

اگلی صبح جب میں جاگا، آنکھیں کھولیں، اور اس مرغزار کو دیکھا تو از سرِ نو میرے شکوک جاگ اُٹھے کہ ضرور ہمارے سامنے الف لیلہ کا سوتے جاگتے کا قصّہ دہرایا جا رہا ہے۔

"یار، کیا خوبصورت جگہ ہے !" ڈرائیور بولا۔

"ویسے ہونی نہیں چاہیے" میں نے کہا۔

"وہ کیوں ؟" لیڈر بولا۔

"اب تک اس سفر کا جو رنگ رہا ہے، یہ ایپی سوڈ اس سے ہم آہنگ نہیں" میں نے جواب دیا۔

"ہمارا سارا ٹرپ پیٹرن تباہ کر دیا" داستان گو بولا۔

ابھی ہم اس منظر کو اپنے ٹرپ پیٹرن میں فٹ کر رہے تھے کہ چھ نوجوان ہاتھوں میں قابیں اُٹھائے پھر سے آموجود ہوئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے مدرسے کا وہ لمبا میز پھر سے کھانوں سے لد گیا۔

وٹ زیرِ لب آہ بھر کر بولا "ہائے ! وہ دعوتِ کدّو !"

ابھی ہم ناشتا کرنے میں مصروف تھے کہ ہیڈ ماسٹر صاحب دو افسروں کو ساتھ لے کر آموجود ہوئے۔ ایک انسپکٹر سکولز تھے، دوسرے تحصیل دار تھے۔ لیکن ان کے انداز سے صاف پتا چلتا تھا کہ یا تو انھیں علم ہی نہیں کہ وہ عہدے دار ہیں اور یا پھر

چلاس کے عہدے بناسپتی قسم کے ہیں۔

"یار، یہ جگہ تو بالکل امپاسیبل قسم کی جگہ ہے" میں نے کہا "اوّل تو اس کا نام ہی بے تکا ہے۔ چلاس۔ کتنا بے ہودہ نام ہے۔ نہ معانی نہ ساؤنڈ ایفکٹ۔ پھر یہاں کی مہمان نوازی کس قدر احمقانہ ہے۔ اور یہاں کے افسر غیر افسرانہ ہیں اور یہاں کے نوجوان لڑکے جو بار بار قاب اُٹھا کر لاتے ہیں اور رات کے تین بجے مہمانوں کے لیے پلنگ بچھاتے ہیں، اور بات بات پر مسکراتے ہیں، انھیں پتا ہی نہیں کہ نسلِ نو کا برتاؤ کن سانچوں میں ڈھلنا چاہیے۔"

"ایک اور بات بھی تو ہے" شاعر نے کہا "عام طور پر دستور ہے کہ اوپر سے چیز دیدہ زیب اور بھڑکیلی ہوتی ہے اور بھیتر سے پھیٹیچر۔ یہ شہر جس کا نام چلاس ہے، اُوپر سے پھیٹیچر تھا لیکن بھیتر سے مرغزار ہے۔"

"بالکل" ورٹ چلاّیا "رات جب ہم نے اِسے اُوپر سے دیکھا تھا تو ایسے لگا تھا جیسے دوسرا الانچی نالا ہو۔"

ڈپٹی کمشنر

تحصیلدار ہم سے بہت تپاک سے ملا۔ بولا "ڈپٹی کمشنر صاحب کی خواہش ہے کہ چلاس سے روانہ ہونے سے پہلے آپ سے ملاقات ہو جائے۔"

"ارے!" شاعر نے زیرِ لب کہا "یہاں کا ڈپٹی کمشنر بھی بناسپتی معلوم ہوتا ہے۔"

"بالکل ہے" ورٹ نے کہا "ورنہ ڈپٹی کمشنر کب کسی سے ملتے ہیں۔ دو دو دن باہر دروازے پر بیٹھے انتظار کرو، پھر کہیں ملاقات کا شرف بخشا جاتا ہے۔"

ڈپٹی کمشنر کا بنگلہ کچہری سے ملحق تھا۔ جب ہم وہاں پہنچے تو پتا چلا کہ لیڈر اور داستان گو کہیں کام سے گئے ہیں۔ اس لیے فیصلہ ہوا کہ ان کا انتظار کیا جائے تاکہ سب

مل کر اکٹھے ڈپٹی کمشنر سے ملاقات کریں۔

میں کچہری کے لان میں ٹہلنے لگا۔ کچھ دیر کے بعد کچہری سے ایک اہل کار باہر نکلا۔ اس نے جھک کر مجھے سلام کیا۔

"ارے!" میں تو حیران رہ گیا۔ کچہری کا اہل کار اور مجھے سلام کرے، اور جھک کر! نہیں، نہیں ضرور اسے کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔

چند ساعت کے بعد ایک کلرک باہر نکلا اور اس نے بھی جھک کر مجھے سلام کیا۔ یا اللہ خیر! یہ کیا ہو رہا ہے؟ کچہری کا افسر تو خیر پھر بھی سلام کرنے کی غلطی کا مرتکب ہو سکتا ہے، مگر کچہری کا کلرک جھک کر سلام کرے! نہیں، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟

اوّل تو میں کچہری کے نام سے ہی خائف ہوں۔ لہٰذا میں نے کبھی ادھر کا رُخ نہیں کیا۔ لیکن زندگی میں چند ایک بار مجبوراً کچہری جانا پڑا ہے۔ وہاں جا کر مجھ پہ یہ انکشاف ہوا کہ فرعون مصری تاریخ سے نکل کر، آنکھ بچا کر، ہماری کچہریوں میں آ جمع ہوئے ہیں۔ پہلی مرتبہ جب میں کچہری میں گیا تو ایک گھنٹے کے بعد میں نے محسوس کرنا شروع کیا کہ میں ایک ان پڑھ نیچ آدمی ہوں جو براہمنوں کے دیس میں آ نکلا ہوں۔ اس کے بعد میں نے خود کو مجرم محسوس کرنا شروع کر دیا، ایسا مجرم جو تختہ دار سے بچا پھرتا ہو۔ جتنی تذلیل میری کچہریوں میں ہوئی ہے کسی اور جگہ نہیں ہوئی۔

دفعتاً مجھے وہ دلخراش باتیں یاد آ گئیں۔ زخم پھر سے ہرے ہو گئے۔ میں ڈٹ کے کھڑا ہو گیا اور بڑی فرعونیت سے کچہری کے عملے کے سلام قبول کرنے لگا۔ اس شغل میں اتنی لذت تھی کہ میرا دل چاہتا تھا کہ زندگی بھر وہاں کھڑا کچہری والوں کے سلام قبول کرتا رہوں۔

ڈپٹی کمشنر کو دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ ایک سادہ اور متحمل مزاج آدمی ہمارے سامنے بیٹھا تھا۔ اس کے انداز میں ذرا بھر ٹک نہ تھی۔ یا اللہ! یہ شخص علاقے کا نظم و نسق

کیسے چلاتا ہوگا! نہ بوٹ نہ سُوٹ۔ نہ بو، نہ ٹائی۔ نہ فوں فاں، نہ ٹیں ٹاں۔

ڈپٹی کمشنر مقامی آدمی تھا اور سالہاسال سے چلاس میں اس عہدے پر فائز تھا۔ وہ میری حیرت کو تاڑ گیا۔ بولا "میں مقامی آدمی ہوں، اس لیے میں نے اعلان کر رکھا ہے کہ مجھ سے ملاقات پر کوئی پابندی نہیں۔ جب بھی چاہو، مجھ سے آکر مل سکتے ہو۔" پھر وہ ہنسا۔ کہنے لگا "لوگ مجھ سے آکر پُوچھتے ہیں، کیا آپ کو وہ سب اختیارات حاصل ہیں جو دوسرے ڈپٹی کمشنروں کو حاصل ہیں۔"

بہرطور چلاس بالکل ہی اَن ہونی جگہ تھی۔ بالکل اُدونٹ کی طرح اس کی کوئی کل سیدھی نہ تھی۔ نہ ہیڈ ماسٹر، نہ انسپکٹر آف سکولز، نہ طلبا، نہ کچہری، نہ ڈپٹی کمشنر۔

جیپ میں گلگت کی طرف جاتے ہُوئے میں انھی سوچوں میں کھویا ہُوا تھا۔

مطبوعہ فیروز سنز (پرائیوٹ) لمیٹڈ لاہور۔ باہتمام عبدالسلام پرنٹر اور پبلشر

چار لافانی کلاسیکی شاہکار

انوارِ سُہیلی

ترجمہ : پروفیسر معین الدّین دردائی

مشہورِ زمانہ "کلیلہ و دمنہ" کی حکمت آموز کہانیاں، جن میں چرند و پرند کے دِل کش قِصّوں کے رُوپ میں آئینِ جہانداری اور سیاسی و اخلاقی مسائل بیان کیے گئے ہیں۔ فاضل مترجم نے اُردُو ترجمے میں سلاست کو مدِّنظر رکھا ہے اور اِس امر کی کوشش کی ہے کہ اصل فارسی کتاب کا داستانی انداز برقرار رہے۔

حکایاتِ رُومیؒ

ترجمہ : مقبُول جہانگیر

حضرت مولانا جلال الدّین رُومیؒ کی مثنوی کی حکایتوں کا اِنتخاب تمثیل کے پُرکشش اسلُوب میں اخلاق و حکمت اور تصوّف و روحانیت کے مسائل۔ مترجم نے لفظی ترجمے کے بجائے مولائے رُومؒ کے مطالب اپنے اسلُوب میں بیان کیے ہیں۔

حکایاتِ گلستانِ سعدیؒ

ترجمہ : نظر زیدی

حضرت سعدی شیرازیؒ کی شُہرۂ آفاق فارسی تصنیف "گلستان" کی حکایتوں کا عام فہم اور دِل نشین ترجمہ۔ شعروں کا ترجمہ شعروں میں کیا گیا ہے۔

حکایاتِ بوستانِ سعدیؒ

ترجمہ : نظر زیدی

بُلبُلِ شیراز حضرتِ سعدیؒ کی منظُوم فارسی تصنیف "بوستان" کی حکایات کا سلیس و شگفتہ ترجمہ، اُردُو نثر میں۔

فیروز سنز لمیٹڈ
لاہور۔ راولپنڈی۔ کراچی

ادب و تنقید

جدید اُردُو ادبیات	ڈاکٹر ابُواللیث صدّیقی
شعُور و لاشعُور کا شاعر — غالب	ڈاکٹر سلیم اختر
جوش کا نفسیاتی مُطالعہ اور دُوسرے مضامین	ڈاکٹر سلیم اختر
رام دین (مضامین اور رپورتاژ)	مُمتاز مُفتی
دستک نہ دو (ناول)	الطاف فاطمہ
چلتا مُسافِر (ناول)	الطاف فاطمہ
آخری تمنّا (ناول)	ڈاکٹر نصیر احمد ناصر
گرین کارڈ (ناول)	ڈاکٹر فرخندہ جالی
ایلینا فیئر (ناول۔ ترجمہ)	لُوئی کو پیرس
سمے کا بندھن (افسانے)	مُمتاز مُفتی
پھُول کی کوئی قیمت نہیں (افسانے)	آغا بابر

فیروز سنز لمیٹڈ لاہور۔ راولپنڈی۔ کراچی

969 0 00693 2

Rs. 250.00